مختلف مضامین ۹

علّامہ نصیرالدّین نصیر ہونزائی

کے ٹرانسکرائب لیکچرز

تمہید

استادِ بزرگوار علامہ صاحب قبلہ نے اپنی صد سالہ عمرِ گرانمایہ میں اپنی زبانِ فیض بار اور قلمِ جواہر نگار سے کتابوں کے علاوہ آڈیو لیکچرز کی صورت میں ایک بیش بہا خزانہ عالمِ انسانیت کے لئے عطا کیا ہے۔ اِن لیکچرز کی اہمیت کے حوالے سے آنجناب خود فرماتے ہیں:

''ہمارے کیسٹوں میں جو تقاریر ہیں وہ بنیادی اور اساسی مواد کا کام دیں گے، یعنی اُن سے اسماعیلی مذہب پر ریسرچ میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ میرے نزدیک ہر کیسٹ کا مواد ایک کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بڑی اہم باتیں ریکارڈ ہوئی ہیں۔ کیسٹوں کے قیمتی مواد کو محفوظ کر لینا ضروری ہے، کیونکہ یہ ہماری پیاری جمعیت کی دولت ہے، یہ ہمارے علمی سرمایے کا ایک اہم حصّہ ہے، اور ہم کو یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے ان علمی کاموں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے والا ہے، ہماری تحریروں کے ایک ایک پُرزے پر ریسرچ ہوگی، کیونکہ ہماری نگارشات میں امامِ عالیمقامؑ کی نورانیت و روحانیت براہِ راست کارفرما ہے''۔ (غیر مطبوعہ)

استادِ گرامی قبلہ کی اِس روشن ہدایت کے پیشِ نظر اِن گرانمایہ دُرّ و مرجان کو ضبطِ تحریر میں لانے کا انتہائی اہم اور دقیق کام استاد بحر العلوم صاحب کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے۔ اور آپ نے اِس سلسلے میں خانۂ حکمت کے تمام سینٹرز میں جا کر اس کام کی اہمیت کے حوالے سے آگاہی اور رہنمائی فرمائی ہے اور ناچیز کو اِن لیکچرز کو تحریر میں لانے اور منظم کرنے کی ذمہ داری دی ہے اس سلسلے میں کئی احباب انتہائی جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ ان خزائن کو جماعت اور دنیائے انسانیت تک پہنچانے کے لئے محترم مصطفیٰ مومن صاحب نے اسے (ebook) کی صورت میں پیش کرنے میں ہماری مدد فرمائی ہے۔

ناچیز نسرین اکبر

مختلف مضامین - ۲

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	لیکچر نمبر	صفحہ نمبر
۱	خدا کی وحدت، خدا ایک انسٹیٹیوٹ ہے	۱۱	۱
۲	مومن کی طاقتیں	۱۲	۱۴
۳	سورۂ رحمان کی چند تاویلات، رُوحانی علم کی اہمیت	۱۳	۳۰
۴	کُن کی حقیقت، عبادت کی ضرورت اور نفس کے عناصر	۱۴	۴۲
۵	چند اہم اصطلاحات اور اُن کی وضاحت	۱۵	۵۹
۶	واقعۂ قیامت اور صورِ اسرافیل، دینِ مجسّم	۱۶	۷۰
۷	عقلِ کُلّی، نفسِ کُلّی، جسمِ کُلّی اور مونوریلزم	۱۷	۸۱
۸	کتابِ سماوی، پیغمبروں کے درجات، وحدتِ کثرت نُما	۱۸ الیف	۹۷
۹	دینِ اسلام کا ادیان پر غالب آجانا، حضرت آدمؑ کی شریعت	۱۸ ب	۱۰۷
۱۰	فرمان فہمی کی اہمیت	۱۹	۱۱۸
۱۱	انفرادی قیامت کے معجزات و عجائبات	۲۰	۱۲۹

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: خدا کی وحدت، خدا ایک انسٹیٹیوٹ ہے

کیسٹ نمبر: ۱۱ تاریخ: ۱ پریل، ۱۹۷۸، کراچی

Click here for Audio

کسی Nation [میں] اتنی Unity نہیں ہوسکتی ہے تو پھر کسی مذہب میں اِس قدر اور اتنی یک دلی اور یکجہتی [کس طرح] ہوسکتی ہے، ہمارے اندر وحدت اور Unity کا ایک زندہ نمونہ ہے، یہ سب کچھ امامؑ کی رحمت اور اُس کی مہربانی ہے کہ جب ہم عبادت اور ذکر و بندگی کے مقام پر جمع ہو جاتے ہیں، تو ہم اپنے جغرافیائی مقامات کو اور اُن حدود کو جو جسمانی طور پر پائے جاتے ہیں، بھول جاتے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ اُس وقت بھی ہم یہ خیال کریں کہ یہ بمبئی سے ہے اور یہ کراچی سے ہے، یہ چترال سے ہے، یہ بدخشان سے ہے اور یہ گلگت، ہونزا سے ہے۔ کتنی رحمت ہے اُس ذاتِ پاک کی، اُس مولائے کریم کی کہ ہمارے یہاں یہ فرق نہیں ہے کہ ہماری زبان ایک کیوں نہیں ہے یا ہمارا علاقہ ایک کیوں نہیں ہے، ہمارے یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تو دین کو چاہتے ہیں، مولا کی خدمت کو چاہتے ہیں اور امامِ عالی مقام کے مقدّس فرمان کے مطابق ہم خود کو ایک ہی تصور کرتے ہیں۔

ہم جسم کو بھی بھول جاتے ہیں، ہم رُوح کو لیتے ہیں اور رُوح کا تصوّر کرتے ہیں، رُوح ہی کا خیال کرتے ہیں اور ازل میں کس طرح ہم ایک تھے، اُسی تصوّر میں جاتے ہیں۔ یہ ہماری رُوحانی ترقی کی دلیل ہے، یہ ہماری بلند نگاہی کی دلیل ہے۔ جیسا کہ امامِ عالی مقامؑ نے اگلے جامہ میں فرمایا تھا کہ: ''مومن کی نگاہ اُوپر جانے کے لئے ہونی چاہیئے''۔ (راجکوٹ، ۲۱۔۱۰۔۱۹۰۳) یہ ہماری نگاہ اُوپر جانے کے لئے ہے کہ ہم اپنی ازلی وحدت کو سامنے رکھتے ہیں کہ ہم ازل میں کس طرح ایک تھے۔ صرف ازل میں نہیں، اب بھی ہم اپنی رُوح کا تصوّر کرتے ہیں تو اپنی رُوح کو دھوپ کی طرح، سورج کی روشنی کی طرح پاتے ہیں کہ سورج کی روشنی کا خیال کیا جائے اور زمین کی سطح سے آپ نظریاتی طور پر اُوپر سے اُوپر جائیں، تو سورج کی اِس روشنی اور گرمی کو جب اُوپر سے اُوپر دیکھیں گے تو اُس میں روشنی بھی زیادہ ہوگی اور گرمی بھی زیادہ ہوگی اور صفائی بھی زیادہ ہوگی۔ جب آپ بلند سے بلند جائیں گے اور سورج کے قریب جائیں گے تو اُس وقت اِس دھوپ کے اندر، اُس

روشنی کے اندر اتنی حرارت ہوگی اور اِس قدر پاور ہوگا کہ کوئی چیز وہاں ٹھہر نہیں سکے گی کہ اُس کا وجود مٹ جائے گا۔ سورج کی طاقت سے اور سورج کی شعاعوں کی زد سے کوئی چیز بچ نہیں سکے گی ۔ یہی مثال رُوحوں کی بھی ہے کہ ہم سب کی رُوحیں ہماری شخصیتوں کو اِس طرح چھوتی ہیں جس طرح سورج کی شعاعیں زمین کی چیزوں کو چھوتی ہیں۔ تو کہنا یہ ہے کہ جب ہم اپنے خیال میں، تصوّر میں بلند سے بلند جاتے ہیں تو اُس وقت ہم خود کو ایک دُوسرے کے قریب پاتے ہیں، یہاں تک کہ تصوّر کریں [کہ] امامِ اقدسؑ کے نور میں ہماری رُوحوں کے سرے جمع ہیں۔ تو ازل کی کیا بات ہے؟ اب بھی ہم خود کو دیکھتے ہیں [تو] خود کو ہم ایک پاتے ہیں۔ جب خداوند نے ہم کو اِس بلندی پر اپنی رُوح کی حقیقت کو دیکھنے، پانے اور مشاہدہ کرنے کی صلاحیت عطا کر دی ہے، تو ہم جسم کو ہر وقت کیوں دیکھیں اور اِس حقیر جسم کو کیوں نظر میں لائیں ۔ یہی Unity ہے، یہی وحدت ہے، یہی یگانگت اور اپنائیت ہے جس کی وجہ سے مشرق اور مغرب کے اسماعیلی خود کو ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں سمجھتے ہیں۔

آج آپ نے سُنا اِن آوازوں کو، وہ پیاری آوازیں کیا کہتی ہیں، کتنی یگانگت ہے اُن آوازوں میں، کس قدر Unity ہے۔ وہ آپ کو اور ہم کو کیا تصوّر کرتے ہیں، اپنی جانوں سے زیادہ عزیز، اپنی جانوں سے زیادہ شیرین۔ دین بھی کتنی عظیم نعمت ہے، اِس لئے خداوند تعالیٰ نے اسلام کی تکمیل کے موقع پر جب کہ مولانا علیؑ کی جانشینی مقرر ہوئی تھی، جب کہ رسولِ اکرمؐ کی جگہ پر امامِ اقدسؑ قائم ہوئے تھے اُس موقع پر خداوند جلّ شانہٗ نے کیا ارشاد فرمایا: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي (۵:۳)۔ دیکھئے ! اِس آیتِ اقدس کے اندر دین کو نعمت قرار دیا گیا ہے، سب سے بڑی نعمت دین ہے۔ آپ جانتے ہیں نعمت کس چیز کا نام ہے؟ نعمت وہ جس میں راحت ہو۔ جسمانی نعمت، رُوحانی نعمت، عقلی نعمت، تو یہاں جو دین نعمت ہے وہ جسم کے لئے نہیں ہے، سب سے پہلے عقل کے لئے ہے اور پھر رُوح کے لئے ہے اور عقل و رُوح کے تحت بے شک جسم کو بھی سکون ہے۔ تو دین بہت بڑی نعمت ہے، بہت شیرین نعمت ہے، بہت عزیز نعمت ہے، بہت میٹھی نعمت ہے۔ آپ کے جن عزیزوں نے مغرب کے اندر اِس دین کی نعمت کو جیسا کہ چاہئے چکھا اور چکھ کر اُس کا مزہ بتایا، انہوں نے اُس کے اندر جو خوشبو محسوس کی اُس کا ذکر کیا۔ یہ دینی رشتہ ہے، یہ ملّی وحدت ہے، یہ رشتہ امامؑ ہی کی وجہ سے ہے اور یہ نورانی رشتہ ہے، یہ نور کا رشتہ ہے، آپ رُوح کو نور بھی کہہ سکتے ہیں۔ تو خیال کیجئے کہ نورانیت کا جو رشتہ ہے وہ کس قدر استوار ہے، وہ رشتہ کتنا پیارا ہے، کتنا عزیز ہے اور کیسا قابلِ ذکر ہے اور قابلِ تعریف ہے۔

انہوں نے بار بار جن معجزات کی طرف اشارہ کیا وہ علم ہے، رُوحانی علم اور رُوحانیت کے تجربات، واقعات،

عجائبات کچھ بھی کہیں۔ مثلاً اگر کچھ عزیزوں نے بہت کم عرصے کے اندر دل کی روشنی محسوس کی ہے تو وہ اپنی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے معجزہ دیکھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ مغرب کے اندر مادّیت کی قوتیں کس شدت سے کام کر رہی ہیں، کس سختی سے اُن کا مادّیت سے مقابلہ ہے۔ البتہ اُن کے سامنے کچھ مشکلات تھیں، وہ مادّی طور پر مجبور تھے، وہ مغرب میں رہتے ہوئے کچھ جانتے ہیں اور ظاہری علم کے لحاظ سے بھی اُن کا کوئی Standard ہے۔ وہ سب عزیز، جیسا کہ آپ نے محسوس کیا Highly Qualified Persons ہیں، بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کو اِس نئی روشنی کے زمانے میں مطمئن کر دینا اور اُن کو تسلی دے کر اُن کے مختلف سوالات کے لئے جوابات مہیا کر دینا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ البتہ انہوں نے کچھ چیزیں محسوس کی ہوں گی، البتہ انہوں نے کچھ قوتیں دیکھی ہوں گی وہ قوتیں [جو] اِن مادّی قوتوں سے بڑھ کر تھیں، یا یہ کہ وہ رُوحانی قوتیں، وہ علمی قوتیں، وہ رُوحانی تجربات اِن مادّی چیزوں کے اُوپر غالب آرہے تھے۔ تب ہی تو وہ مطمئن تھے، جب ہی تو وہ اِس طرح سے روتے تھے، کچھ کی آوازیں تو بہت ہی عجیب طرح سے گلوگیر ہو چکی تھیں، کچھ تو بے دھڑک روتے تھے، آنسو بہاتے تھے، کچھ کو تو دیکھا کہ اُن پر کپکپی کی کیفیت گزر رہی تھی۔ یہ سب صداقت ہے، یہ سب دلیل ہے اِس بات کی کہ امامؑ کے کام میں، امامؑ کی خدمت میں معجزہ ہے۔ معجزہ کسی Person میں نہیں ہے، دین میں ہے، Person کو میں Believe نہیں کرتا ہوں۔ میں دین کو، امامؑ کے امر و فرمان کو اور علم کو مانتا ہوں۔

لوہے کا ایک ٹکڑا جب آگ میں جاتا ہے، تو اُس کی کیفیت کچھ اور ہو جاتی ہے اور جب آگ سے الگ رہتا ہے تو اُس کی کچھ اور کیفیت ہوتی ہے، تو دین کی خدمت کرنے والے اور علم کے کام کرنے والے اِس [مثال] کی طرح ہیں، جب وہ امامؑ کے کسی مشن کو ہاتھ میں لیتے ہیں تو اُن کی حالت اُس لوہے کی طرح ہوتی ہے جو آگ کی بھٹی میں پڑتا ہے اور آگ ہو جاتا ہے اور [اسی طرح] جب وہ اپنی مادّی حالتوں میں واپس آجاتے ہیں تو وہ انسان نظر آتے ہیں، اِس سے ثابت ہوا کہ معجزہ امامؑ کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی شخص معجزے کا دعویٰ نہیں کر سکتا ہے اور دعویٰ نہیں کرنا چاہئے کہ میں معجزہ کرتا ہوں، یہ بات نہیں ہے۔ پیر ناصرِ خسروؒ نے اپنی مشہور کتاب ''وجہ دین'' کے اندر دین کی دعوت کرنے والے اور دعوت سننے والے دونوں کی مثال دی ہے، اُس مثال کو میں دُوسرے الفاظ میں پیش کروں گا اور وہاں پر جو بھی الفاظ ہیں وہ آپ کسی وقت پڑھ کر دیکھنا لیکن میں وہ الفاظ یہاں استعمال نہیں کروں گا وہ ذرا مشکل الفاظ ہیں، تاویلی الفاظ ہیں۔ وہ یہ کہ پیر نے فرمایا ہے کہ جب دعوتِ حق کرنے والا اور دعوتِ حق سننے والا دعوت کر چکے ہوتے ہیں اور سُن چکے ہوتے ہیں تو

اُس وقت اُن پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ Believe کریں، وہ مانیں کہ یہ علم جو کہنے والے نے کہا اور سننے والے نے جو سنا، یہ اُوپر سے ہے یعنی علم کو اپنی ذات سے منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔

کسی نہر سے اگر پانی آتا ہے تو کوئی دانشمند یہ نہیں سوچتا کہ پانی نہر کی پیداوار ہے، یہ نہر کی پیداوار نہیں ہے۔ آپ آگے چل کر دیکھئے یہ پانی ندّی سے آتا ہے اور ندّی سے بھی آپ کو اگر آگے بڑھنا ہے تو یہ پانی پہاڑ مہیا کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہاں پر برف کے تودے ہیں اور چشمے ہیں اور آپ اِس سے بھی اگر آگے بڑھنا چاہیں تو آگے بڑھیں، پہاڑ کی چوٹی پر چڑھیں یا وہیں سے سوچیں تو آپ کو یقین ہوگا کہ وہ پانی پہاڑ سے بھی نہیں ہے بادلوں سے ہے، اور بادلوں میں سوچیں یعنی آسمان کے بارے میں سوچیں، آیا وہاں پر کوئی مستقل پانی ہے؟ نہیں ہے، تو پھر یہ پانی کہاں سے آیا؟ سمندر سے آیا بس آپ کا سفر وہیں پر ختم ہو جائے گا کہ پانی جو مہیا کرتا ہے وہ سمندر ہے۔ اسی طرح امامؑ کی ذات ہے جو علم و حکمت کا سرچشمہ ہے، جو علم و حکمت کا سمندر ہے اور درمیان میں جو معلمین ہیں، اُستاد ہیں، کچھ بھی ہیں وہ تو ایک نہر کی طرح ہیں۔ نہر کبھی خشک بھی رہ سکتی ہے، نہر کا بنانا آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ بگاڑیں تو بگاڑ بھی سکتے ہیں، آپ بنائیں تو بنا بھی سکتے ہیں۔

تو مطلب ایک شخص میں اِس قدر رُوحانی پاور پیدا کرنا، دوستوں، عزیزوں، شاگردوں اور مُریدوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ دُرست ہے کہ تھوڑی بہت قابلیت اُستاد میں بھی ہونی چاہیئے، صداقت ہونی چاہیئے، راست بازی ہونی چاہیئے، بہت سی صفات، بہت سی قابلیتیں اُس میں بھی ہونی چاہیئے لیکن بہت پاور مخلصوں، مُریدوں، عزیزوں اور شاگردوں میں سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر سب شاگرد اور سب عزیز مخالفت کریں تو میں نہیں سمجھتا ہوں کہ اُستاد کوئی رُوحانی معجزہ بتا سکے گا۔ معجزے کا کرنا علمی معجزہ، رُوحانی معجزہ اور اس کو دیکھنا، حاصل کرنا یہ تو عزیزوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پیغمبروں کے زمانے میں لوگ دو فرقوں میں کیوں بٹ گئے؟ کچھ نے دیکھا اور کچھ نے نہیں دیکھا۔ کیا پیغمبروں کی ذات سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک برتتے تھے؟ کہ کچھ کے ساتھ کچھ اور سلوک کرتے ہیں اور کچھ کے ساتھ کچھ دُوسرا سلوک کرتے ہیں، یہ بات نہیں ہے، اور جو بھی سلوک کرتے ہیں وہ یکسان سلوک ہوتا ہے، وہ ایک جیسا سلوک ہوتا ہے لیکن جو سننے والے، دیکھنے والے ہوتے ہیں اُن کی فطرت، اُن کا باطن، اُن کا نظریہ، اُن کا عقیدہ الگ الگ ہوتا ہے۔

لہٰذا میں کینیڈا گیا تھا، جیسا کہ آپ یقین کر سکتے ہیں کہ بحیثیتِ مجموعی کام بہت اچھا ہوا اور بہت سے عزیزوں پر عجیب و غریب واقعات گزرے، یہ بھی صحیح ہے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہر فرد اُس میں یکسان تھا، نہیں تھا اور نہیں ہو سکتا ہے۔ اِس کا مقصد کیا ہے؟ اِس کا مقصد یہ ہے کہ مولا خداوند نے مومنین کے اندر طرح طرح کی قابلیتیں رکھی ہیں، مومن بہت

کچھ کرسکتا ہے۔کیاامامؑ نے کبھی کسی ارشاد میں یہ نہیں فرمایا ہے کہ:'' تم معجزہ کرسکتے ہو''۔(دارالسّلام،۲۹۔۹۔۱۸۹۹)کیاامامؑ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ: تم پیروں کے نقشِ قدم پر اُن کے پیچھے پیچھے آگے بڑھ سکتے ہو۔کیاامامؑ نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ: ''تم پیروں سے بھی آگے بڑھ سکتے ہو''۔

کیاایسے ارشادات [کے بعد] کوئی کہہ سکتا ہے کہ اِس زمانے میں رُوحانی ترقی پر پابندی ہے۔آپ کو اگر کوئی ٹائٹل نہیں ملتا ہے تو کوئی بات نہیں ہے، یہ وقت کی مصلحت ہے، اِس میں کوئی فکر نہیں ہے۔آپ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ میں پیر ہوں، آپ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ میں حجّت ہوں، داعی ہوں، آپ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ میں امام ہوں، میں خدا ہوں، میں پیغمبر ہوں۔بے شک ظاہری طور پر آپ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں، دعویٰ نہیں کرسکتے ہیں، اپنا کوئی نام مقرر نہیں کرسکتے ہیں لیکن کیا باطنی طور پر بھی کوئی پابندی ہے؟ اگر باطنی طور پر بھی پابندی ہے تو امامؑ ہر فرمان میں رُوحانی ترقی پر کیوں زور دیتے ہیں۔اگر اُس [امامؑ] نے، خود اتنی رُکاوٹیں رکھی ہیں اور رُوحانی ترقی ناممکن بنائی ہے تو پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ امامؑ بار بار رُوحانی ترقی کے لئے ہدایات اور فرامین فرماتے ہیں۔کوئی باشعور مومن یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ رُوحانی ترقی نہیں ہوتی ہے، [کیونکہ] رُوحانی ترقی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

ہم سے بہت سے سوالات ہوئے، یہاں پر بھی اور مغرب میں بھی کہ آپ بتائیں کہ دین کے اندر یہ حد بندی کیوں ہے کہ ہمیشہ مرد ہی پیغمبر اور امام ہوا کرتا ہے اور خواتین میں سے نہ تو کبھی کوئی پیغمبر ہوئی اور نہ کوئی امام؟ میں اِن کے اِس سوال کا جواب ظاہری طور پر جس طرح سے دینا چاہئے دیتا ہوں اور جس طرح لکھنا چاہئے لکھتا ہوں، لیکن میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ''باطنی طور پر مرد ہی کی ترقی ہے اور خدا سے عورت واصل نہیں ہوسکتی ہے''۔جسم میں فرق و امتیاز ہے، رُوح میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اور فطرت کا فیصلہ یہ ہے کہ عورت کمزور واقع ہوئی ہے اور مرد اُس کی نسبت قوی ہے، طاقتور ہے، اِس ظاہری واقعیت کے اعتبار سے اگر مردوں پر عورت کو پیغمبر اور امام بنایا جائے، تو ظاہری لحاظ سے یہ ایک خلافِ فطرت فیصلہ ہوگا کہ قوی پر اور طاقتور پر کمزور کو پیغمبر مقرّر کیا گیا اور طاقتور مُریدوں پر ایک کمزور فرد جو عورت ہے اُس کو امام مقرر کیا گیا۔اِس کا تصادم صرف ظاہر میں ہوگا لیکن اگر باطنی طور پر ایک عورت کی ترقی ہو تو وہ رُوح [کی ترقی] ہوگی اور رُوح نہ تو مرد ہے اور نہ عورت۔ملائکہ [کے لئے] آپ نے سُنا ہے کہ کچھ فرشتے مرد ہوتے ہیں اور کچھ فرشتے عورت، فرشتوں میں اور رُوحوں میں یہ فرق و امتیاز نہیں ہے، لہٰذا اُس میں تو [فرق و امتیاز] اعمال و علم پر ہے۔اس لئے پنجتن پاک میں سے جو فاطمہؑ تھی، اُن کی بہت ترقی تھی۔وہ خدا کے نور کی حامل اِس طرح سے تھیں جس

طرح کہ پیغمبرؐ، علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ [میں] کوئی فرق نہیں تھا لیکن ظاہر میں فرق تھا، عمر کا فرق تھا۔ وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُون (۵۶:۱۰)، پیغمبر اُن میں سے مقدّم تھے لہٰذا وہ ناطق تھے، اُن کی موجودگی میں اساس کو نہیں بولنا چاہئے، لہٰذا وہ صامت یعنی خاموش رہنے والا کہلاتا تھا اور باپ کی موجودگی میں حسنؑ اور حسینؑ [دونوں کو] امام ہوتے ہوئے بھی نہیں بولنا تھا، نہیں بولتے تھے اور شوہر کی موجودگی میں فاطمہؑ کو نہیں بولنا چاہئے تھا، نہیں بولتی تھیں اور دین کے معاملے میں مرد کی موجودگی میں جس طرح عورت کو نہیں بولنا چاہئے، تو بیٹوں کے مقابلے میں بھی فاطمہؑ اپنے شہزادوں کے ہوتے ہوئے نہیں بولا کرتی تھیں۔ تو یہ سب ظاہری باتیں ہیں مگر باطن میں خدا ایک انسٹیٹیوٹ ہے، خدا کی خداوندی، نبوّت بھی، امامت بھی انسٹیٹیوٹ ہے، خدا کی خدائی، پیغمبرؐ کی پیغمبری، اِمامؑ کی امامت ایک ادارے کی شکل میں ہے، تو اس ادارے کی شکل میں فاطمہؑ بھی تھی۔ نبوت میں بھی تھی، امامت میں بھی تھی۔

[آپ کا] پوچھنا کہ مَلَا الاَعلیٰ کیا ہوتے ہیں؟ تو مَلَا الاَعلیٰ (۳۷:۸) سرداروں کو کہتے ہیں اور اعلیٰ بلندترین مقام کو، بلندترین درجے کو کہتے ہیں اور اِن دونوں لفظوں کو ملانے سے جو اصطلاح بنتی ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ بہت بلندی کے سردار۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کے دربار میں فرشتوں کے سردار ہیں، اُن کے ساتھ خدا باتیں کرلیا کرتا ہے۔ خدا کی گفتگو ہوتی ہے مَلَا الاَعلیٰ کے ساتھ۔ جب شریعت کا قانون یہ ہے کہ خدا مَلَا الاَعلیٰ کے ساتھ گفتگو کرتا ہے تو اُس مَلَا الاَعلیٰ کی ایک مثال جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل ہے اور دُوسری مثال میں خدا تنہا ایک فرد کی حیثیت سے کام نہیں کرتا، میں شریعت کی باتیں کرتا ہوں تا کہ اُس کی مدد سے میں آپ کو حقیقت کی بات سمجھا سکوں۔ اِس لئے میں اپنے مضمون کو اِس طرف اُس طرف رکھ کر درمیان میں شریعت کی مثال بتاتا ہوں آپ کی توجہ اِس طرح سے ہو۔ تو خداوندِ عالم کا ایک قلم ہے، وہ قلم بولنے والا ہے، خدا سے یا تو گفتگو کرتا ہے یا خدا سے اشارہ پاتا ہے۔ تو مطلب یہ ثابت کرنا ہے کہ خدا ایک انسٹیٹیوٹ کی طرح ہے، وہ اکیلا کام نہیں کرتا ہے۔ جب کہ شریعت میں تسلیم کیا گیا ہے کہ خدا کا ایک قلم ہے اور خدا کی ایک تختی بھی ہے۔ وہ [تختی] کسی بے جان چیز کی نہیں ہے، وہ ایک عظیم رُوح ہے۔ تو خدا کے قلم سے مراد عقلِ کُلّی ہے اور خدا کی تختی اور لوحِ محفوظ سے مراد نفسِ کُلّی ہے۔ اسی طرح حملۃِ العرش ہے، عرش کے اُٹھانے والے۔ اگر اِس لفظ کو بے جان چیزوں کی طرح لے لیں یعنی عرش کو اگر ایک بے جان تخت مانیں، تو اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کا کوئی تخت ہے جس طرح دنیوی طور پر کوئی بادشاہ کسی تخت پر بیٹھا کرتا ہے، اِس طرح اگر مانا جائے تو خدا کا تخت بہت بڑا [اور] بھاری ہوگا اور اُس تخت کے اُٹھانے والے جو فرشتے ہیں جن کا نام عربی میں قرآن کی زبان میں حملۃِ العرش ہے، تو وہ کتنے

طاقتور ہوں گے، خدا کو بمع عرش کے اُٹھانے والے تو وہ خدا سے بھی زیادہ قوی ہوں گے۔ [جبکہ] خدا کو تو بہت پاور فُل ہونا چاہیئے نا، اگر ہم طاقت کے لحاظ سے [اس] جسمانی مثال [کو] لیتے ہیں، اور تخت کے نیچے فرشتوں کا آ کر اُس کے اٹھانے کا سوال اُس وقت ہوتا ہے کہ خدا یا تو بزرگی کی وجہ سے یا آرام طلبی کی وجہ سے تخت پر بیٹھتا ہے۔

دیکھئے! اگر ہم ظاہر میں جائیں تو ہمارا مسئلہ کبھی حل نہیں ہوگا، جب تک کہ ہم ظاہر کو چھوڑ کر تاویل میں نہ جائیں۔ بہر حال یہاں، اِن مثالوں سے ہمارا صرف اتنا کام بن جائے گا کہ شریعت بھی قائل ہے کہ خدا ایک اکیلا نہیں ہے۔ خدا انسٹیٹیوٹ کی طرح ہے۔ [خدا] جب انسٹیٹیوٹ کی طرح ہے تو چلیں آپ اِس میں زیادہ بحث نہ کریں، آگے بڑھیں کہ ہم صرف خدا کی خدائی کو، رسولؐ کی رسالت کو اور امامؑ کی امامت کو انسٹیٹیوٹ کی طرح مانیں اور بعد میں ہم کہیں گے کہ آیا یہ تین ادارے الگ الگ ہیں یا کہ اصل میں یہ ایک ادارہ ہے اور تعلیمات الگ الگ ہیں۔ جس طرح پرائمری سطح پر، سیکنڈری سطح پر، اعلیٰ سطح پر، جس طرح دُنیا کی تعلیمات کی سطحیں مقرّر ہوتی ہیں تو اسی طرح رُوحانی تعلیمات کی بھی مختلف سطحیں یا کہ مختلف درجات ہیں، تو اِن درجات کے لحاظ سے، تعلیم کے لحاظ سے بات الگ الگ ہو جاتی ہے، ورنہ حقیقت میں ایک ہی درجہ ہے۔ چلئے! اِس بات کو اسی طرح سے یہاں پر رہنے دیں، آگے آئیں کہ امام کی امامت بھی انسٹیٹیوٹ ہے۔ ہم کبھی الگ بتائیں گے کہ خدا کا رسولؐ، امامؑ کا ادارہ کس طرح ایک ہے۔ ہم میں سے کوئی شک نہیں کر سکتا ہے کہ ہم اِن تین (۳) درجوں کو الگ الگ مان رہے ہیں لیکن ہم نے بقولِ دُوسروں کے یہ بات کی، دُوسروں کی زبان سے یہ بات کی خدا، رسولؐ، امامؑ ہیں، نہیں تو یہ ایک ہی حقیقت ہے۔ اِس کو اتنا سُن کے پھر واپس آئیں امامؑ کی امامت کی طرف، کہ امام کی امامت ایک انسٹیٹیوٹ ہے، اُس میں آپ کا بھی حصّہ ہے۔

دُنیا میں امامؑ کی امامت چلتی ہے اور جس طرح ہم مانتے ہیں اگر یہ بات سچ ہے تو ہم امامؑ کے لشکر ہیں۔ ہم کسی ایک فرد کی قوت کو کیوں مانیں، خود کو طاقتور کیوں نہ بنائیں۔ جب کہ ہم حقیقت پر ہیں، وہ یہ کہ ہم میں سے ہر ایک امامؑ کے لشکر کا ایک بہادر سپاہی ہے، جسمانی طور پر بھی اور رُوحانی طور پر بھی۔ کیونکہ ہماری ہستی دُہری ہے، ہم دو دو ہیں، ہماری رُوحانیت اور ہماری شخصیت، لیکن ہماری ہستی دُہری ہونے کے باوجود یہ دونوں ہستیاں ایک دُوسرے سے دُور اور الگ نہیں ہیں، مل کر ہیں، پھر بھی دو ہیں، دو ہستیاں ہیں، ہم جسمانی اور مادّی ہستی میں ایک جسمانی بہادر سپاہی ہیں، ہم اپنی رُوحانی قوت میں امامؑ کے ایک بہادر رُوحانی سپاہی ہیں۔ کیا امامؑ نے مختلف موقعوں پر آپ کو، ہم کو لشکر قرار نہیں دیا ہے؟ اور امامؑ جو لفظ فرماتے ہیں اُس میں سو فیصد صداقت ہوتی ہے، وہ بات کوئی وقتی نہیں ہوا کرتی ہے۔ کیا آپ کو کبھی

بڑا کام میں شریک کرتے ہوئے امامؑ نے نہیں فرمایا کہ: تم اب رُوحانی لشکر میں داخل ہو گئے۔ (راجکوٹ، ۲۳۔۱۰۔۱۹۰۳) گر اتفاق سے آپ کی ٹولی میں یہ فرمان نہیں ہوا ہو تو کیا آپ نے کسی سے نہیں سُنا ہے کہ جن جن کو بڑا کام ملتا ہے وہ امامؑ کے رُوحانی لشکر کہلاتے ہیں اور یہ اصطلاح کیوں ہے؟ اِس کا کیا مطلب ہے؟ جب تک کہ آپ کے سامنے کوئی جنگ نہ ہو، تو کس طرح آپ سولجرز کہلا سکتے ہیں۔ میں نے کہا نا کہ ہماری ہستی دُہری ہے، رُوحانی ہستی، جسمانی ہستی، تو ہم جسمانی طور پر بھی جنگ کرتے ہیں اور رُوحانی طور پر بھی جنگ کرتے ہیں۔

جب آپ ہم سب صبح نورانی وقت میں چار اور پانچ کے درمیان جہاد کرتے ہیں تو اُس جہاد کی دو حیثیتیں ہیں، یعنی وہ جہاد As a whole ہمارے اندر بھی کام کرتا ہے اور اس کائنات میں بھی کام کرتا ہے اور وہ امامؑ کے نور سے مل کر دُنیا کے اندر کس طرح امن و امان قائم کرنا چاہئے اور شیطان کی جو قوتیں ہیں اُن کو کس طرح شکست دینی چاہئے اس کے لئے جنگ کا یہ Unit، امامؑ کی قوت کے ساتھ مل جاتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ جماعت خانے کی حاضری پر امامؑ کیوں زور دیتے ہیں۔ اُس کا راج قائم ہے، اُس کا راج اس کے لشکر سے قائم ہے۔ یہ تصوّر اچھا ہے یا یہ کہ ہم قسمت کو مانیں اور خود کو مفلوج سمجھیں۔ ہم سمجھیں کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں، اگر ہم ادب کے طور کہتے ہیں تو وہ ٹھیک ہے لیکن اِن طاقتوں کو مانتے ہوئے کہیں تو وہ درست ہے اگر ہم کوئی طاقت تسلیم نہیں کرتے ہیں تو یہ ہماری نا سمجھی ہے۔

سورج آپ کس چیز کو کہتے ہیں۔ آپ سورج اُس سرچشمے کو بھی کہیں اور اِس Universe کے اندر جتنی روشنی پھیلی ہوئی ہے اور جتنی حرارت اور جتنی کرنیں پھیل رہی ہیں ان کو بھی سورج میں شُمار کریں جب ہی سورج ہے۔ <u>صفت اور موصوف ملا کر چیز بن جاتی ہے</u>، سورج کی صفات کو، سورج کے فعل کو، سورج کی ہر چیز کو اُس سے الگ کر کے سورج کو سورج کہیں تو پھر یہ نامکمل سورج ہو جائے گا، جس میں کہ کوئی فعل نہیں ہے، جس میں کہ کوئی صفت نہیں ہے۔ ہم آپ امامؑ کی صفت ہیں، ہم آپ امامؑ کے نام ہیں، ہم آپ امامؑ کے فعل ہیں۔ آپ تجربہ کریں، آگے بڑھیں، ترقی کریں تو پتا چلے گا کہ کس حد تک ترقی ممکن ہے۔ پیروں کی مثال لیں، بزرگوں کی مثال لیں، ایک وقت ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جس میں آپ خود کو کہیں امامؑ، میں امامؑ ہوں، ایسا بھی کہہ سکتے ہیں۔ لوگوں نے، صوفیوں نے خود کو خدا قرار دیا تو کیا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ ایک وقت میں آپ خود کو امام محسوس کرنے لگیں گے۔ جب دُوئی یعنی Duality، Twoness ختم ہو جائے گی تو اس وقت آپ خود کو [روحانی طور پر] امامؑ کے ساتھ ایک پائیں گے۔ اُس وقت کہیں گے کہ ہم دو نہیں ہیں، ایک ہیں۔ تو مولائے روم نے ایک مردِ صوفی ہوتے ہوئے بھی کہا:

دوئی از خودبرون کردم، یکی دیدم دو عالم را
یکی جویم ، یکی گویم ، یکی دانم، یکی خوانم!

جب میں نے دوئی کو اپنی ہستی سے بدر کیا، باہر نکال دیا، تو میں نے دونوں جہاں کو ایک پایا۔ اب اِس کے بعد میں ایک کو مانتا ہوں، ایک کو جانتا ہوں، ایک کو بُلا تا ہوں اور ایک کو پہچانتا ہوں۔ اِس مقام پر اُس نے خود کو اپنے خداوند کے ساتھ ایک مان لیا، تو ہم اپنے خدواند کے ساتھ ایک ہیں۔ اگر ہم اپنے ظاہری اعمال سے قطع نظر، اپنی کمزوریوں سے قطع نظر اپنی حقیقت کی بلندی کو مانیں اُس کی طرف دیکھیں اور ازلی حقیقتوں پر غور کریں اور اِس وقت بھی جو ہماری رُوح کا Link ہے، جو رابطہ ہے اُس کو سمجھیں، تو ہم خود کو امامؑ سے الگ نہیں پاسکتے ہیں۔ جب ہم اُس کے ساتھ ایک ہیں، اگر یہ بات حقیقت ہے تو اِس سے، اِس تصور سے، اِس نظریئے سے ہماری ذمہ داریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں، ہم پر لازم ہوتا ہے کہ ہم رات کو بروقت جاگیں۔

دُنیا کے اندر کچھ لوگ قسمت کے اور تقدیر کے مارے ہوئے ہیں، تقدیر اور قسمت کوئی چیز نہیں ہے لیکن انہوں نے ایک مفروضہ مان لیا ہے اور کہتے ہیں کہ قسمت، کہتے ہیں کہ تقدیر، حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ تو انہوں نے اپنے سامنے جہالت کا ایک پردہ کھڑا کیا ہے اور وہ ذہنی طور پر خدا کی اُن طاقتوں سے کٹے ہوئے ہیں، وہ اپنے فرائض کو انجام نہیں دیتے ہیں لیکن اسماعیلی ایسے نہیں ہیں۔ اگر یہ بات حقیقت ہے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی کہ ہم امامؑ کے ساتھ ایک ہیں اور ہم امامؑ کی قوتیں ہیں، نور کی کرنیں ہیں تو کرنوں ہی کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اِس کائنات کو سنوارے۔ کرنوں کا جو حصّہ سورج کے قریب ہے اُن کا فرض نہیں ہے وہ تو ابھی دُور ہیں، جب وہ زمین کی طرف آئیں تو اُن پر فرض عائد ہوگا کہ دُنیا کو گرمائیں اور نباتات کو اُگائیں، فصلوں کو پکائیں اور سیارۂ زمین کو، دنیا والوں کو حرارت اور گرمی پہنچائیں۔ وہ روشنی کے ذرّات جب زمین سے قریب آئیں گے تو اُن پر یہ فرض عائد ہو جائے گا لیکن فی الحال اُن ذرّات پر یہ فرض ہے کہ زمین کو گرمائیں۔ اسی طرح ہم امامؑ کی کرنیں ہیں، میں ایک کرن ہوں، آپ میں سے ہر ایک، ایک ایک کرن ہے۔ آپ اپنے فریضے کو انجام دیں، محسوس کریں کہ آدمی اُس وقت زیادہ کام کرتا ہے جبکہ امکانیت کو سمجھتا ہے۔ نہر کے اِس کنارے سے اُس کنارے تک چھلانگ لگانے کے لئے جو جوان مرد کوشش کرتا ہے تو پہلے وہ Judge کرتا ہے اور اپنی ہمّت کو، قوت کو تیار کرتا ہے اور اُس مسافت کے مطابق چھلانگ لگاتا ہے، پہلے سے وہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ چھلانگ لگا سکتا ہے، جو گھبرا گیا اور جو ڈر گیا وہ کھڈے [گڑھے] میں گرتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو جو امکانیت دی گئی ہے، ہمارے اندر جو صلاحیت ہے اور ہم کس قدر ترقی کر سکتے ہیں اُس کو ہمیں Judge کرنا چاہیئے۔ دُنیا کے اندر کوئی بڑا ٹھیکے دار ہے یا کوئی ایسا شخص ہے جس کا کوئی بڑا منصوبہ ہے اور اُس کو عملی جامہ پہنانا ہے تو وہ Judge کرتا ہے، تخمینہ لگاتا ہے۔ وہ ڈر گیا اور تخمینہ نہیں سمجھا تو وہ ناکام ہے۔ دولت اُس کے پاس ہے یا نہیں ہے، کوئی فرق نہیں ہے، تو پہلے اُس کو علم آنا چاہیئے۔ ہمارے اندر جو قابلیتیں ہیں، جو صلاحیتیں ہیں اُن کا ہم کو اندازہ ہونا چاہیئے، جب ہی تو ہم ہمّت سے کام کریں گے۔ ہمیں اِس شک میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ ہم سے کوئی بھی کام ہوگا یا نہیں ہوگا۔ کیوں نہیں ہوگا؟ یقیناً ہوگا، قسمت، تقدیر کچھ بھی نہیں ہے، ہم نے ایسا سوچا ہے۔ ہم ترقّی کیوں نہیں کر سکتے ہیں، کیا وجہ ہے؟ گناہ ہے تو بخشا جا سکتا ہے، لاعلمی ہے تو علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کیا بات ہے کہ کیا امامؑ نہیں چاہتا ہے کہ ہم کو ترقّی دے، پھر ہمارے مُرید ہونے کا کیا فائدہ اور اُس کے ہمارے امامؑ ہونے کا کیا فائدہ؟ اور قیامت کے دن ہم کو بخشا جائے گا تو وہاں بہت ساروں کو نجات ملے گی۔ دُنیا میں بہشت دیکھنا چاہیئے اور کتنے فرامین ایسے ہیں جن سے رُوحانی ترقی کی اہمیت ظاہر ہے۔

تو ہمارا سب زور اِس بات پر ہونا چاہیئے کہ عبادت و بندگی میں اور علم میں باقاعدہ ہو جائیں Regular ہو جائیں انقلاب آئے، گریہ وزاری کریں، ہم خود کو ایسا ظاہر کریں کہ خدا کی رحمت کو رحم آوے، یہ ایک قابلیت ہے، تو پھر کیا ہوگا؟ ہمارے اندر انقلاب آئے گا اور ہماری بے حسی جو ہے وہ ختم ہو جائے گی، ہمارے اندر نئے جذبات اُبھریں گے اور نئی قوتیں بیدار ہو جائیں گی، جن کی وجہ سے ہم کام کریں گے۔ ہمیں سوچنا چاہیئے کہ عبادت میں بہت بہت بہت لذت ہے۔ دُنیا کے کسی اچھے انسان سے جب دوستی ہوتی ہے تو کتنی خوشی ہوتی ہے اور امامؑ کی رُوحانی دوستی ہو اور رُوحانی ملاقات ہو، دیدار ہو تو کتنی خوشی ہوگی۔ اِس کو Judge کرنا چاہیئے، اندازہ کرنا چاہیئے۔

اگر آپ کو نجات ملے اور آپ کو یقین ہو روشنی کے دیکھنے سے تو کتنی خوشی ہوگی۔ قبر کے عذاب کا جو خوف ہے وہ چلا جائے تو کتنی خوشی ہوگی، نکیر اور منکر اور قیامت کا حساب کتاب وغیرہ، اِس سے جیتے جی نجات ملے تو کتنی خوشی ہوگی، ایسے ایسے فائدے جو ہیں پیشِ نظر ہوں اور بھرپور کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم رُوحانی ترقی نہیں کر سکتے ہیں۔ ضرور کر سکتے ہیں اگر ہم کو دُنیا کے اندر کسی سوسائٹی کی ضرورت ہے اور کچھ لوگوں سے مذہبی رُوحانی دوستی کی ضرورت ہے وہ بھی ہے اور سب کچھ ہے [لیکن] علم ہے، فرامین ہیں، گنان ہیں، وقت ہے، زندگی ہے، تندرستی ہے، سلامتی ہے اور راہِ راست پر ہیں، صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ترقی نہیں کر سکتے ہیں۔ کیوں نہیں کر سکتے ہیں؟ ہمیں اپنے آپ

کی اصلاح کرنی چاہئے، اپنی عادتوں کو دیکھنا چاہئے کہ ہمارے اندر کیا خرابی ہے دیکھ سکتے ہیں ۔بَلِ الْإِنسَانُ عَلَى نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ وَلَوْ أَلْقَى مَعَاذِيرَهُ (۷۵:۱۴۔۱۵)، انسان اپنے عیوب کو، اپنی کمزوریوں کو دیکھتا ہے، پاتا ہے، کیوں علاج نہیں کرتے ہیں؟ شاید یہ ہوسکتا ہے کہ سالوں سے ہمارے دل کے اندر زنگ لگ گیا ہے۔ ہم بے حس ہو گئے ہیں، ہمارے احساسات، مذہبی احساسات مر چکے ہیں۔ ہمارا ضمیر ہم کو اب Blame بھی نہیں کرسکتا ہے اُس میں وہ Blame کرنے کی جو قوت تھی وہ بھی ختم ہو چکی ہے تو پھر ہمیں سوچنا چاہئے، ایسا تو نہیں ہوسکتا۔ مومن کو تو ایسا نہیں ہونا چاہئے، یہ چیز بہت دُور کی ہے، خدا نہ کرے کہ کوئی مومن ایسا ہو کہ بالکل وہ مردہ ہو چکا ہے کہ اُس کے اندر کوئی احساس نہیں ہے، کوئی افسوس نہیں ہے، عبادت نہیں ہوتی ہے، کوئی افسوس نہیں ہوتا ہے، بندگی نہیں ہوتی ہے کوئی افسوس نہیں ہوتا ہے، بُرے کام کئے جاتے ہیں کوئی افسوس نہیں ہوتا ہے اور نیکی سے اُس کو مزہ نہیں آتا ہے اس کو کوئی افسوس نہیں ہوتا ہے، تو اُس کو علاج کرنا چاہئے [کیونکہ وہ] بیمار ہے۔

بیمار آدمی کو کھانا کھانے سے کوئی خوشی، کوئی لذّت نہیں ملتی ہے لیکن ایک تندرست، جوان اور صحت مند انسان کو کھانا کھانے سے، سونے سے، جاگنے سے اور جہاد کرنے سے اور دوستوں کے ساتھ رہنے سے خوشی محسوس ہوتی ہے، تو اِسی طرح اگر ہم کو دینی اور مذہبی چیزوں سے کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی ہو تو ہم بیمار ہیں۔ تو بیماری کا علاج کرنا چاہئے، کسی ڈاکٹر، طبیب کے پاس جانا چاہئے یا خود اپنے آپ کا علاج کرنا چاہئے۔ تو اپنے آپ کا علاج یہ ہے کہ فرامین پڑھیں، کتابیں پڑھیں اور نیک صحبت میں رہیں، رفتہ رفتہ ایک دن میں نہیں کچھ وقت میں، کچھ دنوں میں ترقی ہوگی اور ضرور ہوگی اور ہر قسم کی طاقتیں استعمال کریں، صبح جاگیں، دعا کریں، گریہ وزاری کریں، لمبے لمبے سجدے دیں، اچھے لوگوں کے ساتھ دوستی قائم کریں، جماعت خانے میں جائیں، جماعت خانے کی تمام فضیلتوں کو حاصل کریں اور امامؑ کا تصوّر کریں، ہمیشہ دن رات خدا کے نام کو جاپیں اور کوئی جماعتی خدمت اختیار کریں، اچھی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھیں اور رُوحانی مجلس سے وابستہ ہو جائیں تو ان شاء اللہ ترقی نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ترقی ہوگی اور آپ منصوبہ بنائیں کہ آپ نے ترقی کرنی ہے، اِس سے خدا ناراض نہیں ہوگا۔ جب آپ نیک نیتی کرتے ہیں تو یہ خداوند تعالیٰ کی خوشی اور خوشنودی کا باعث ہے، تو نیک کام میں خداوند آپ کی مدد کرے گا۔

اِس کے لئے بہت ہی ضروری ہے، علم کا مزہ بھی تب آئے گا جب آپ عبادت بندگی میں محو ہو جائیں، خود کو مٹائیں، اپنے دل کی پاکیزگی کریں، ان شاء اللہ مولا مہربان رہے گا۔ یہ ترقّی کا زمانہ ہے اور دُنیا والے ترقّی کے لئے سوچتے ہیں، جو

دین میں نہیں تھے وہ بھی Meditation کے نام سے کچھ کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ Meditation کوئی چیز نہیں ہے، اور Transcendental Meditation ہے یا کچھ اور Meditation وہ بھی نہیں ہے۔ اسماعیلی مذہب کے مقابلے میں، اسمِ اعظم کے مقابلے میں وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ تو اِس کیسٹ کے اندر جن اچھے اسٹوڈنٹ نے مغرب سے آپ کو یا علی مدد کا پیغام دیا اور جنہوں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا اُن میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہ سوچ رہے تھے کہ Transcendental Meditation میں جائیں اور دس ڈالر دے کر مجلس میں بیٹھیں، کوئی کوئی ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی تھے [جنہوں نے] ہندو Philosophy کو بہت زیادہ پڑھا وہ اُس Philosophy سے متأثر تھے، کچھ دُوسرے فلسفوں سے متأثر تھے لیکن مولا کی رحمت سے اسماعیلی مذہب کے اندر اتنا پاور ہے کہ وہ اب دُوسری باتیں بھول چکے ہیں تو اُن میں سے بہت سے عزیزوں نے روشنی دیکھی ہے اور بہت کم عرصے میں وہ کامیاب ہو گئے۔ آپ نے اندازہ کیا کہ اُن کے اندر کتنے جذبات ہیں، وہ مغرب میں رہتے ہیں، مغرب کی رنگینیاں کچھ اور ہیں تو اِس کے باوجود اُن کے اندر دین کا کتنا زبردست جذبہ پایا جاتا ہے، وہ کتنی قربانی کا جذبہ رکھتے ہیں۔

بہرحال ان شاء اللہ آپ بھی کوشش کریں۔ آپ بھی بہت زیادہ کامیاب ہو جائیں، آپ کامیاب ہیں اور بھی کامیاب ہو جائیں، آپ ترقّی پر ہیں اور بھی ترقّی کریں، آپ نیک ہیں اور بھی نیک بنیں، آپ حقیقی ہیں اور بھی حقیقی بنیں۔ کیا ترقی کی کوئی Limit ہے؟ نہیں! ترقّی بہت آگے تک جاتی ہے۔ آپ عبادت کرتے ہیں ہم کو اندازہ ہے اور بھی عبادت کریں، آپ علم کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، مطالعہ کرتے ہیں اور بھی مطالعہ کریں اور بھی ترقی کریں لیکن آخر میں میں ایک بات کہوں گا کہ "قوم کی خدمت سب سے بڑی عبادت ہے" (کچھ مندرا۔ ۲۹۔ ۱۱۔ ۱۹۰۳) یہ میرا قول نہیں ہے میرے امامؑ کا برحق ارشاد ہے ہمیشہ خود کو نجات دلانے کے لئے نہیں سوچیں، دُوسروں کو راحت پہنچانے کے لئے سوچیں یہ اسلام کا بنیادی اصول ہے، آپ جماعت کی خدمت کریں لیکن کیا میں آپ کو اس سلسلے میں کوئی مفید مشورہ دے سکتا ہوں؟ کونسی خدمت کریں؟

بہت سی خدمات ہیں، ایک جماعت کے اندر محدود ہوتے ہوئے کئی خدمات ہیں شوز کمپنی سے لے کر پانی کمپنی سے لے کر اور کسی ادارے میں کام کرنا، والنٹیر کی ڈیوٹی انجام دینا اور کسی بھوکے کو کھانا کھلانا، کچھ بھی نیک کام کرنا یہ سب خدمات ہیں لیکن کونسی خدمت زیادہ مفید ہے؟ میں آپ کو بتا سکتا ہوں جس کی زیادہ ضرورت ہے۔ علم کی خدمت کریں، یہ میرا مشورہ ہے، میں خود علمی خدمت میں ہوں اِس لئے نہیں، آپ خود بھی سوچیں۔ ہمہ رس اور عالمگیر خدمت علم کے سوا اور کونسی خدمت ہو سکتی ہے۔ لاکھوں، کروڑوں روپیوں اور پیسوں سے آپ دُنیا والوں کو مطمئن نہیں کر سکیں گے۔ آپ کے

بہت سے بھائی ہیں، فرض کریں کہ دو کروڑ ہیں، آپ دو کروڑ کو کیا پہنچ سکتے ہیں، کتنے خزانے صَرف کریں گے، آپ علم کا ایک قطرہ جمع کریں، علم کی ندّی میں اُس کو ڈالیں وہ قطرہ اُس ندّی میں حل ہو جائے گا اور ساری ندّی میں آپ کی خدمت کے قطرے کے ذرّات ملے ہوئے ہوں گے اور اُس میں بہت برکت ہوگی، علم میں حصّہ لیں [تو] مزہ آئے گا جس کی ضرورت ہے۔

لوگ آپ کے مذہب والوں کو حقیر سمجھ رہے ہیں، لوگ آپ کو کافر قرار دینے کے دَرپے ہیں۔ لوگوں نے آپ کے خلاف کیا کیا لکھا ہے، آپ کو معلوم ہے؟۔ آپ کسی کو نہ کافر کہیں، نہ منافق کہیں لیکن اپنے دین کا تعارف تو کرائیں، اپنے بھائیوں کو کم سے کم سمجھائیں، یہ کسی کے خلاف کوئی عمل نہیں ہے، یہ عین قانون کے مطابق ہے آپ اپنے امامؑ کی تعریف کریں، آپ اپنے امامؑ کی معرفت کی روشنی پھیلائیں، حال میں اور مستقبل میں اسماعیلی افراد آپ کے لئے شکر گزار ہو جائیں گے۔ ایک علم کا زمانہ آنے والا ہے، یہ بہت پُر امن خدمت ہے اور سب کو پہنچنے والی خدمت ہے، مشرق سے لے کر مغرب تک پوری دُنیا میں پھیلنے والی خدمت ہے۔ اِس میں آپ حصّہ لیں، جو ہو سکے اتنا حصّہ لیں۔ آپ کو دُوسری خدمات بھی کرنی ہیں لیکن آپ اور مزید سوچیں، آپ کو کرسی والی خدمت ملتی ہے، چلئے آپ کو کوئی ایسی خدمت ملتی ہے جس میں بڑائی کا تصوّر ہو سکتا ہے، لوگ آ کر آپ کے ہاتھ کو پاؤں کو چومیں گے تو خطرہ ہے کہ آپ میں بزرگی آئے گی، آپ Proud ہو سکیں [ہو جائینگے]۔ اِس سے آپ کو بہت کم فائدہ ہونے کا اندیشہ ہے، کوئی باسعادت انسان ہو سکتا ہے [جو] اصل میں خود کو بچائے اور مولا کی خدمت کو بجا طور پر انجام دے اور اپنی عاجزی کو اور Humility کو برقرار رکھے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُر حکمت بیان

Click here for Audio

عنوان: مومن کی طاقتیں

کیسٹ نمبر: ۱۲   تاریخ: ۶۔۴۔۱۹۷۸، کراچی

آج کی مجلس بھی کتنی اہمیت کی حامل ہے کہ عرصۂ دراز کے بعد ہم عزیزان آپس میں دوبارہ مل رہے ہیں اور آج کی شب میرے عزیز الامین کے اِس پیارے گھر میں مجلس منعقد ہو رہی ہے۔ میں ایک بار آپ سب عزیزوں کے چہروں پر نگاہ ڈال کر محظوظ ہو رہا ہوں اور یہ میرا بہانہ ہے آپ کی رُوحوں سے طاقت اور قوت حاصل کرنے کا۔ چونکہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا کام اسی طرح سے چلتا ہے کہ میں آپ کی رُوحوں سے کچھ قوتیں حاصل کروں، آپ کے ایمان سے قوتیں حاصل کروں، آپ کی عقیدت سے، آپ کی محبت سے، آپ کے اخلاص سے، آپ کی صداقت سے، آپ کی اُن تمام صفات سے جو آپ کے اندر پائی جاتی ہیں، تو اسی طرح میں خود کو آگے بڑھانے کے لئے کوشش کرتا ہوں۔

میرے عزیزو! مومن کی زندگی بھی کس قدر غنیمت ہے اور کس قدر اہم ہے کہ اِس زندگی سے بہت سے اچھے کارنامے قائم کئے جا سکتے ہیں اور خداوند نے مومن کو جو اس دنیا میں بھیجا ہے اور زندگی کی جتنی مدّت عطا کی ہے، خداوند کی اس میں بہت مہربانی ہے، بڑی رحمت ہے، مومن اِس زندگی کو صَرف کر کے بہت کچھ کر سکتا ہے، بہت کچھ کر سکتا ہے اور بہت کچھ کما سکتا ہے۔ کیونکہ جو موقع مومن کو حاصل ہے وہ دُنیا کے کسی فرد کو حاصل نہیں ہے، اِس لئے مومن خداوند تعالیٰ کی یاری سے اور اُس کی ہدایت کی روشنی میں بہت کچھ کر سکتا ہے اپنی آخرت کے لئے، اپنی عاقبت کے لئے، اپنی دُوسری دنیا کے لئے مومن بہت کچھ کر سکتا ہے اور بہت کچھ کما سکتا ہے، اور دُوسروں کو بہت کچھ اپنی زندگی سے فائدہ دلا سکتا ہے۔ تو مومن کو چاہئے کہ اِس زندگی کو صَرف کرنے کا جو زرّین اصول ہے اُس کو سمجھے اور ہر وقت یہ سوچے کہ وہ اپنی زندگی کے لمحات کو کس طرح صَرف کرے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ اُس کو سوچنا چاہئے جس طرح ایک کاروباری انسان اپنی تجارت کے بارے میں، اپنے کاروبار کے بارے میں سوچتا ہے، وہ دن رات سوچتا ہے، وہ ہمیشہ سوچتا ہے کہ اُس کا کام کس طرح آگے بڑھے، کس طرح اُس کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو اور سال بہ سال اُس کی ترقّی کس طرح ہو سکتی ہے، اُس کے لئے وہ سوچتا ہے اِسی طرح مومن کو بھی سوچنا چاہئے کہ وہ اپنی اِس زندگی سے کس طرح زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے کہ جس سے اُس کی دُنیا بھی آباد ہو اور آخرت بھی آباد ہو۔

مومنین! ہماری یہ مجلس بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اِس مجلس تک خود کو پہنچانے کے لئے ہم بہت سی رُکاوٹوں

سے، بہت سی مجبوریوں سے آگے بڑھ کر بہت کچھ کرتے ہیں اِس لئے اِس مجلس سے خوب فائدہ اٹھانا چاہیئے ۔ اِس میں عبادت ہو، اِس میں علم کی باتیں ہوں اور اُن تمام باتوں کو ذہن نشین کرلیا جائے تا کہ وقت آنے پر یہ باتیں کام آئیں ۔ اِس دفعہ مجھے اپنی جمعیت سے، اپنے عزیزوں سے [مل کر] جتنی خوشی ہوئی ہے، اتنی خوشی کبھی نہیں ہوئی تھی ، اِس لئے کہ آپ نے شروع سے لے کر آخر تک احساسِ ذمہ داری سے مجلس کی تمام باتوں کی طرف توجہ دی تھی اور جس کے نتیجے میں آپ نے دانشمندی کا ثبوت دیا۔ آپ میں سے ہر فرد نے ایک اچھا کردار ادا کیا۔ مجھے یہ معلوم ہوا تو بہت ہی خوشی ہوئی اور یہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا، آپ کو اس مجلس سے کتنی والہانہ محبت ہے اُس کا ایک ثبوت تھا، لہٰذا میں بہت خوش ہوں لہٰذا میں آپ کو دل کی گہرائی سے بہت دعائیں دیتا ہوں، عاجزانہ دعائیں، درویشانہ دعائیں اور مخلصانہ دعائیں ۔ مولا آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کامیاب بنائے اور دین و دُنیا کی کامیابی آپ کے قدم کو چُومے یہ میری دعا ہے ۔

اِس کے بعد مومنین ! میں آپ کو مومن کی طاقتوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں کہ مومن کے اندر کیا کیا طاقتیں ہیں، اِس کے بارے میں سوچنا، اِس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا نہایت ہی ضروری ہے ۔ کیونکہ ہمیں طاقتوں کی ضرورت اِس لئے ہے کہ ہم اپنے ایک قوی دشمن کے خلاف جہاد کرنا چاہتے ہیں یا کہ [ہمیں] جہاد کرنے کی ضرورت ہے اور وہ قوی اور ظالم دشمن نفسِ امّارہ ہے، جس کے لئے ہمیں اپنے اندر دیکھنا ہے، ٹٹولنا ہے کہ ہمارے پاس کون کون سی طاقتیں ہیں جن سے کام لے کر ہم اپنے اِس ظالم اور زبردست دشمن کے خلاف جہاد کر سکتے ہیں اور اُس کو شکست دے سکتے ہیں اور خود غالب آسکتے ہیں تو اِس کے لئے سوچنے کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ مومن کے اندر ایک سب سے اچھی اور ایک سب سے اعلیٰ طاقت فنا کی طاقت ہے ۔ فنا کی طاقت سے مُراد عاجزی ہے اور شکستگی ہے، گریہ وزاری ہے، جس کے اندر طاقتوں کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے ۔

مومنین ! فنا میں طاقت کیوں ہے؟ وہ اِس لئے جیسا کہ آپ نظامِ قدرت کو، فطرت کو جانتے ہیں، اِس دُنیا کے اندر کسی جگہ سے جب کوئی چیز خالی ہو جاتی ہے تو اُس کی جگہ پر دُوسری چیز آجاتی ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ اگر کوئی برتن ہے تو اُس میں سے ایک چیز کو جب آپ خالی کرتے ہیں تو دُوسری چیز خود بخود اُس میں آجاتی ہے ۔ جیسے گلاس میں پانی ہے، جب آپ پانی کو گراتے ہیں تو اُس میں خود بخود ہَوا ابھر جاتی ہے ۔ اِسی طرح جب ہم اپنی خودی کو فنا کے ذریعے سے ہٹاتے ہیں تو اُس خودی میں خدائی آتی ہے، کسی بھی درجے پر ہمارے اندر خدائی آجاتی ہے ۔ ہم محسوس کرتے ہیں یا نہیں کرتے ہیں لیکن اگر ہم اپنے آپ کو پوری طرح سے فنا کر دیتے ہیں، یعنی ہماری ہستی کے اِس برتن سے جب ہم انا کو ہٹا لیتے ہیں، خودی کو نکال دیتے ہیں، تو خودی کی جگہ پر خدائی آجاتی ہے، وہ خود بخود آجاتی ہے ۔ اِس کے یہ معنی ہیں کہ خدائی ہماری طرف جُھکی ہوئی ہے، وہ ہر وقت یہ چاہتی ہے کہ ہماری خودی کی جگہ لے لیکن وہ نہیں آسکتی ہے، اِس لئے کہ ہم نے اپنے

اندر اپنی کمزور صفات بھر لی ہیں، اپنی نا تمام صفات قائم رکھی ہیں۔ جب ہم عجز و انکساری اور عاجزی کے ذریعے سے یا گریہ و زاری کے وسیلے سے آہستہ آہستہ اپنی ہستی کو فنا کرتے ہیں، تو اُس وقت ہماری ہستی کا ذرّہ ذرّہ فنا ہو کر ختم ہو جاتا ہے اور اُن ہستی کے ذرّات کی جگہ پر رفتہ رفتہ خدائی صفات بھر جاتی ہیں، اور اُس وقت ہم طاقتوں سے، قوتوں سے بھر جاتے ہیں، ہم اُس وقت سنجیدہ ہو جاتے ہیں ہم کو اُس وقت سکون حاصل ہوتا ہے، اطمینان آتا ہے۔ مومن ہمیشہ یہ تجربہ کر سکتا ہے، اپنے آپ میں یہ معجزہ دیکھ سکتا ہے، بشرط یہ کہ مومن خود کو مٹانے میں کامیاب ہو جائے، بشرط یہ کہ مومن مخلص ہو، سچّا ہو، عاجز ہو، دانا ہو اور اُس کے دل میں اخلاص و محبّت ہو اور سچائی ہو تو مومن یہ معجزہ دیکھ سکتا ہے۔ عقل کی نظر سے مشاہدہ کر سکتا ہے کہ اُس کی ہستی یا کہ خودی رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے اور اُس کی جگہ پر خدائی صفات آجاتی ہیں، یہ سب سے بڑی طاقت ہے۔

آپ نے یہ روایت سنی ہے کہ منصور نے انا الحق کہا تھا، اِس انا الحق کے دو معنی ہیں، ایک معنی تو یہ ہے کہ اُس نے کہا میں سچ ہوں، میں سچائی ہوں، میں حق ہوں، میں صداقت ہوں۔ دُوسرے معنی یہ ہیں کہ اُس نے کہا ''میں خدا ہوں''۔ دونوں معنی بجا ہیں اور اُس نے کب یہ کہا؟ اُس نے اُس وقت کہا جب ذکر و عبادت کے نتیجے میں اُس نے اپنے آپ کو مٹایا، اپنے آپ کو فنا کر دیا۔ اِسی کو ''فنا فی اللہ و بقا باللہ'' کہتے ہیں، خدا میں مٹ جانا اور مٹ کر خدا ہی میں زندہ ہو جانا۔ آپ نے ہم نے دُنیا میں ایسی بہت سی مثالیں دیکھی ہیں کہ چیزیں فنا ہو جاتی ہیں کسی دُوسری چیز میں اور پھر اُس چیز میں بقا پاتی ہیں۔ لکڑی کو آپ نے دیکھا ہے کہ آگ میں فنا ہو جاتی ہے یعنی جل جاتی ہے، پھر آگ میں بقا پاتی ہے یعنی لکڑی روشنی نہیں تھی لیکن جب فنا ہو گئی تو روشنی بن گئی۔ یہ مومن کے خدا میں فنا ہو جانے اور بقا پانے کی مثال ہے، فنا فی اللہ اور بقا باللہ کی ایک بہترین مثال لکڑی کا جل جانا اور نور بن جانا ہے۔ لکڑی پر آپ نے غور نہیں کیا ہے تو موم بتّی کو لیجئے، جس کو شمع کہا جاتا ہے۔ یہ بہت مشہور ہے کتابوں میں، قصّوں میں، شاعروں کی شاعری میں۔ شمع پر بہت سی نظمیں بنائی گئی ہیں تو شمع کو دیکھیں کس خاموشی سے فنا ہوتی چلی جاتی ہے اور کس خاموشی سے بقا پاتی چلی جاتی ہے۔ یہ مومن کے خدا میں فنا ہو جانے اور پھر خدا ہی میں زندہ ہو جانے کی مثال ہے کہ موم بتّی آگ میں، شعلے میں، روشنی میں فنا ہوتی ہے اور پھر روشنی میں زندہ ہو جاتی ہے، یہ انرجی ہے، یہ طاقت ہے۔

دیکھا آپ نے کہ اگر موم بتّی جلتی نہیں ہے تو اُس کا کوئی پاور نہیں ہے، اُس کی کوئی طاقت نہیں ہے لیکن جب جل جاتی ہے تو وہ پاور بن جاتی ہے اور یہ کہ کتنے بڑے کمرے کی تاریکی کو دُور کر سکتی ہے اور کتنے لوگوں کو روشنی مہیا کر سکتی ہے، یہ طاقت ہے، یہ انرجی ہے۔ اسی طرح آگ کو دیکھئے کہ آگ جب Fuel سے، ایندھن سے آگ بن جاتی ہے تو ایندھن، لکڑی، تیل وغیرہ جل جاتا ہے، فنا ہو جاتا ہے تو اُس کی تین طاقتیں بن جاتی ہیں، اُس میں سے تین طاقتوں کا ظہور ہو جاتا ہے، گرمی اور روشنی اور پکانے اور Boiling کرنے یا جلانے کی طاقت وغیرہ۔ دیکھا آپ نے کہ ایک چیز اگر خاموش

ہے،فنا نہیں ہورہی ہے تو اُس میں کوئی انرجی نہیں ہے،کوئی توانائی نہیں ہے،کوئی قوت نہیں ہے لیکن جب وہ فنا ہو جاتی ہے تو اُس میں سے طاقت بن جاتی ہے۔دُنیا کے اندر بہت سی چیزیں ملیں گی آپ کو جو کہ فنا کے اصول پر کام کرتی ہیں اُن کو آپ چاہیں تو Principle of Annihilate ہیں یا کچھ اور لفظ سے اُن کو یاد کریں اور دیکھیں دُنیا کے اندر مشینری چلتی ہے تو وہ بھی فنا کے پاور سے چلتی ہے کوئی بھی مشینری،خواہ وہ ریل گاڑی ہے یا موٹر کار ہے یا جہاز ہے،راکٹ ہے، کچھ بھی ہو اُس کے اندر Burning کا سسٹم ہے اور Burning کیا ہے؟ فنا ہے،کوئی چیز فنا ہو رہی ہے،اُس کے اندر اُس فنائیت کے نتیجے میں اتنی بڑی طاقت،اتنا بڑا پریشر اتنا زبردست دھماکا،آواز وغیرہ یہ سب چیزیں فنا کے نتیجے میں ہیں اور آپ نے سنا ہوگا کہ ایٹم کے توڑنے سے یا ٹوٹ جانے سے اور اُس کو جلانے سے جوہری توانائی پیدا ہو جاتی ہے،جو زبردست انقلابی طاقت ہے۔

آج کل خلانوردی کے سلسلے میں یعنی Space میں گھومنے اور سیاروں میں چلے جانے کے لئے بھی جن چیزوں سے کام لیا جاتا ہے وہ چیزیں فنا کے اُصول پر قائم ہیں،اُن سے فنا کا کام لیا جاتا ہے اور دیکھئے! ہمارے اندر ہمارے جسم کی نشوونما بھی فنا کے اصول پر قائم ہے، جب ہم غذا کھاتے ہیں تو غذا ہم میں فنا ہو جاتی ہے جس کو آپ ہضم ہو جانا کہتے ہیں۔ہضم ہو جانا کیا ہے؟ فنا ہو جانا ہے۔تو ایک چیز فنا ہو جاتی ہے،تب ہی تو ہماری صحت بنتی ہے،ہمارے اندر انرجی پیدا ہوتی ہے،طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور مزید دیکھئے،مٹی فنا ہو جاتی ہے،جب ہی تو نباتات یعنی اُگنے والی چیزوں کی شکل میں آتی ہے۔کتنا رنگ ملتا ہے،کتنی خوبی ملتی ہے۔مٹی کا پھول بن جانا اور اُس میں سے خوشبو پیدا ہو جانا کس نے دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا ہے، جب تک کہ مٹی فنا نہ ہو جائے،نباتات میں فنا نہ ہو جائے تو وہ کبھی بھی پھول نہیں بن سکتی ہے،مٹی سے خوشبو نہیں آتی ہے،مٹی مٹی ہے اور جب مٹی گھاس پات میں،درخت میں،اُگنے والی چیزوں میں فنا ہو جائے تو اُس کو ایک رُوح ملتی ہے،اُس کو رنگ ملتا ہے،اُس کو خوشبو ملتی ہے اور اُس کی شکل بدل جاتی ہے اور وہ نشوونما پاتی ہے مٹی اور گھاس، نباتات جب [تک] جانور میں فنا نہ ہو جائے تو گھاس گوشت نہیں بن سکتی،گھاس دودھ نہیں بن سکتی،گھاس چل نہیں سکتی، جب گھاس جانوروں میں فنا ہو جائے یعنی جانوروں کی غذا بن جائے اور اُن میں ہضم ہو جائے تو گھاس کو دُوسری رُوح ملتی ہے جو رُوحِ حیوانی ہے اور اس کی شکل بدلتی ہے،گھاس دودھ میں تبدیل ہو جاتی ہے،گھاس گوشت بن جاتی ہے اور درخت میں سے جو طاقت ہے وہ تنے سے اور ٹہنیوں سے گزر کر شاخوں میں اور کلیوں میں،پھولوں میں پھر پھلوں میں جب منتقل نہیں ہوتی ہے وہ طاقت،وہ مادّہ تو اُس میں سے پھل نہیں بنتا ہے۔تو چلئے یہ حیوانوں کی بات تھی حلال جانور ہیں وہ جب تک خود کو انسانوں کی خاطر قربان نہ کر دیں،فنا نہ ہو جائیں تو وہ حلال جانور انسان کی شکل میں نہیں آسکتے ہیں،وہ آدمی نہیں بن سکتے ہیں اِس کے بغیر،فنا کے بغیر تو دیکھا مٹی گھاس پر قربان ہو جاتی ہے،گھاس پات نباتات،حیوان پر قربان ہو

جاتی ہے، حیوان انسان پر قربان ہو جاتا ہے، فنا ہو جاتا ہے اور انسان خود کو فرشتے میں تحلیل کرتا ہے، خود کو فرشتے پر قربان کر دیتا ہے، انسان فرشتے میں Dissolve ہو جاتا ہے، مومن فرشتے میں فنا ہو جاتا ہے اور فرشتہ خدا میں فنا ہو جاتا ہے۔ تو دیکھا دُنیا کے اندر فنا ہو جانے سے کیا ہوتا ہے اور کیا بنتا ہے؟ نظامِ قدرت کو آپ نے دیکھا یہ کائنات منہ بولتی کتاب ہے، اِس سے ظاہر ہے کہ فنا ہو جانے میں سب کچھ ہے۔ اِس لئے مومن کو اگر طاقت کی ضرورت ہے تو عبادت، بندگی اور اخلاص و محبت اور خدمت کے وسیلے سے خود کو مقصدِ اعلیٰ میں فنا کر دینا چاہئے تا کہ اس کی ترقی ہو یہ مومن کی طاقت کا ایک راز ہے۔ ایسی مثالیں آپ کو بہت زیادہ ملیں گی اور اِس میں کوئی شک باقی نہیں رہے گا کہ مومن کی کامیابی فنا میں ہے اور اِس لئے بزرگانِ دین نے فنا کی تعریف کی ہے، تصوّف کی کتابوں میں بھی فنا کا بار بار ذکر آتا ہے، یہاں تک کہ ہمارے مقدّس فرامین میں بھی اِس کا ذکر آتا ہے کہ امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ السّلام نے اور دُوسرے اماموں نے مختلف مواقع پر فنافی اللہ بقابا اللہ اور اصل میں واصل ہو جانا اِس کا ذکر فرمایا ہے۔ بہت سے الفاظ میں، بہت سی عبارتوں میں اِس بھید کا ذکر فرمایا ہے کہ فنا ہو جانا مومن کے لئے بہت ہی ضروری ہے اور اس کے فلسفے کو سمجھنا بہت ہی ضروری ہے۔ کسی کام کے فلسفے کو سمجھے بغیر اُس کو انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اِس کے لئے ہر وقت مومن کو سوچنا چاہئے۔

لیکن ایک بات ہے کہ کیا مومن جب بھی چاہے خود کو فنا کر سکتا ہے؟ نہیں جب تک کہ مومن خود کو پہلے سے تیار نہ کرے، جب تک کہ مومن اِس فلسفے کو نہ سمجھے، جب تک کہ مومن ایسی عادتیں خود میں پیدا نہ کرے جو کہ فنا ہو جانے میں مدد دیں تو وہ خود کو فنا نہیں کر سکتا ہے، اِس لئے مومن کو حلیم الطّبع ہونا چاہئے، صبر والا ہونا چاہئے، سنجیدہ ہونا چاہئے اور بہت نرم دل ہونا چاہئے۔ ایسا ہو کہ کسی بھی مومن کے دکھ درد کو دیکھے تو اُس کے آنسو بھر آئیں، کسی مومن کی خوبی کو دیکھے، ایمان کی خوبی کو دیکھے تو اُس کا دل پگھل جائے، کسی بھی عبادت اور بندگی کی اچھی بات سننے میں آئے تو اُس کی آنکھوں سے آنسو نکلیں، آنکھیں تر ہو جائیں۔ ایسی عادت ہو تو آسانی سے خود کو فنا کر سکتا ہے اور پھر بھی مومن کے لئے اور بھی بہت سے وسیلے ہیں، کسی ایک کام سے نہیں مجموعی طور پر تمام اعمال سے خود یہ درجہ حاصل کر سکتا ہے اور کیونکہ خداوندِ عالمین کی حکمت اور اُس کی مہربانی بہت زیادہ ہے، یہ سیدھا سادہ طریقہ ہے جس کا میں نے ذکر کیا، اِس کے علاوہ بھی بہت سے طریقے ہیں جس سے مومن خود کو فنا کر سکتا ہے، وہ خدا سے یعنی امامؑ سے محبت کر کے خود کو فنا کر سکتا ہے، وہ اچھی خدمت کر کے خود کو فنا کر سکتا ہے اور وہ مسلسل عبادت سے بندگی سے خود کو فنا کر سکتا ہے۔ تو یہ فنا کا طریقہ ہے اور جس سے کہ مومن نفس کو پامال کر کے یعنی پیروں کے نیچے نفس کو روند کر اور اس کو شکست دے کر منزلِ مقصود کی [طرف] قدم بڑھاتا ہے اور خدا کے حضور میں پہنچتا ہے اور خدا میں وہ فنا ہو سکتا ہے۔ لیکن فنا کا مطلب یہ نہیں کہ انسان دُنیا سے ناپید ہو جائے اور نظر ہی نہ آئے اور مٹ جائے یہ بات نہیں ہے، اِس فنا سے مُراد یہ ہے کہ اپنے اندر جو خامیاں ہیں ہم [اُن کو] دُور کریں۔ جس طرح ایک کچا میوہ ہے وہ رفتہ

رفتہ اپنی خامی کو دُور کر دیتا ہے اور وہ پختہ ہو جاتا ہے، پک جاتا ہے۔کس طرح پک جاتا ہے؟ وہ نور میں فنا ہو جاتا ہے، سورج کی حرارت، گرمی اور روشنی سے استفادہ کرتے کرتے وہ پختہ ہو جاتا ہے،اِس طرح مومن نور میں فنا ہوسکتا ہے، یہ اُس پھل کا فنا ہو جانا ہے۔اِس سے ہم کو یہ نتیجہ ملا کہ فنا ہو جانا رفتہ رفتہ بھی ہے اور یکا یک بھی ہے۔لکڑی یکا یک فنا ہو جاتی ہے اور موم بتّی بھی یکا یک فنا ہو جاتی ہے،کوئی گولی ہے اُس کے اندر بارود ہے تو وہ بھی یکا یک Burst ہو جاتی ہے،ایک دم سے فنا ہو جاتی ہے لیکن میوہ جو ہے، پھل جو ہے وہ اپنی خامی سے پختگی میں آنے کے لئے جتنا وقت درکار ہے اُس وقت میں وہ پھل فنا ہو جاتا ہے،پھل بھی فنا ہو جاتا ہے۔فنا کا مطلب تبدیل ہو جانا ہے،فنا کا مطلب بُرائی سے اچھائی کی طرف آنا ہے،فنا کا مطلب سایوں کو تاریکیوں کو چھوڑ کر روشنی کو اختیار کرنا ہے،طاقت اور خوبی پیدا کرنا ہے، یہ فنا ہے۔

فنا طرح طرح کی ہے،اپنے طور سے پھول بھی فنا ہو جاتا ہے وہ پھول جس وقت غنچہ ہوتا ہے تو اُس وقت اُس میں خوبیاں نہیں ہوتی ہیں،اُس میں خوشبو نہیں ہوتی ہے،اُس میں رنگینی نہیں ہوتی ہے،اُس میں خوبصورتی نہیں ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ نور میں وہ غنچہ،وہ کلی فنا ہو جاتی ہے اور پھول کے رُوپ میں غنچہ نمودار ہو جاتا ہے یہ پھول کا فنا ہو جانا ہے،اِسی طرح جس طرح میں نے کہا تھا کہ مٹّی بھی فنا ہو جاتی ہے لیکن مٹّی لکڑی کی طرح موم بتّی کی طرح فنا نہیں ہو جاتی ہے اُس کا فنا ہو جانا الگ ہے۔ہر چیز کا جلنا ضروری نہیں ہے،مُراد تبدیل ہو جانا ہے تو ہوسکتا ہے کہ بہت سے مومنین آہستہ آہستہ اندر ہی اندر سے فنا ہو جائیں،اُن میں تبدیلی آجائے،اُن میں رنگینی آجائے،اُن میں خوبصورتی آجائے،اُن میں خوشبو پیدا ہو جائے کتنی اچھی بات ہے۔خوشبو!اور خوشبو بھی قسم قسم کی ہے،مومن کی خوشبو الگ ہے اور پھول کی خوشبو الگ ہے۔پھول کی خوشبو سے صرف ہمارا مادّی دماغ معطّر ہو جاتا ہے،خوش ہو جاتا ہے اور ایمان کی خوشبو سے ہماری رُوح، ہماری عقل کو خوشبو محسوس ہوتی ہے۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ کتنے اچھے مومنین ہیں اِن سے خوشبو آتی ہے،مادّی نہیں رُوحانی،اخلاقی،عقلی،تو کتنی خوشی ہے اِن کی باتوں سے خوشبو آتی ہے کہ وہ عبادت کرتے ہیں،بندگی کرتے ہیں یا عام طور پر گفتگو کرتے ہیں تو اُن کے منہ سے خوشبو آتی ہے،اُن کی اچھی باتوں سے خوشبو آتی ہے،وہ ایسی اچھی باتیں کرتے ہیں کہ آدمی کو رشک آتا ہے،آدمی سے وہ نرمی سے بولتے ہیں،احتیاط سے گفتگو کرتے ہیں،اُن کو ہر وقت یہ احتیاط رہتی ہے کہ بات میں ذرا بھی خلش نہ ہو یعنی چبھن نہ ہو،جس طرح کانٹے میں چبھن ہوتی ہے،خلش ہوتی ہے،وہ چبھن گلاب کے جھاڑ سے بھی ہو تو چبھن ہی ہے۔شاعروں نے بار بار اِس خلش کو،چبھن کو استعمال کیا ہے۔کہا ہے کہ دُنیا میں بہت سے پھول ایسے ہیں جو کانٹوں کے بغیر اور کانٹوں کی چبھن کے بغیر حاصل نہیں ہوتے ہیں تو چبھن ہی ہے،دیکھا آپ نے کہ گلاب کے جھاڑ میں بھی اگر چبھن ہے تو وہاں چبھن ہی ہے، مومن میں اگر چبھن ہو تو وہ چبھن ہی کہلائے گی،وہ خلش ہی کہلائے گی۔مومن میں چبھن نہیں ہونی چاہئے۔کیا مزہ ہے کہ پھول حاصل کرنے کے لئے ہاتھ بڑھائیں اور ہاتھ میں کانٹے چبھ جائیں،تو مومن کو بغیر کانٹے کا پھول ہونا چاہئے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ مومن کو بہت احتیاط رہتی ہے اِس لئے وہ بہت ہی احتیاط سے بولتا ہے اور اُس کی رُوح کو خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی رُوح خوش وخرسند رہتی ہے، اُس کا ضمیر دُوسروں کی طرح مرُدہ نہیں ہوتا ہے، اُس کا ضمیر زندہ رہتا ہے کیونکہ اُس کی سب باتیں اور سب کام اچھے ہیں، پسندیدہ ہیں۔ خدا کی نظر میں بھی اور انسانوں کی نگاہ میں بھی اُس کی باتیں پسندیدہ ہیں کیونکہ میں نے کہا نہ کہ جب وہ بولنے کے لئے منہ کھولتا ہے تو خوشبو ہوتی ہے، رُوح کی خوشبو، عقل کی خوشبو، اخلاق کی، دین کی خوشبو یعنی وہ ایسی اچھی باتیں کرتا ہے۔

ضروری نہیں ہے کہ ہر مومن فلسفی ہو۔ فلسفی ہونا اچھا ہے لیکن فلسفے کے بغیر بھی دین قائم رہ سکتا ہے۔ فلسفے کی کیا بات ہے، وہ تو ایک مزید کوشش ہے، ایمان ہونا چاہئے، محبت ہونی چاہئے، صداقت ہونی چاہئے اور ادب ہونا چاہئے، ہمدردی ہونی چاہئے۔ ایسی بہت سی صفات ہیں جو علم کے بغیر ہیں، علم کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم نہیں چاہئے، علم چاہئے لیکن علم کے حاصل کرنے سے پہلے بھی گزارہ ہوسکتا ہے اور اچھی طرح سے مومن چل سکتا ہے، تو اچھی صفات ہونی چاہئے۔ امام نے فرمایا کہ "مومن کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فلسفی ہے۔ مومن باور کرنے کو، یقین رکھنے کو کہتے ہیں"۔ تو دین کے معاملے میں باور کرنے کی جب مکمل صلاحیت ہوتی ہے تو وہ مومن ہے۔ علم بعد کی چیز ہے تو میں کہہ رہا تھا کہ فنا ہو جانے سے یہ طاقت حاصل ہوتی ہے اور جس مومن میں حقیقی محبت ہو تو یہ محبت اُس کو فنا کرسکتی ہے۔ فنا کرنے کے لئے کسی دُوسری طاقت کی ضرورت ہے جس طرح آگ، سورج اور اِس قسم کی دُوسری چیزیں جو کسی بھی چیز کو فنا کرسکتی ہیں تو محبّت بھی ایک طاقت ہے جو کسی مومن کو فنا کرسکتی ہے کیونکہ یہ ایک طرح کی آگ ہے جو کہ ہمارے نفسِ امّارہ کو آہستہ آہستہ پگھلا سکتی ہے۔

بہر حال ہم میں ترقّی کا شوق ہونا چاہئے اور ترقّی کے فلسفے کو ضرور سمجھنا چاہئے یعنی ترقّی کا جذبہ ہم میں ہونا چاہئے اور فلسفے سے کوئی بڑا علم مراد نہیں ہے، صرف اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ ہم ترقّی کرسکتے ہیں، ہم آگے بڑھ سکتے ہیں، ہم فنا کو سیکھ سکتے ہیں اور فنا میں جاسکتے ہیں اور فنا سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، تو ہم اِس طرح سے خود کو فنا کرسکتے ہیں۔ اچھی صحبت اتنی ضروری ہے جتنی کہ فنا کرنے کے لئے کسی بڑی طاقت کی ضرورت ہے، اچھی صحبت میں رہے تو مومن فائدے میں رہتا ہے۔ جس طرح بُری صحبت بُری طرح سے اثر انداز ہو جاتی ہے اسی طرح سے اچھی صحبت اچھی طرح سے اثر انداز ہوسکتی ہے۔ متواتر اور مسلسل کوشش ضروری ہے، یہ فطرت ہے کہ کوئی بھی چیز مسلسل کوشش سے کامیاب ہو جاتی ہے۔ درخت ہو، انسان ہو، جانور ہو اُس کی نشو ونمائی مسلسل ہو جاتی ہے اور اُس کو مسلسل وقت چاہئے، اسی طرح جب ہم رُوحانی ترقّی چاہتے ہیں تو اِس کے لئے تسلسل کی ضرورت ہے، مسلسل کوشش کی ضرورت ہے اور ہمیں سمجھنا چاہئے کہ کون سا کام مفید ہے اور کون سا کام مضر، نقصان دہ ہے، یہ جاننے کی ضرورت ہے۔ ان شاء اللہ آپ کی نیک نیّتی اور دینداری، علم دوستی اور ایسی بہت سی دُوسری صفات کے نتیجے میں رفتہ رفتہ ترقی ہوگی اور ان شاء اللہ آپ کی یہ جو مجالس ہیں یہ کامیاب ہیں، اِن سے فائدہ ملے گا

اور فائدہ مل رہا ہے۔آپ کو یقین آیا ہے، آپ مطمئن ہیں کہ اِن مجالس سے فائدہ ہی فائدہ ہے اور آپ دُعا مانگیں کہ مولائے زمین و زمان اِن مجالس سے مومنین کو اور جملہ جماعت کو فائدہ دلائے [آمین] اور مولا جملہ جماعت کو تمام بُرائیوں سے بچائے رکھے [آمین]، شیطان کے شر سے بچائے رکھے [آمین] اور مولا تمام جماعت کو اپنی پناہ میں رکھے [آمین]، شیطان کے شر سے بچائے رکھے [آمین] اور مولا خداوند جماعت کی تمام نیک مُرادوں کو پوری کرے [آمین] اور اپنے مقدّس ظاہری و باطنی دیدار کی دولت سے جملہ جماعت کو نوازے، آمین! یارب العالمین!!

میرے عزیز امین کہتے ہیں کہ جس مقالے میں پانچ حدود کا یا دس موتیوں کا ذکر ہے، اُن میں عزرائیل کا ذکر کیوں نہیں ہے، تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ عزرائیل ایک راز ہے، بعض حدود راز کے طور پر ہیں اور بھید ہیں۔اُن کے ظاہر کرنے سے بہت سے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں یا کہ کسی طرح سے انقلاب آجاتا ہے، اِس وجہ سے اور ویسے تو عزرائیل البتہ نفس کُل کے قریب ہے یا کہ نفس کُل کے ساتھ ہے اور عزرائیل بہت بڑی طاقت ہے، جبرائیل سے، میکائیل سے، اسرافیل سے وہ بڑا ہے۔اگرچہ ظاہر میں حدود میں، گنتی میں نہیں ہے، لیکن کام میں تو وہ ہے اور وحی کے وقت عام لوگوں نے تو یہ سمجھا ہے کہ صرف جبرائیل آتا ہے، میں تو رُوحانی تجربات کی روشنی میں یہ کہتا ہوں کہ وحی کے وقت چاروں فرشتے آتے ہیں۔

جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل، یہ چاروں آتے ہیں۔تو یہ چاروں فرشتے ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔ قیامت ہو تو لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف یہ صور پھونکنا اسرافیل کا کام ہے۔حالانکہ صور پھونکتے وقت بھی چاروں فرشتے ہیں۔لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جان نکالنے کے لیے عزرائیل مقرر ہے، بے شک وہ مقرر تو ہے لیکن جان نکالتے وقت بھی چاروں فرشتے ساتھ آتے ہیں۔تو قرآن میں بھی ایسے اشارے ہیں۔لہٰذا عزرائیل جو ہے وہ بہت بڑا فرشتہ ہے اور اُس کا جو پاور وہ بہت زبردست ہے۔اگر ایک شخص جبرائیل سے دوستی کرے تو بڑی چیز نہیں ہے، میکائیل سے دوستی کرے تو بڑی چیز نہیں ہے، اسرافیل سے دوستی کرے تو بڑی چیز نہیں ہے، اگر کوئی شخص عزرائیل کو سمجھتا ہے تو وہ بہت بڑی چیز ہے۔چنانچہ میں نے کچھ دوستوں پر عزرائیل کی تسبیح کو آزمایا تھا، جتنی کامیابی عزرائیل کی تسبیح سے ہوئی اتنی کامیابی کسی بھی تسبیح سے نہیں ہوئی عزرائیل کی تسبیح اتنی پاور فُل ہے کہ اگر ہم عزرائیل کی تسبیح اِس مجلس میں استعمال کریں تو معلوم نہیں کیا سے کیا ہو جائے گا لیکن یہ بھی یقین کی بات ہے۔بہرحال یہ یقینی بات ہے کہ عزرائیل کی تسبیح سے بہت رُوحانی ترقی ہو سکتی ہے۔یہ بھید انقلابی ہے، بہت بڑا بھید ہے، چونکہ اِن عزیزوں نے عزرائیل کے بارے میں سوال کیا تو میرے دل میں آیا کہ عزرائیل کے بارے میں کوئی بھید بتاؤں، وہ یہ ہے، مجھے کہنا چاہیئے یا نہیں کہنا چاہیئے میں سوچتا ہوں چلو ٹھیک ہے کہنا چاہیئے کہ عزرائیل کی تسبیح اللہ اکبر ہے اور اللہ اکبر میں اتنی طاقت ہے، لیکن میں سوال کرتا ہوں کیا آپ نے زندگی میں کبھی اللہ اکبر کی تسبیح نہیں پڑھی ہے؟ جماعت خانے میں تو آپ بار بار پڑھتے ہیں لیکن اُس میں وہ پاور کیوں نہیں ہے جس کا میں ذکر کرتا ہوں؟ اِس

لئے نہیں ہے کہ کسی تسبیح کے فلسفے کو سمجھے کے بغیر، اُس کی معانی کو سمجھے کے بغیر اُس میں سے پاور پیدا انہیں ہوتا، اُس میں سے انرجی پیدا نہیں ہوتی ۔ میں آپ کو ابھی ابھی اِن چند منٹوں میں اِس کا فلسفہ بتاؤں گا تو اِس میں پاور پیدا ہو جائے گا اور پھر آپ جب بھی اللہ اکبر کی تسبیح پڑھیں گے تو ڈرتے ڈرتے پڑھیں گے اور اسی ڈر کے ساتھ ساتھ کام بن جائے گا۔ وہ ایک بہت بڑا بھید ہے اِس کو عام نہیں کر دینا۔ جتنے عزیز یہاں آئے ہیں اُن کے لئے یہ تحفہ اور باقیوں کے لئے نہیں، کچھ بھی نہیں ۔ تو یہ کہ اللہ اکبر عزرائیل کی وہ تسبیح ہے، وہ اسمِ عظم ہے جس کے ذریعے سے وہ رُوحوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، جان کو نکالتا ہے ۔ عزرائیل جب کہتا ہے اللہ اکبر تو رُوح ایک دم سے اُوپر کو آتی ہے اور آپ چاہیں تو یہ تسبیح پڑھیں لیکن احتیاط رکھنا [کرنا]، جان پوری طرح سے نکل نہ جائے کیوں کہ یہ عزرائیل کو دعوت ہے، آپ اگر دل گردے والے ہیں تو یہ پڑھیں، نہیں تو نہیں پڑھیں لیکن میں آپ کو کہتا ہوں کوئی بات نہیں ہے، آپ پڑھیں لیکن اِس نظریئے سے پڑھیں کہ آپ کی رُوح پیشانی میں Close ہو جائے گی، جیسے ہی آپ اِس کو پڑھیں گے تو میں شرطیہ کہتا ہوں، میں وعدہ کرتا ہوں لیکن اُن سے جو اِس کے فلسفے کو سمجھنے والے ہیں، تو جسم میں ایک دم سے لہر دوڑے گی ۔ پندرہ بیس برس میں بڑے کام میں ایک مومن اتنا نہیں کما سکتا ہے جتنی کمائی اِس تسبیح کے اندر ہے ۔ ایک دم سے آپ کے اندر رُوح کی لہر دوڑے گی اور جو خاموش، جو سوئی ہوئی رُوح تھی اُس میں حرکت پیدا ہو جائے گی اور ایک دم سے رُوح دوڑے گی جسم کے اندر اور آپ دیکھیں گے کہ کرنٹ چلے گا، اور آپ دیکھیں کہ کوئی چیز اُوپر کو آئے گی اور پیشانی میں مرکوز ہو جائے گی، تو پھر آپ آرام آرام سے کچھ دیر تک اِس کو پڑھنا لیکن چار اور پانچ سے پہلے اس کی پریکٹس کرنا اور پھر اُس کے بعد جب ایسی لہر دوڑے گی اور پیشانی میں رُوح مرکوز ہو جائے گی تو پھر آرام آرام سے اپنا بول بولنا اور اس کو چھوڑنا۔

دُوسری بات اِس میں یہ فائدہ ہے کہ آپ کے اندر جو تکلیف ہے وہ رُوح ہے، جو غم ہے وہ بھی رُوح ہے، جو ناراضگی ہے وہ بھی رُوح ہے، جو وسوسہ ہے وہ بھی رُوح ہے ۔ اِن چیزوں کو آپ نکالیں عزرائیل کے وسیلے سے نکالیں، آپ اپنے ہاتھ دیکھیں یہاں سے کوئی چیز چُن چُن کر نہیں نکال سکیں گے، نہ کوئی صفائی کر سکیں گے، یا یہ کہ آپ عزرائیل سے کہیں، عزرائیل سے دوستی کریں اور اللہ اکبر کی تسبیح پڑھیں، اللہ اکبر کا اسمِ اعظم پڑھیں اور کچھ دیر کے بعد آپ کے اندر غم کی رُوح ہے، فکر کی رُوح ہے، تکلیف کی رُوح ہے، مصیبت کی رُوح ہے، غصے کی رُوح ہے، وسوسے کی رُوح ہے یہ سب رُوحیں نکل جائیں گی اور آپ کی اپنی صاف ستھری رُوح جو ہے رہ جائے گی، پھر آپ آرام آرام سے عبادت کرنا۔

سوال: میرے عزیز کا سوال ہے کہ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل پوری دنیا میں یہ چار فرشتے ہیں یا کہ مومنین کی جو ترقّی ہوتی ہے [تو] وہ اِس درجے میں پہنچتے ہیں یا اِس میں کیا بھید ہے؟ ایسا سوال ہے ؟

اچھا اِس کے لئے یہ ہے کہ میں نے کسی مقالے میں جو انڈیا سے آیا تھا، جبرائیل کے سلسلے میں، میں نے یہ حل کیا ہے اُس کے اندر میں نے سوال کا جواب دیا ہے پھر اُس کو دہراتا ہوں، میں نے وہاں پر صرف جبرائیل کے عنوان سے اس مسئلے کو حل کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے اندر چار طاقتیں ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ عقل کی طاقت جبرائیل ہے، فہم کی طاقت میکائیل ہے، بولنے کی طاقت جس کو نطق کہتے ہیں وہ اسرافیل ہے، خیال کی طاقت عزرائیل ہے۔ تو انفرادی طور پر یہ چار طاقتیں ہیں جو چار فرشتے ہیں لیکن اِس میں یہ بات ہے کہ یہ ہماری چار طاقتیں صرف طاقتیں ہیں اور [یہ طاقتیں] مکمل فرشتوں کے طور پر کام کرنے کے لئے دُنیا میں سے چار آدمیوں کے رُوپ کو قبول کرتی ہیں، مثلاً ہماری نظر میں، ہمارے زمانے میں، ہمارے ماحول میں دُور یا نزدیک کوئی ایسا مومن ہو جس کو ہم مذہبی طور پر بہت پسند کرتے ہیں، تو ہماری عقل کی جو قوت ہے اُس کا رُوپ دھارتی ہے اور پھر ہمارا جبرائیل اُس شخص کی شکل میں ہوتا ہے جس کو ہم مذہبی طور پر پسند کرتے ہیں، وہ کوئی استاد ہے یا کوئی عالم ہے یا کوئی پرہیزگار شخص ہے، تو ہمارا جبرائیل بن گیا۔

اسی طرح دُوسرے شخص کو ہمارا فہم قبول کرتا ہے تو وہ ہمارا ایک میکائیل ہے، یہ دو ہو گئے۔ ایک شخص چاہیئے اسرافیل کے لئے وہ کچھ زبردست آدمی چاہیئے۔ ایک اور شخص چاہیئے جو ہمارے لئے عزرائیل کا کام کرے اور اُس میں ہمارا جو خیال ہے وہ مجسم ہو جائے، متشکل ہو جائے یعنی ہمارا خیال اُس شخص کے ذریعے سے، اُس شخص کی شکل وصورت کے ذریعے سے ہم پر یا دُوسرے پر عزرائیل کا کام کرے تو، اس کے لئے بھی ایک شخص چاہیئے تو چار ہو گئے۔ چار میں سے دو تو ایسے ہیں جو مجبتی ہیں، دو دُوسرے جو ہیں وہ ذرا زبردست افراد ہوں۔ معلوم نہیں آپ نے میرے مطلب کو سمجھا، یا نہیں سمجھا میں اُمید رکھتا ہوں کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے، یہ چار فرشتے دراصل ہماری خود کی چار قوتیں ہیں جو انسانوں کی شکل میں ہمارے لئے کام کرتی ہیں۔ مثلاً رسول اللہؐ کی عقلی قوت حضور کے لئے جبرائیل کا کام کرتی تھی لیکن اُس کے لئے ایک شکل کی ضرورت تھی اور وہ شکل سلمان فارسی کی تھی، حضور کی عقل، حضور کی عقلی قوت سلمان فارسی کے روپ میں جبرائیل کا کام کرتی تھی۔ لہٰذا اِس حساب سے فی کس چار چار فرشتے ہیں، جبرائیل وہ نہیں جو آنحضرتؐ پر وحی لاتا تھا، نام، کام، درجہ وہی ہے لیکن شخصیت الگ ہے، تو ازل سے لے کر ابد تک کوئی ایک فرشتہ مقرّر نہیں ہے، درجہ مقرر ہے، کام وہی ہے لیکن شکل وصورت اور شخصیت ہر وقت بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا ہم میں سے ہر ایک کے چار چار فرشتے ہیں۔

جس طرح جانور دو قسم کے ہوتے ہیں کچھ تو حلال ہوتے ہیں، کچھ حرام ہوتے ہیں۔ جو حرام ہوتے ہیں وہ Accepted نہیں ہوتے ہیں، وہ قبول نہیں ہوتے ہیں، بس وہاں پر آ کر اُن کی ترقی رُک جاتی ہے۔ جو حلال جانور ہوتے ہیں وہ اُوپر کو آتے ہیں، وہ انسانوں کے ساتھ متحد ہو جاتے ہیں، انسانوں کے ساتھ اُن کی Unity بن جاتی ہے، انسانوں کے ساتھ وہ حلال جانور ایک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کی بھی دو قسمیں ہیں، کچھ انسان ہیں جو حلال جانوروں

کی طرح Accepted ہو جاتے ہیں، کچھ انسان ہیں جو حرام جانور کی طرح ہیں کہ اُن کو قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ تو جو انسان حلال جانوروں کی طرح ہیں اور وہ مُرید ہیں عام Level پر، عام سطح پر، اُن کو حدودِ دین پیر، حجّت، داعی وغیرہ جو فرشتے ہیں اُن کو Accept کرتے ہیں، تو مومن جو ہے یا تو خود فرشتہ بن جاتا ہے یا دوسرے فرشتے میں Dissolve ہو جاتا ہے۔ ہم فرض کریں کہ خود بھی فرشتے بن سکتے ہیں اور دُوسرے فرشتوں میں بھی ہم Dissolve ہو سکتے ہیں، فنا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اگر یہ مانا جائے کہ اِس زمانے میں بھی اچھے کام کرنے والے ہیں اور پیروں کی طرح، داعیوں کی طرح کام کرنے والے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ امامؑ میں فنا ہو جانے سے پیشتر ہم اُن فرشتوں میں فنا ہو جائیں اور اُن فرشتوں میں فنا ہو جانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم اپنی اِس ہستی کو مٹائیں اور اُن کے ساتھ مادّی طور پر، ظاہری طور پر ایک ہو جائیں، اِس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنی جگہ پر رہتے ہوئے اُن کی خاصیت کو، اُن کی عادت کو اپنا سکتے ہیں، اُن کے علم کو قبول کر سکتے ہیں اور اِسی طرح سے ہم اپنی جگہ پر ہی اُن میں فنا ہو سکتے ہیں اور اگر ایک شخص امامؑ میں فنا ہو جاتا ہے تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ یہاں سے جا کر ظاہری طور پر امامؑ کے ساتھ جسمانی طور پر ایک ہو جاتا ہے ایسا نہیں ہوتا ہے، وہ اپنی جگہ پر ہے، پر وہ امامؑ کے امر و فرمان کو قبول کرتا ہے اور اُس کی محبت کو، اُس کے علم کو، اُس کی ہدایت کو اپناتا ہے، تو تب امام میں فنا ہو سکتا ہے۔

جس طرح قانونِ قدرت میں آپ دیکھتے ہیں کہ پہلے بے جان چیزیں ہیں، مٹی ہے پھر اُس کے اُوپر نباتات، اُگنے والی چیزیں ہیں، پھر اِس کے اُوپر جانور ہیں، پھر اِس کے اُوپر انسان ہیں، پھر اِس کے اوپر فرشتے ہیں یہ پانچ Stages ہیں لیکن بعض مثالیں ایسی بھی ہیں کہ حیوان کو چھوڑ کر گھاس انسان میں داخل ہو جائے اور نباتات اور حیوانات کو چھوڑ کر نمک اور دیگر چیزیں جو جمادات ہیں انسان تک پہنچ جائیں، تو اس طرح یہ بہت ممکن ہے کہ وہ ایک Step کا کام دے کہ پیغمبر انسان کا ہم جنس ہے، ہم شکل ہے وہ انسان جیسا ہے تا کہ اپنی بشریت کے وسیلے سے پیغمبر مومنین کو فرشتوں کی شکل و صورت میں تبدیل کرے اور اگر پیغمبر اور امامؑ کے اِس Stage سے نیچے بھی آسانی کے لئے ایک Stage ہو تو اِس میں کیا انکار ہے، جیسا کہ پیروں کے زمانے میں تھا کہ پیروں کا جو Stage تھا وہ اماموں سے نیچے تھا اور اِس میں آسانی ہوتی ہے، مثلاً اگر اُونچے اُونچے زینے ہوں، تو جس کی ٹانگیں چھوٹی چھوٹی ہیں تو اُونچے زینے کو نہیں پہنچتا ہے، اگر زینے چھوٹے چھوٹے ہوں، قریب قریب ہوں تو آدمی آرام آرام سے بلندی کو، اُوپر کو چڑھ سکتا ہے۔ اِس کی مثال یہ ہے کہ امام ہمارے درمیان بیٹھ کر چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں کر سکتا ہے اور امامؑ کی باتیں سمجھنا ایسا ہے جیسا کہ ایک Step سے ایک اُونچے Step پر چڑھنا۔ کتنے فرامین ایسے ہیں میں آپ کو ثبوت پیش کروں گا اُن فرامین کو جماعت نہیں سمجھتی ہے، اُس کے اندر جو مفہوم ہیں، اُس کے اندر جو حکمت ہے، اُس کے اندر جو بھید ہے اُن کو پتہ نہیں چلتا، کچھ فرامین

سادہ بھی ہیں لیکن کچھ فرامین ہیں جو بہت مشکل ہیں، اُن کے اندر راز ہیں، اُن کے اندر بھید ہے، اُن کو جماعت نہیں سمجھتی ہے، مومنین نہیں سمجھتے ہیں۔

اگر چہ امام نے فرمایا ہے کہ میں باپ بھی ہوں اور ماں بھی ہوں، یہ صحیح ہے ایک لحاظ سے لیکن امام باپ ہے اور کوئی بھی استاد ماں ہے، میں نہیں کوئی بھی ماں ہے اور دیکھا آپ نے کہ بچہ جب چھوٹا ہوتا ہے تو زیادہ پرورش ماں کرتی ہے، باپ پرورش نہیں کرتا ہے، باپ وسائل کو مہیّا کرتا ہے لیکن ماں ہی ہے جو کہ بچے کی پرورش کرتی ہے، بہت محنت سے، کتنے مہینے تک وہ اپنے اندر لئے پھرتی ہے اور کتنے برس تک وہ گود میں لیتی ہے اور اُس کو دودھ پلاتی ہے اور جن غذاؤں کو وہ بچہ نہیں کھا سکتا ہے اُن غذاؤں کو ماں کھا لیتی، کھانے کے بعد اُن سخت غذاؤں کو Dissolve کر کے اُن میں سے دودھ بنا لیتی ہے، پھر وہ دودھ ایک ایسی غذا ہے کہ وہ آسانی سے بچہ ہضم کر سکتا ہے۔ اِسی طرح دین کی اونچی اور سخت دشوار باتوں کو استاد ہی Dissolve کر کے دودھ کی طرح اُن کو آسان بنا لیتا ہے اور سمجھاتا ہے، نہیں تو ایک چھوٹے سے بچے کو سخت غذائیں نہ ہی موافق آسکتی ہیں اور نہ اُن کو وہ ہضم کر سکتا ہے، نہ وہ چبا سکتا ہے اور نہ کھا سکتا ہے کیونکہ چبانے کے لئے اُس کے دانت نہیں ہیں، کیونکہ اُس کے اندر ہضم [کرنے] کی قوت نہیں ہے۔ اِس طرح مُریدوں کے سامنے قرآن، حکمت اور دین کی باتیں رکھیں تو وہ نہ تو اِن باتوں کو کھا سکتے ہیں [یعنی] اُس غذا کو اور نہ تو ہضم کر سکتے ہیں، لہٰذا استاد کی ضرورت ہے اور رُوحانی طور پر جو ترقّی رُکی رہتی ہے اُس کی وجہ بھی استاد کے نہ ہونے سے [ہے]، استاد کے نہ ہونے سے ترقّی رُکی ہوئی ہوتی ہے، اُس کے لئے یا تو اِس احساس سے مطالعہ کرنا چاہئے اور ایک دُوسرے سے رُجوع کرنا چاہئے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ اگر امامؑ کے فرامین سے کام چلتا ہوتا تو کروڑوں حکومت کے Surface سے اتنے سارے ادارے نہیں بنتے، اتنے سارے اداروں کا وُجود اِس بات کا ثبوت ہے کہ دین کو سمجھانے کے لئے استادوں کی ضرورت ہے۔ استاد سے میری مراد کوئی ایک فرد نہیں ہے، بحیثیتِ مجموعی علم کے کام کرنے والے سب ہی استاد ہیں وہ ماؤں کی طرح ہیں۔

سوال: سر آپ نے ابھی کہا کہ امام کہتے ہیں کہ میں آپ کی ماں اور باپ ہوں لیکن امام باپ ہیں اور علم کی جو باتیں وغیرہ ہیں وہ امام نہیں بتاتا ہے لیکن وہ باتیں استاد بتاتا ہے لیکن سر! آپ امام سلطان محمد شاہ کے فرمان دیکھیں تو انھوں نے بالکل چھوٹی چھوٹی باتیں چن چن کر بتائی ہیں جس طرح استاد بتاتا ہے تو اس کے بارے میں سر آپ کیا خلاصہ کریں گے۔

جواب: میں نے کہا نا کہ امام کے فرامین میں کچھ سمجھ بھی آسکتے ہیں لیکن بہت سی مثالیں [ہیں] جو اصل مطلب نہ سمجھنے کے

ہیں ۔مثلاً ''اسلام میرے مورثوں کا مذہب'' اُس کے اندر امام نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اتنی گہری باتیں ہیں، اُس کی وضاحت کی ضرورت ہے ۔اُس کے اندر بہت ساری باتیں بتائی گئی ہیں لیکن ابھی تک اُس کو کسی نے نہیں سمجھا اور خود امام سلطان محمد شاہ کیا تھے، ابھی تک جماعتوں نے نہیں سمجھا ہے یعنی وہ کس حیثیت کے امام تھے، کس درجے کے امام تھے اور اُن کے بارے میں قرآن میں، کتاب میں کیا پیش گوئی کی گئی تھی اور ان کا زمانہ کیا ہے، اور انھوں نے کیا کام کیا، کتنا کام کیا؟ کیسا کام کیا؟ اس پر میرے خیال میں کیسیٹ میں ہے یا زبانی طور پر ہے ۔شاید وہ لیکچرز بھی ہوں فقیر محمد صاحب نے لکھا ہوگا، میں نے لیکچر دیا تھا، اس پر کچھ فقیر محمد صاحب کو محسوس ہوا کہ اِس پر کوئی کتاب لکھنی چاہئے امام سلطان محمد شاہ کی رُوحانی حیثیت پر، تو بات یہ ہے جہاں امام فرماتے ہیں کہ'' جب میں منہ کھولتا ہوں تو جواہرات کے ڈھیر لگ جاتے ہیں ۔'' (راجکوٹ ۔۲۱۔۱۰۔۱۹۰۳) اِس کے معنی صرف یہ لیا امامؑ کے فرامین جواہرات جیسے ہیں، جب بھی امام فرامین فرماتے ہیں تو رُوحانی قسم کے جواہرات کا ڈھیر لگ جاتا ہے، اتنا مطلب سمجھ لیا لیکن اِس کے اندر کچھ اور مطلب ہے جس کو جماعتوں نے اور کچھ لوگوں نے نہیں سمجھا۔

(تھوڑی اِس کی وضاحت ہوگی سر!) ۔وہ یہ کہ ایک رُوحانی درجے کی طرف اشارہ ہے اور ایک ایسے درجے کی طرف اشارہ ہے جہاں پر امامؑ اپنے منہ میں سے ایک موتی کو نکال کے ایک مثال پیش کرتے ہیں اور وہ اتنی زبردست مثال ہے کہ اُس میں تمام دین کی باتیں سموئی ہوئی ہیں اور دین کے سارے بھید اُس میں ہیں اور وہ گوہر عقل کا ایک نمونہ [یا] Demonstration پیش کرتے ہیں ۔یہ اُس کی طرف اشارہ ہے ۔

امامؑ نے [جو فرمان] فرمایا ہے جو ہر روز جماعت خانے میں پڑھتے ہیں ،کہ'' وہ اپنی رُوح کے عاشق تھے'' ۔(دارالسّلام ۔۲۹۔۹۔۱۸۹۹) اُس پر کسی نے غور نہیں کیا، ابھی تک کسی نے نہیں سوچا کہ اُس کے اندر کیا فلسفہ ہے، وہ اپنی رُوح کے عاشق تھے، بات صاف ہے دیکھنے میں، زبان میں کوئی اُلجھن نہیں ہے، اُردو ہے، گجراتی میں بھی یہ فرمان ہو سکتا ہے لیکن اِس کے اندر جو بھید ہے وہ اتنا زبردست بھید ہے کہ جس کا سمجھنا انتہائی ضروری ہے ۔

میں سوال کرتا ہوں کہ خدا کو چھوڑ کے وہ ہمارے پیر، بزرگ اپنی رُوح کے کیوں عاشق تھے؟ حالانکہ ظاہر میں دیکھا جائے تو یہ بہت بڑے عیب کی بات ہے کہ میں اپنے آپ کا عاشق ہوں اور خود پرست ہوں اور خود بین ہوں یہ بہت بُری بات ہے ۔امام فرماتے ہیں وہ اپنی رُوح کے عاشق تھے، خدا کے عاشق کیوں نہیں تھے کہ وہ اپنی رُوح کے عاشق تھے، میں یہ سوال کرتا ہوں اور دُوسرا وہ فرمان کہ امام نے فرمایا جو لوگ کہتے ہیں کہ ''میں نے امام کو خواب میں دیکھا، وہ جھوٹ بولتے ہیں، میں کسی کے خواب میں نہیں آتا ہوں'' (راجکوٹ ۔۲۰۔۲۔۱۹۱۰) اور حالانکہ اِس میں بھی معنی ہیں ۔ اِن دونوں باتوں کا مطلب میں آپ کو بتاؤں، جہاں پر امامؑ نے فرمایا ہے کہ وہ اپنی رُوح کے عاشق تھے اِس سے مُراد یہ

ہے کہ مومن کی اپنی رُوح وہ طاقت رکھتی ہے جو خدا کا روپ دھار کر، خدا کا دیدار ہم کو دے سکتی ہے، یہ بہت بڑا بھید ہے۔ یہ بھی خدا کی سب سے بڑی خوبی ہے بلکہ یہ اُس سے زیادہ بڑی خوبی ہے، بجائے اِس کے خدا آوے، خدا ہماری رُوح کو وہ نمائندگی عطا کرے اور اُس میں یہ توانائی دے، یہ صلاحیت عطا کرے کہ رُوح خود جب وقت آئے، جب شرطیں پوری ہو جائیں تو خدا کے رُوپ کو دھار کر کہے کہ میں خدا ہوں۔

اگر خدا کی قدرت میں یہ ممکن ہے کہ وہ قطرے کے اندر سمندر کو سمو سکتا ہے تو کیا ضرورت ہے کہ Demonstration کے لئے سمندر آوے اور قطرے کو ہٹائے تو یہ ممکن ہے، تو خدا کو یوں کرنا چاہئے کہ اُس قطرے کو سمندر بن کر مظاہرہ کرنے کی قوت عطا کرے، یہ بہت بڑی خوبی ہے، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا آوے اور ہم کو دیدار دکھائے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اِس سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا ہماری اِس عاجز رُوح کو وہ توانائی عطا کرے، اتنی نوازش کرے کہ یہ اپنے وقت پر خدا کا روپ دھارے، اور خدا بن کر ہم کو خدا کا دیدار دے اور امامؑ نے یہی کہا ہے کہ وہ اپنی رُوح کے عاشق تھے۔ رُوح میں خدا ہے کیونکہ وہ [روح] خدا سے ہے اور رُوح میں یہ قدرت ہے کہ وہ خدا کی قدرتوں کا نمونہ ہے، خدا کی ساری توانائی یعنی سب قدرت جو کچھ کہ اُس سے ہوسکتا ہے، وہ سب کچھ اُس رُوح میں ہے تو یہ بھی اس سے ہوسکتا ہے، اور دوسری بات جو امامؑ نے فرمایا کہ جو کہتا ہے کہ میں نے امام کو خواب میں دیکھا تو میں کسی کے خواب میں نہیں آتا ہوں اس کا مطلب بھی یہ ہی ہے۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی آدمی امام کو خواب میں نہیں دیکھتا ہے، دیکھتا ہے! لیکن اُس کی رُوح ہی یہ کام کرتی ہے، رُوح ہی یہ کام کرتی ہے کہ امام کا رُوپ دھارتی ہے اور دیدار دیتی ہے۔ اِس معنی میں امامؑ نے فرمایا کہ میں کسی کے خواب میں نہیں آتا ہوں۔

آپ جب اونچے Level پر جائیں گے تو حقیقت ایک لفظ سے Cover نہیں ہوگی، دو لفظوں سے Cover ہو گی۔ مطلب اِس کا یہ ہے کہ خدا نہیں آتا ہے اور آتا بھی ہے۔ یہ Positively, Negatively دونوں طرح سے اِس کی ترجمانی، اس کی Interpretation ہو جائے گی۔ لہٰذا خدا ہمارے خواب میں آتا ہے اور خدا ہمارے خواب میں نہیں آتا ہے۔ جب ہم دونوں الفاظ کو استعمال کریں گے تو تب حقیقت Cover ہو جائے گی یعنی ایک اعتبار سے وہ نہیں آتا ہے اور دُوسرے اعتبار سے آتا ہے۔ تو ذاتی طور پر نہیں آتا ہے اور ہماری رُوح [میں] جو قوت ہے کہ وہ خدا کے رُوپ کو دھارے، اِس معنی میں وہ آتا ہے۔ تو آپ سب سے اعلیٰ درجے میں جب جائیں گے تو آپ کو تعلیم اِس طرح سے دی جائے گی، دو دو Aspects ہوں گے، دو دو پہلو ہوں گے۔

انہوں نے سوال یہ کیا کہ اگر پیر ماں ہیں اور امامؑ باپ ہیں تو اِس کی مثال اگر دنیوی طور پر لیں تو لگتا یوں ہے کہ ماں کا درجہ بڑا ہے اور باپ کا درجہ چھوٹا ہے، اِس لئے کہ ماں بہت خدمت کرتی ہے، بہت پرورش کرتی ہے۔ تو اِس کے

لئے میں نے یہ گزارش کی کہ یہ بات نہیں ہے، باپ کا درجہ ہر حالت میں بڑا ہے اور ماں کا درجہ ہر حالت میں چھوٹا ہے چونکہ اسلام نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ کُلی طور پر As a Whole مرد کا درجہ بڑا ہے اور عورت کا درجہ چھوٹا ہے، چاہے وہ مرد شوہر ہو یا باپ ہو یا کسی بھی حیثیت میں ہو، لیکن جہاں اولاد کی پرورش کے سلسلے میں ماں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اُس کی وجہ ماں کی رضا حاصل کرنا ہے اور ماں کے حق کو ادا کرنا ہے، تو اُس میں حق کی طرف یعنی جو حقوق ہیں، اُس کی ادائیگی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، نہ کہ باپ پر ماں کی فضیلت ہے، تو اِس لئے یہ بات ہے۔ اہمیت اور حق کی بات الگ ہے فضیلت کی بات الگ ہے۔

میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ ایک اہم بات بتاؤں لیکن وہ بات رُک گئی تھی لیکن اب چائے پی لی گئی تو میں وہ بات آپ کو بتاتا ہوں اور وہ اہم بات یہ ہے کہ آپ اگر فرمان کی روشنی میں کوئی بات کہنا چاہتے ہیں تو اِس میں ہونا یہ چاہئے کہ آپ امامؑ کے بہت سے فرامین سے باخبر ہو جائیں تا کہ یہ دیکھا جائے کہ جو خاص فرمان آپ کے ذہن میں ہے اور جس کے بارے میں آپ وضاحت کرنا چاہتے ہیں، اُس کے بارے میں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اُس کے برابر میں کوئی دُوسرا فرمان ایسا نہ ہو کہ اُس فرمان کا فیصلہ دوسری طرح سے ہو۔ کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ امام مختلف مواقع پر مختلف قسم کے فرامین فرماتے ہیں اور خلاصہ اُس وقت ملتا ہے جب کہ آپ As a Whole سب فرامین کو پیشِ نظر رکھیں، تب آپ صحیح مطلب سمجھ سکتے ہیں کیوں کہ امامؑ کے مختلف فرامین اِس لئے ہوتے ہیں کہ اِس دنیا کے اندر جو امامؑ کے مُرید ہیں، یا جتنے ممالک میں یا جتنے علاقوں میں اسماعیلی پائے جاتے ہیں اُن کے حالات قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ تو امامؑ اُن حالات کے پیشِ نظر یا کہ ان افراد کے مطابق فرامین فرمایا کرتے ہیں۔ لہٰذا امام کے فرامین کے اندر کچھ اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ بات قرآن کے اندر بھی ہے، کسی بھی ایک آیت سے مفہوم اور مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا ہے، جب [تک] کہ اُس موضوع سے متعلّق دُوسری آیتوں کو بھی نہ لیں، تو تب Subject مکمل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح فرمان کے بارے میں بھی یہ بات ذہن میں ہونی چاہئے اور یہ بات میں نے اِس لئے کی کہ میں نے بہت سے عزیزوں کو دیکھا ہے یا بہت سے اسماعیلی افراد کو دیکھا ہے کہ وہ کسی ایک ہی فرمان کو لیتے ہیں اور اُس موضوع سے متعلّق جو دُوسرا فرمان ہے اُس کو بھول جاتے ہیں تو بعض دفعہ اُن کے سمجھنے میں ذرا فرق آتا ہے۔ میں تو اِس بات کو زیادہ پسند کرتا ہوں کہ بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے، کسی بھی موضوع پر جتنے فرامین فرمائے گئے ہیں اُن تمام فرامین کو اگر ہو سکے پیشِ نظر رکھا جائے اور پھر اُس کے بعد رائے ظاہر کی جائے یا کہ مطلب سمجھا دیا جائے کہ امامؑ یہ چاہتے ہیں۔ آپ کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے، یہ بات میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں۔

ایک اور دُوسری بات میرے ذہن میں ہے، جو میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کی معلومات میں اضافے کے لئے بیان کروں، وہ یہ کہ آپ کو کسی بھی قانون کے سلسلے میں یہ سمجھنا چاہئے کہ قانون میں سے کچھ تو General اصولات ہوتے

ہیں، کچھ مستثنیات ہوتے ہیں یا کہ Exceptional Cases ہوتے ہیں۔آپ جس طرح General اصولات کو، General Principles کو قانون کے مجموعے کے طور پر سامنے رکھتے ہیں، اُسی طرح آپ Exceptional Cases کو نہ بھولیں ،اگر آپ [اُن] کو بھول جاتے ہیں تو پھر آپ کے قانون کو سمجھنے میں فرق آئے گا۔ یہ بہت ہی ضروری ہے چنانچہ اِس دفعہ امام شناسی کے سلسلے میں کیا ہوگیا،، جب امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے امامت اپنے پوتے کو دے دی تو جن لوگوں کو یہ خیال تھا کہ وہ دین کے اصول کو جانتے ہیں، امامت کے اصولات کو جانتے ہیں اور وہ اُن کے نزدیک یہ ہے کہ امامت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی ہے۔وہ Principle یا کہ General Law کے طور سے غلط نہیں ہے، صحیح ہے لیکن انھوں نے Exceptional Cases کو بھلا دیا اور جس کی وجہ سے کچھ افراد ایسے ہوئے کہ وہ شاہ کریم الحسینی حاضر امام کی امامت سے انکار کرنے لگے۔ دیکھا آپ نے اگر چہ اُن کا یہ کہنا صحیح بھی تھا کہ امامت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہتی ہے لیکن مستثنیات جو ہیں Exceptional Cases جو ہیں اُن کو انہوں نے فراموش کر دیا، جس کی وجہ سے ان کو غلطی ہوگئی۔لہٰذا کسی بھی قانون میں خصوصی حالات کو یا کہ جن کو مستثنیات کہنا چاہئے اُن کو نہیں بھولنا چاہئے اور فرامین میں بھی کسی بات میں ایک شخص کہتا ہے کہ اصول یہ ہے تو ٹھیک ہے اصول ہے لیکن اُس کے علاوہ Exceptional Cases بھی ہیں۔اُصول دُرست ہے لیکن عام اُصول کے علاوہ کچھ خاص باتیں بھی ہوا کرتی ہیں۔تو اُس موضوع کے بارے میں کوئی خاص بات ہے یا نہیں ہے یہ دیکھنا ہے، اگر نہیں ہے تو وہ بات عام اُصول کے مطابق ہوگی، یہ درست ہے۔میں یہ دُوسری بات بتلانا چاہتا تھا جو میرے نزدیک ضروری تھی تو اُصولات کو، قوانین کو جاننا بہت ہی مفید ہے اور یہ بہت اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ہے کہ آپ کو کوئی اُصولات بتاتا ہے۔

ایک اور چیز بتاؤں میں آپ کو، ہمارا دین قصّے کہانی پر قائم نہیں ہے۔آپ مذہب میں یہ جذبہ پیدا کریں، یہ شعور پیدا کریں کہ ہمیں عقل و دانش کی باتیں بتادی جائیں، فلسفے کی باتیں بتادی جائیں، تاویلات کی باتیں بتادی جائیں، علمُ الیقین کی باتیں بتادی جائیں۔اتفاق سے ضمناً درمیان میں کوئی کوئی قصّہ، کوئی کہانی ہو تو عیب نہیں ہے لیکن ہمارے استاد لوگ ہمیشہ ہم کو قصّہ کہانی بتاتے رہیں تو اِس سے ہم کو اطمینان نہیں ہوسکتا ہے۔یہ میں نے کیوں کہا؟ اِس لئے کہا کہ ہمیں جاننا چاہئے کہ کس چیز کی ضرورت ہے؟ ہمیں عقل و دانش کی ضرورت ہے، ہمیں فلسفے کی ضرورت ہے، ہمیں تاویلات کی ضرورت ہے، ہمیں ایسی دلیلوں کی ضرورت ہے جو ہمارے لئے کام آئیں۔یہ تیسری اہم بات ہے۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: سیما عظیم علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ رحمان (۵۵) کی چند تاویلات، رُوحانی علم کی اہمیت

کیسٹ نمبر: ۱۳ تاریخ: مئی۔ ۱۹۷۸ء کراچی

Click here for Audio

ایسا ہے کہ اِس [سورۂ رحمان کی تاویلات] پر مقالہ لکھا گیا ہے اور سورۂ رحمان کی حکمتیں لکھی گئی ہیں اُس میں اِس کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ سوال بھی تقریباً ہمارے حلقے سے پیدا ہوا ہے، کچھ عزیزوں نے یہ جان کر سوال کیا ہے، یہ جاننے کے بعد کہ اِس کا جواب کیا ہونا چاہیئے، وہ یہ کہ: الرَّحۡمٰنُ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ (۵۵: ۱۔ ۲)۔ اِس سے مُراد ایک رُوح کو عملی طور پر قرآن کے درجے تک پہنچانے کا ذکر ہے، وہ عقلِ کُلّ ہے کیونکہ قرآن کا آغاز بھی وہیں سے ہوتا ہے کہ خدا نے قرآن سکھایا تو کس کو سکھایا، کس ہستی کو سکھایا، تو سب سے بڑے پیمانے پر خدا نے قرآن عقلِ کُلّ کو سکھایا، چونکہ وہ عقلِ کُلّ ہے اور وہ ایک عظیم فرشتہ ہے اور وہ قلمِ الٰہی ہے اور وہ خدا کا عرش بھی ہے۔ اگر ایک انسان [کے متعلق] یہ بات ہوتی تو اُس کا مطلب ہم یہ لیتے کہ چلو تھوڑا سا پارہ پڑھایا قرآن کی عبارت پڑھائی یا عربی زبان کے لحاظ سے صَرف و نحو کے لحاظ سے کچھ قرآن پڑھایا، ہم اِس کے یہ معنی لیتے اور جہاں خدا خود ہی معلم ہے اور کسی ہستی کو قرآن سکھانے کا ذکر فرمارہا ہے، تو ہمیں اِس تعلیم کو خدا کی تعلیم کے طور پر سمجھنا چاہیئے یعنی یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہاں تو سکھانے کی انتہا ہوگئی، حد ہوگئی کہ اور کچھ سکھانا باقی نہیں رہا، خدا اگر کسی کو کچھ سکھائے تو پھر اُس میں سکھانے کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی ہے یعنی انتہائی اعلیٰ درجے پر سکھایا اِس کا مقصد یہ ہوتا ہے۔

کوئی بھی چیز خدا سے منسوب ہوتی ہے وہ عظیم قرار پاتی ہے، دنیوی مثال میں آپ سوچیں کہا جاتا ہے کہ رستہ اور پھر کہا جاتا ہے کہ شاہراہ یا یوں کہنا چاہیئے کہ راہ اور شاہراہ۔ پہلے لفظ میں راہ Single ہے، یہ معلوم نہیں کہ راستہ بڑا ہے چھوٹا ہے پتہ نہیں اور دُوسرے لفظ میں کہا گیا کہ شاہراہ، جب اُس راہ کے ساتھ شاہ کا اضافہ کیا گیا تو وہ بہت بڑی شاہی سڑک بن گئی، یہ تو انسانوں کی مثال ہے۔ اب فرض کریں کتاب اِس میں معمولی معنی ہیں، خاص معنی نہیں ہیں اور اس کے مقابلے میں کہا جائے کتابِ الٰہی، خدا کی کتاب، تو سمجھنے والے نے سمجھ لیا کہ وہ کتاب دنیوی کتاب نہیں ہے اور کامل کتاب ہے، مکمل ہے، اُس میں سب کچھ ہے اور وہ کتاب جو ہے وہ خدا کی کتاب ہے اور خدا کی کتاب جیسی ہونی چاہیئے ایسی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کہتا ہے کہ ایک انسان نے کسی انسان کو کچھ سکھایا تو یہ انسانی Level کی بات ہوگئی۔ اب جب اِس کے مقابلے میں کہا

جاتا ہے کہ خدا نے قرآن سکھایا، تو اِس میں جاننے والا جان گیا کہ خدا نے تو کوئی کسر باقی نہیں رکھی اور سب سکھایا اور Automatic سکھایا اور ایک اشارے سے سکھایا اور دنیوی تعلیم کے طور پر نہیں بلکہ عطائی طور پر سب کچھ اُس کو دے دیا اور اُس کو عملاً قرآن بنایا، اگر خدا کہتا ہے کہ کسی ہستی کو اُس نے قرآن سکھایا تو اُس کو قرآنِ مجسم بنایا مکمل طور سے اُس کو قرآن بنایا تو یہ عقلِ کُلّ کی طرف اشارہ ہے۔

اب اِس کے بعد یہ کہتا ہے کہ: خَلَقَ الْإِنسَانَ (۵۵:۳) اب اِس بڑے درجے کے بعد جو دُوسرا درجہ ہے اُس کا ذکر ہے، یہ نفسِ کُلّ کی بات ہے کہ اُس نے نفسِ کُلّ کو پیدا کیا، یہاں پر دُوسرے درجے کا ذکر ہے، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵:۴) تو اُس کو بیان سکھایا، علمِ تاویل سکھائی یعنی ایک درجے کو عملاً قرآن بنایا اور قرآن کا ظاہر اور باطن اُس کو سمجھایا تو اور کوئی چیز باقی نہیں رہی، صرف تاویل باقی رہی اور جس طرح کہ عالمِ جسمانی میں آنحضرتؐ پر قرآن نازل ہوا اور اُس کے وصی پر اُس کی تاویل نازل ہوئی، پہلے ظاہر اور پھر باطن، اِس طرح ازل میں قرآن مکمل ہوا اور وہ عقلِ کُلّ کی صورت میں تھا اور اُس کے بعد اُس کی حکمتیں نازل کی گئیں یا یوں کہنا چاہیئے کہ پہلے خدا نے قلم کو پیدا کیا پھر اُس کے بعد لوح کو پیدا کیا: خَلَقَ الا نسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵:۳۔۴) سے مُراد ہے کہ خدا نے قلم کی تخلیق کی اور اُس کو قرآن کی حیثیت دینے کے بعد اور اُس کو تمام علوم کا سرچشمہ قرار دینے کے بعد لوحِ محفوظ کو پیدا کیا اور اُس کو علمِ تاویل سکھایا۔ کیونکہ حقیقی انسان، معنوی انسان نفسِ کُلّ ہے کیونکہ وہ رُوحوں کا سمندر ہے یعنی ہماری رُوح کا سرچشمہ نفسِ کُلّ ہے اور وہ عظیم فرشتہ ہے اور جو عقلِ کُلّ ہے وہ ہماری عقلوں کا سرچشمہ ہے، بہرحال اِس کی تاویل یہ ہے۔

سوال: کیا عقلِ کُلّ سے مراد ہم علیؑ و نبیؐ کا نور لے سکتے ہیں؟

جواب: یقیناً یقیناً، چونکہ امامؑ کے بہت سے درجات ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ امام نبی سے آگے ہیں اور نبی سے پیچھے [بھی] ہیں اور درمیان میں بھی ہیں اور مختلف مراتب پر امام نظر آتے ہیں، لہٰذا عقلِ کُلّ سے پیغمبر کا نور مُراد ہے، نفسِ کُلّ سے امام کا نور مراد ہے، گو کہ نور ایک ہے لیکن اُس کے ظہورات بہت سے ہیں اور جہاں پر Unity ہے وہاں پر علیؑ اور محمدؐ ایک ہیں۔ جہاں پر ظہورات ہیں وہاں پر الگ الگ ہیں، اِس لئے قلم نورِ محمدیؐ، لوح نورِ علیؑ ہے مولا علیؑ نے خطبۃ البیان میں یہ فرمایا کہ: ''انا اللّوحُ المحفوظ، میں لوحِ محفوظ ہوں'' (کوکبِ دُرّی، بابِ سوم، منقبت ۸)۔ نہیں فرمایا کہ میں قلم ہوں اور اُس کے لئے بھی گنجائش ہے کہ وہ چاہیں [تو] یہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اُس [علیؑ] نے فرمایا کہ ''میں لوحِ محفوظ ہوں'' اور علیؑ لوحِ محفوظ ہے۔ جو کہتے ہیں کہ قرآن لوحِ محفوظ سے دُنیا میں نازل ہوا تو یہ علیؑ کے نور سے نازل ہوا، علیؑ کے نور سے، علیؑ کی رُوح سے قرآن محمدؐ پر نازل ہوا۔ اِس کے لئے تھوڑی سی مزید وضاحت کی ضرورت ہے، نہیں تو پھر یہ بات ادھوری [رہ] جائے گی، وہ یہ ہے کہ بے شک قلم لکھتا ہے، لوح تختی اُس کو سنبھالتی ہے، اگرچہ نورِ محمدیؐ نے قرآن نورِ علیؑ میں لکھا تھا لیکن

محمدؐ کی شخصیت پر قرآن کہاں سے نازل ہوا؟ اُس کو اپنے نور سے نازل نہیں ہوا، علیؑ کی روح سے نازل ہوا۔ اِس میں کوئی سوال پیدا ہوسکتا ہے یہ بات ایسی ہے، کہ اگر عقلِ کُلّ، نفسِ کُلّ، ناطق، اساس ترتیب دیکھیں کسی چیز کے اُترنے کے لئے عقلِ کُلّ سے نفسِ کُلّ، نفسِ کُلّ سے ناطق، ناطق سے اساس، قرآن ازل میں نورِ محمدیؐ میں تھا، پھر لوحِ محفوظ پر نازل ہوا، لوحِ محفوظ سے جو علیؑ کا نور تھا یا کہ علیؑ کی رُوح تھی پھر محمدؐ کی شخصیت پر قرآن نازل ہوا، پھر محمدؐ کی شخصیت سے قرآن اساس میں منتقل ہوگیا اور اب اساس میں ہے، امام میں۔

آپ کو ایک اور Shock ہوگا کہ یعنی محمدؐ کے نور میں قرآن تھا تو اُس سے پہلے کہاں تھا تو یہ اُس سے پہلے امرِ کُن میں تھا جو لفظ ''ہو جا'' حکم ہے اُس میں تھا، لیکن آپ کو تعجب ہوگا کہ پھر اُس محمدؐ کے نور سے پہلے کا جو درجہ ہے وہ امر ہے اور امر کا مالک خدا نہیں ہے، پیغمبر نہیں ہے امامؑ ہے، وہ صاحبِ کاف ونون ہے۔ ابھی آپ کا ارمان پورا ہوگیا کہ امامؑ کے امر میں قرآن تھا، محمدؐ کے نور میں آیا، پھر علیؑ کی رُوح میں قرآن آیا، پھر محمدؐ کی شخصیت پر قرآن نازل ہوا، پھر علیؑ کی شخصیت میں قرآن منتقل ہوگیا۔ پیغمبر کے نور سے آگے بھی کوئی ہستی ہے، وہ خدا ہے اور خدا امامؑ ہے، اِس لئے کہ ظاہر میں بھی میں نے کہا نا! کہ امام کے مختلف درجات ہیں، کسی درجہ میں امام پیغمبر کے نیچے بھی ہے، کسی درجہ میں امام پیغمبر کے آگے بھی ہے، یہ زبانی بات نہیں ہے، کتابی بات ہے، امامِ مقیم اسماعیلی مذہب میں ایک اصطلاح ہے، وہ امام جو کسی پیغمبر کو قائم کرتا ہے، کسی بڑے پیغمبر کو آدمؑ، نوحؑ، ابراھیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمدؐ جیسے کسی بڑے پیغمبر کو قائم کرتا ہے، برپا کرتا ہے تو امامِ مقیم ہوتا ہے، خدا اور آدم کے درمیان قرآن میں جو باتیں ہیں وہ امام اور آدم کے درمیان کی باتیں ہیں۔

سوال: رسول نے فرمایا تھا کہ ''أَنَا وَ عَلِيٌّ مِنْ نُورٍ وَاحِدٍ'' اس کی تشریح کیا ہے؟

جواب: آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ یہ باتیں اِس طرح سے ہیں کہ درخت سے پھل پیدا ہوتا ہے اور پھل سے درخت پیدا ہوتا ہے یہ اِن مقامات کے لئے ہے کہ علیؑ سے یعنی عقلِ کُلّ سے، نفسِ کُلّ پیدا ہوگیا اور نفسِ کُلّ سے ناطق پیدا ہوگیا اور ناطق سے پھر اساس پیدا ہوگیا۔ تو یہ ہے اُن کے آپس میں نور ایک ہونا۔

سوال: سر! ابوطالب کو پھر ہم امامِ مقیم کہہ سکتے ہیں؟

جواب: جی ہاں! میں نے شروع میں کہا تھا نا کہ اِن کی ایک Unity بھی ہے اور مختلف درجات پر بھی ہیں، Unity تو ایسی چیز ہے کہ پھر اُس میں ہم بھی اُن کے ساتھ آسکتے ہیں، تو پیغمبر اور علی کے ایک ہونے میں کیا، دیر لگتی ہے۔ وہ بہت معمولی بات ہے، جہاں ہم بھی دعویٰ کرسکتے ہیں کہ ہم بھی اپنے رُوحانی شجرے کو سمجھیں اور دُنیا میں آنے کا جو فلسفہ

ہے یا ہماری رُوح کا جو Link ہے اور ہماری رُوح کس طرح Omnipresent ہے اِس کو سمجھیں تو ہم بھی علم الیقین کی روشنی میں خدا کے اندر خود کو پاتے ہیں۔ ہماری انا کہاں ہے؟ ہم آئے کب ہیں؟ یعنی کوئی حقیقت Source سے الگ ہو کر نہیں آتی ہے، یہ جو ہم کو سکھایا اور بتایا جاتا ہے اور ہر بار دُعا گزاری کی جاتی ہے کہ اصل میں واصل ہو، یہ کہنے کے لئے ہے، حقیقت اِس کی کچھ اور ہے۔ ہم اصل میں پہلے سے واصل ہیں، یہ صرف جاننا ہے اور اعمال سے اپنے اندر پاکیزگی لا کر بھروسہ کرنا ہے اور یقین رکھنا ہے۔ چلو دعا کریں یہ تو ایک رسم کی بات ہے، رسم پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن عملاً کس طرح پیدا ہوتا ہے۔

دُنیا کے اندر اگر کثرت ہے تو یہ وحدتِ کثرت نما ہے۔ دُنیا کے اندر جتنے لوگ ہیں، جتنی رُوحیں ہیں، اِن تمام رُوحوں کے اُوپر سرچشمہ میں ایک Unity قائم ہے، کوئی بھی چیز Unity سے الگ ہو کر یعنی خدا کے نور سے الگ ہو کر نہیں آتی ہے، اُس کا سایہ آتا ہے اُس کی کِرن آتی ہے، اُس کی لائٹ آتی ہے۔ دُنیا کو اگر آباد کرنا ہے تو سورج کے لئے کیا ضروری ہے کہ اپنے مقام کو چھوڑ کر زمین پر اُترے، بہتر تو یہ ہے کہ وہ اپنی دھوپ کو، روشنی کو، کرنوں کو بھیجے، یہی کرنیں اور یہی دھوپ سورج کی نمائندگی کرتی ہیں۔ تو اسی طرح محمدؐ اور علیؑ بھی اپنے اصل مقام سے کب اُترے یہ تو اُن کی شخصیت ہے، یہ تو عکس ہے۔ تو ہم کب دُنیا میں آگئے، یہ تو ہمارا سایہ ہے، ہم اب بھی خدا کے ساتھ اصل میں واصل ہیں۔ تو پھر محمدؐ اور علیؑ کے ایک نہ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے، وہ تو ہمیشہ سے ہیں ہم بھی اُن کے ساتھ اُن کے فرزندوں کی حیثیت سے ایک ہیں۔ تو فرزند بھی باپ کے ساتھ برابر ہوتا ہے، مستقبل میں لیکن رُوحانیت [میں] ماضی اور مستقبل نہیں ہے، ازل میں جو کچھ ہے ابد میں وہی ہے اور ابد میں وہی ہوگا جو ازل میں ہے، یہ تو دیکھنے کی چیز ہے، یہ نظر کا دھوکا ہے، فریبِ نظر ہے اور حقیقت میں دیکھا جائے تو ہماری جو اصلی انا ہے، جو خودی ہے وہ اپنی حالت پر قائم ہے اور خدا نے جو ہم سے وعدے کئے وہ صحیح بات ہے لیکن اِس معنی میں نہیں کہ کوئی نئی چیز ہوگی، ہمارے سامنے سے وہ سائے ہٹائے جائیں گے، پردے اٹھائیں جائیں گے اور ہمارے اندر جو شعور ہے اُس کو اِس قابل بنایا جائے گا کہ ہم اپنی اُس ازلی حقیقت کو سمجھ پائیں گے، یہ ہوا ہمارا خدا سے واصل ہو جانا، اصل سے واصل ہو جانا۔

ایک حدیث ہے اس کو ذرا سوچیں حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ: [یابنی آدم اطعنی اجعلك مثلی] ''اے ابن آدم میری اطاعت کرنا تا کہ میں تم کو اپنی مانند ایک خدا قرار دوں گا خدا بناؤں گا''۔ اگر اِس کو اِسی فلسفہ کے بغیر سمجھیں جو میں نے ابھی پیش کیا تو عجیب سی بات ہوگی وہ یہ کہ وہ خدا جو پُرانا ہے ہم کو ایک نیا خدا بنائے گا تو پھر بھی ہم اُس جیسے نہیں ہوسکیں گے، حالانکہ اِس حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ خدا نئے خدا کو اپنے مانند قرار دے گا، تو اپنی مانند قرار کیسے دے گا جب تک کہ ازل سے اُس کے ساتھ ہماری حقیقت موجود نہ ہو، نئے میں نئے بناتا ہے تو ہم تو درمیان کے خدا بن گئے وہ تو

ازل سے قدیم خدا بن گیا اُس کی زندگی تو Unlimited ہے، ہماری زندگی Limited ہے جواب سے شروع ہوگئی۔ تو ہماری یہ خدائی اُس خدائی کی طرح کس طرح بن سکتی ہے اور دُوسری بات ہم کیسے دو خدا ہو سکتے ہیں اور اگر ہم اُس کے ساتھ مل بھی گئے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اُس پُرانے خدا میں ایک چیز کا اضافہ ہوگیا کہ ایک نیا خدا اُس سے جا کر ملا، تو پھر پہلے اتنی کمی تھی جتنی کہ ہم ہیں، پھر اُس میں اضافہ ہوگیا، ایک اور بنے گا تو پھر اور اضافہ ہو جائے گا اِسی طرح وہ خدا بڑھ جائے گا یہ بات نہیں ہے۔

جو حقیقت ہے وہ اپنی جگہ پر ہے وہ ایک حال میں ہے اِس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ یہ علم ہی ہے علم کا ہیر پھیر ہے اِس کو سمجھنا ہے اور خدا نے یہ بھی فرمایا تھا حدیث میں کہ: ''اَلْاِنْسَانُ سِرِّی وَاَنَا سِرُّہٗ'' انسان میرا ایک بھید ہے، میں اُس کا بھید ہوں۔ انسان کے ساتھ خدا کا رشتہ ہے، انسان خدا کی حقیقت کے ساتھ ایک ہے، انسان خود خدا ہے۔ تو اسماعیلی مذہب اِس قدر انسان کو بلندی عطا کرتا ہے، اتنا مرتبہ دیتا ہے، یہ امامؑ کی مہربانی ہے کہ اُسی نے یہ چیزیں ممکن کر دیں۔ اِس طرح سوچنے کے لئے رستے ہموار کئے، آپ فرامین کو دیکھیں پیروں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''وہ اپنی رُوح کے عاشق تھے'' (دارالسّلام۔ ۲۹۔۹۔۱۸۹۹)۔ اگر خدا خدا ہو اور رُوح خدا نہ ہو تو امامؑ کو یوں نہیں فرمانا چاہئے لوگوں کو حیران کر کے وہ اپنی رُوح کے عاشق تھے۔ خدا الگ ہو اور رُوح الگ ہو تو خدا کو چھوڑ کر کوئی اپنی رُوح کا عاشق کیوں بنے اور امامؑ نے یہ بھی فرمایا کہ ''مجھ کو کوئی خواب میں نہیں دیکھتا ہے'' (راجکوٹ۔ ۲۰۔۲۔۱۹۱۰)۔ حالانکہ دیکھتے ہیں یہاں جتنے بیٹھے ہیں سب ہی نے دیکھا ہے۔ تو اِس کے کیا معنی ہیں سوائے اِس کے کہ ہماری رُوح ہی یہ رُوپ دھار سکتی ہے، ہمارے اندر خدا بننے کی قوت اور خدا کے جلوے میں ظہور کرنے کی صلاحیت ہر وقت موجود ہے، اِس معنی میں امام نے فرمایا کہ وہ مومنین جو بھی امام کو دیکھتے ہیں وہ اپنی رُوح کو دیکھتے ہیں، اُن کی روح یہ کام کرتی ہے۔

خدا کی بڑی تعریف ہے کہ اُس کو ایسا کرنا چاہئے کہ رُوح کو یہ قوت عطا کرے کہ رُوح سب کچھ کام کرے، کیا ضرورت ہے کہ خدا آئے اور اُس انسان میں بسے، وہ ایسا کیوں نہیں کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی باکمال چیز پیدا کرے جس میں یہ صلاحیت ہو کہ [وہ] خدا کا رُوپ دھارے۔ آپ دو خداؤں کو فرض کریں، ایک خدا ایسا ہے کہ وہ کسی بندے کو اپنا مرتبہ نہیں دے سکتا ہے، یا بخیلی کی وجہ سے یا کمزوری کی وجہ سے، دُوسرا خدا ایسا ہے کہ وہ ایک بندے کو اپنی ذات سے ملا لیتا ہے اور اپنے مرتبے میں اُس کو لاتا ہے، تو کون سا اچھا ہے۔ میں تو اِس کو مانوں گا جس میں بخالت نہیں ہے، جو سب کچھ دینے والا ہے، یہ اسماعیلی مذہب ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ کیا ضرورت ہے ایک ناقص چیز کو پیدا کرے اور پھر اِس کو آہستہ آہستہ کمال دے، ایسا کیوں نہیں ہے کہ ازل سے لے کر ابد تک ایک شخص کو ایک ہستی کو مستغنی رکھے اُس کو اپنی ذات کے ساتھ رکھے اُس کو کبھی محتاج نہ بنائے اور اگر محتاجی ہے یا دُنیا میں آنا ہے تو صرف ایک سائے کی بات ہے، سائے سے

کون ڈرتا ہے، امام نے فرمایا کہ ''تم دُنیا سے گزر جاؤ تمہارا جسم کتوں کے سامنے پھینکا جائے، آگ میں جلایا جائے تو تم کو کیا'' (وڈھواڑں کیمپ ١٩۔١٠۔١٩٠٣) ۔تمہاری رُوح کو تو نجات مل چکی ہے، تو یہ ہے مومن کے اُوپر دیکھنے کا ثبوت ہے کہ امامؑ نے فرمایا ہے کہ ''مومن کی نگاہ بلندی کی طرف ہونی چاہئے'' (راجکوٹ۔٢١۔١٠۔١٩٠٣) ۔کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو یہ حوصلہ دے، کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو اِس طرح سے سوچے، تو صرف اسماعیلی مذہب ہے۔

جو اسماعیلی مذہب ہے وہ آفاقی اور کائناتی مذہب ہے، اِس میں سارے مذاہب جذب ہونے والے ہیں اور اِسی سے دُنیا بھر کے مذاہب پیدا ہوئے تھے اور کل کو یہ سب مذاہب اِسی میں جذب ہو جائیں گے۔ لیکن کس طرح جذب ہو جائیں گے اِس طرح اِس حالت میں نہیں، اسلام اپنے رُوپ کو تبدیل کرے گا، اِنَّ الاِسلَامَ بَدَأَ غَرِیبًا وَّ سَیَعُودُ کَمَا بَدَأَ فَطُوبٰی لِلغُرَبَاءِ۔ [ترجمہ: اسلام غربت سے شروع ہوا اور ایک زمانہ میں پھر غریب ہو جائے گا تو غرباء کے لئے طوبیٰ یعنی بہشت ہے (لغات الحدیث، جلدِ سوم، ہزار حکمت، حکمت نمبر ٧٦٣)] ''اسلام شروع میں بھی انوکھا اور نرالا تھا، کوئی اُس کو نہیں پہچانتا تھا زمانۂ رسولؐ میں اگر دُنیا والے اسلام کو پہچانتے اور کہتے کہ خدا کا دین ہے تو سب اُس میں داخل ہوتے، اُس کو نہیں پہچانا، لیکن کچھ لوگوں نے اُس کو صحیح معنوں میں پہچانا یا اُس میں انہوں نے پناہ لی، دُنیا کے خطرات سے بچنے کے لئے مرنے سے، لُٹنے سے بچنے کے لئے۔ اچھا! اب سب لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن خدا ''خَیرُ المَاکِرِینَ'' ہے، اُس کی سیاست بھی بہت عجیب ہے آہستہ آہستہ، آہستہ، آہستہ، آہستہ اسلام اُن کے ہاتھ سے چھین لے گا اور پھر دُوسرے راستے سے اُس کو ایک ایسا رنگ دے گا [یعنی] اسلام کو کہ کوئی نہیں پہچانے گا مگر اسماعیلی کسی نہ کسی طرح اُس کو پہچانیں گے۔

اب فرض کریں حقیقی اسلام اسماعیلی مذہب ہے وہ تو اِس کو نہیں پہچان رہے ہیں یا فرض کرو اِس سے بھی تھوڑا بہت تبدیل ہو جائے گا کل کو، اُس کو نہیں پہچانیں گے، بلکہ خطرہ ہے کہ اپنے جو کمزور اسماعیلی ہیں وہ بھی حقیقی اسلام کو نہیں سمجھیں گے۔ اچھا! پھر یہ کیوں اِس لئے کہ جو اِس کے مستحق نہیں ہیں وہ اِس کے دامن سے الگ ہو جائیں گے، وہ گمان میں، وہ قیاس میں رہیں گے اور حق اُن سے چھین لیا جائے گا، جو سچائی ہے، جو صداقت ہے، وہ اِس کے اہل نہیں ہیں، انہوں نے رسولؐ کے بعد بے وفائی کی، رسولؐ کے جانشین کو نہیں پہچانا اِس لئے، یہ تو بہت بڑے راز کی بات ہے اور اِس پر زیادہ بحث نہیں کریں تو اچھا ہے۔

قُل أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ إِلَٰهِ النَّاسِ مِن شَرِّ الوَسوَاسِ الخَنَّاسِ الَّذِى يُوَسوِسُ فِى صُدُورِ النَّاسِ مِنَ الجِنَّةِ وَالنَّاسِ (١١٤: ١۔٦) اِس آخری ٹکرے کے اندر کیا اسماعیلیت کا ذکر ہے؟ ایسا پوچھا! تو میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ اتفاقاً آپ نے ایک ایسا سوال پوچھا جو کہ میں نے Writing میں اور کتابی شکل میں اس کو شائع کیا [حکیم پیر ناصر خسرو اور رُوحانیت، ص۔٥٦]۔ پھر دُوسرے نے دُوسرا ایک سوال پیش کیا، وہ بھی اتفاق سے ایسا پوچھا گیا کہ وہ بھی پہلے

لکھا گیا تھا جواب دیا گیا تھا۔ پھر اُس کے بعد انہوں نے نہیں پوچھا، پھر دُوسرے سوالات کئے۔اس لئے وہاں بار بار اعلان ہو چکا تھا کہ جن کے سوالات ہوں Writing میں دے دیں۔انہوں نے کاغذ کے ٹکروں پر انگلش میں لکھ کر دیا تھا تو ہم نے ان کو ٹائپ کر کے ایک Collection بنایا،اب ہمارے پاس وہ ہیں اور اِس پر ایک کتاب بنی ہوئی ہے اور ہم نے اُس کو آسانی کے لئے اور خوبصورتی کے لحاظ سے ''سوسوال'' کا نام دیا ہے،سوسوال نہیں ہیں.بہت زیادہ ہیں، یا نور مولانا شاہ کریم الحسینی حاضر امام۔

یہ ساری ریاضت اور تمام محنت کس لئے ہے؟ اِس لئے کہ دُنیا مادّی طور پر بہت آگے نکل چکی ہے، دین کا ایک معمولی سا علم کیسے کافی ہوسکتا ہے، جب کہ سائنس نے طرح طرح کے معجزات کئے اور دُنیا بھر کے لوگ ظاہری علوم کو، سائنس کو اور مادّی قسم کے فلسفے کو مانتے ہیں،تو ایسے میں ہوشمند مومنین کے لئے ضروری ہے،لازمی ہے کہ وہ دین کی ایسی قوتوں سے استفادہ کریں جو کہ روحانیت کی قوتیں ہیں جو کہ اعلیٰ درجے کے علم کی قوتیں ہیں۔ہمیں اِس وقت اپنی نئی نسل کے لئے سوچنا ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کو کیا دیں،علم کے سلسلے میں کہ وہ دُنیا کے ساتھ مقابلہ کرسکیں اور مطمئن ہوسکیں کہ ہمارا دین حق ہے۔اِس کے لئے ہمیں جدوجہد کرنی ہے اور یہ کوشش کرنی ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کو اور نوجوان طبقے کو ایک ایسا علم دیں کہ جس میں اطمینان ہے جو کہ یقینی علم ہے، جو رُوحانیت کی قوتوں سے بھرپور ہے، ایسے علم سے اُن کو اگر ہم آشنا کرسکیں تو یقیناً وہ اپنے دین سے مطمئن ہوجائیں گے اور زمانے کے ساتھ وہ مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے، اگر ہم سے ایسا نہیں ہوا اور ہم نے کبھی اُس عقیدے پر اکتفا کیا جس پر کہ ہمارے آباء واجداد تھے تو پھر مشکل آئے گی کیونکہ وہ زمانہ قدیم ایسا تھا کہ اُس میں صرف عقیدہ ہی کافی ہوتا تھا،اُس میں معجزات سے بھرپور علم کی چنداں ضرورت نہیں تھی، ہمارے آباء و اجداد اِس پر قناعت کرتے تھے،اِس پر اکتفا کرتے تھے کہ اُن کو کوئی مشنری امامؑ کے وہ معجزات بتاتے تھے جو آنکھوں سے دُور واقع ہوئے ہوں۔

تو دیکھئے اگر ایک شخص آپ کو یہ بتلاتا ہے کہ مولانا علیؑ کے زمانے میں یہ یہ معجزہ ہوا ہے،اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ معجزہ ہوا ہوگا لیکن اِس روایتی معجزے سے آپ کسی غیر کو کس طرح مطمئن کرسکتے ہیں۔ یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ آپ اپنے امام کے معجزات کو بیان کریں اور یہ کوشش کریں کہ دُوسروں کو بھی اِس سے تشفی دلائیں، یہ کافی نہیں ہے،اِس کو کہتے ہیں عقیدہ یا کہ روایت۔آپ کو معلوم ہے کہ پیغمبرؐ نے بہت تھوڑے معجزات کئے تھے یا کہ آپ باور کریں کہ نہیں کئے تھے لیکن آج مسلمانوں کی بہت ساری کتابیں پیغمبر صلعم کے معجزات سے بھرپور ہیں اور اِسی طرح مولانا علیؑ نے کتنے معجزات کئے تھے، بہت تھوڑے کئے ہوں گے، ہوسکتا ہے کہ وہ بھی نہ کئے ہوں لیکن آج دنیائے شیعیت علیؑ کے معجزات سے بھر گئی ہے،آپ کی کیا رائے ہے اِس سلسلے میں،کیا آپ سنی سنائی باتوں کو قبول کرنا چاہتے ہیں یا کہ آپ عقل و دانش کی روشنی میں

آگے بڑھنا چاہتے ہیں، چلو آپ کے لئے ہمارے لئے ٹھیک ہے، ہمارا آپ کا زمانہ ہی ایسا تھا کہ علیؑ کے معجزات بتائے گئے ہم نے باور کیا اور سرِ سجدہ زمین پر رکھا اور علیؑ کی توصیف و تعریف سنتے ہی آنکھوں سے آنسو بہائے، خوش ہو گئے۔ تو ہمارا وقت ایسا تھا لیکن اِس منطق اور سائنس کے زمانے میں جب تک آپ نئی نسل کو ایسی چیزیں نہ دیں جو کہ ٹھوس ہیں، جو کہ حقیقت پر مبنی ہیں، جن کی منطق بہت ہی مضبوط ہے، تو پھر نئی نسل اِس کے سوا مطمئن نہیں ہو سکتی ہے۔

اس کے لئے کیا کرنا چاہئے یا یہ کہ آپ عبادت کا ایک ایسا راستہ اختیار کریں کہ اُس میں ذاتی مشاہدہ ہو یعنی وہ راستہ ایسا ہو کہ اُس میں ہر کوئی ذاتی طور پر دیکھ سکے کہ دین کا جوہر کیا ہے اور معجزہ کسے کہتے ہیں۔ جب امامؑ یہ فرماتے ہیں کہ ''تم معجزے کی حد تک ترقّی کر سکتے ہو'' (دارالسّلام۔ ۲۹۔ ۹۔ ۱۸۹۹)۔ تو ہم روایتی معجزات کو کیوں اپنائیں اور اُن کو کیوں سنیں۔ چلو سُن بھی لیا، ٹھیک ہے لیکن ہمیں اُس راستے کو زیادہ سے زیادہ اختیار کرنا چاہئے جو کہ معجزے سے بہت ہی قریب ہے، آج کل یونیورسٹی، کالج، اسکول سے جو بھی آتے ہیں وہ بہت سخت سوالات لے کر آتے ہیں، امامِ اقدسؑ نے بھی اپنے پاک فرمان میں کہیں اشارہ فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ تم ایسا نہ سوچو کہ تمہاری اولاد تم سے سوالات نہ کرے، تمہاری اولاد تم سے ضرور سوالات کرے گی، تم سے بہت سی باتیں پوچھے گی، تم اُس کے لئے تیار رہنا، تم اس کو مطمئن کرنا، تم اُس کو خاطر خواہ جواب دینا، [اس لئے] ہمیں محنت کرنی چاہئے، اگر ہم کو دین عزیز ہے تو علمی طور پر خود کو مضبوط بنانا چاہئے، اِس سے بہت سے کام بنیں گے، خود ہم کو تسلی ہوگی اور ہم اپنی اولاد کو [علم] دے سکیں گے اور دُوسرے لوگ اگر ہم سے کوئی سوال کریں تو اُس کے لئے ہم جواب دے سکیں گے، یہ جہاد ہے، آپ یہ نہ سوچیں کہ اب جہاد نہیں ہے، کون کہتا ہے کہ جہاد دنیا میں ختم ہو گیا، جنگ کبھی سرد ہوتی ہے، کبھی گرم ہوتی ہے، سرد جنگ تو ہمیشہ جاری ہے، کیا یہ جنگ نہیں ہے کہ آپ کے خلاف لوگ Pamphlets تقسیم کرتے ہیں، آپ کو پتہ ہے اِس کراچی کے اندر، حالانکہ یہ ہمارا بہت بڑا مرکز ہے، یہاں پر بہت اعلیٰ درجے کے لوگ رہتے ہیں، مالی، علمی، سیاسی اور ہر لحاظ سے یہاں بہت اچھے اسماعیلی رہتے ہیں، اس کے باوجود دشمن کی کوششیں جاری ہیں۔

آپ اگر دین کے لئے خیر خواہ ہیں تو آپ بھی سرد جنگ میں شریک ہو جائیں، سرد جنگ کریں اپنے مخالفین کے خلاف جہاد کریں اور جہاد کرنا ہے تو خود کو مضبوط بنائیں، علمی طور پر مضبوط بنائیں۔ آپ سوالات سے کیوں گُریز کرتے ہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دُنیا میں کوئی کچھ نہ کہے حالانکہ شروع سے آخر تک دین کے خلاف دشمن جو ہے ہر وقت Propaganda کرتا ہے، امام کے خلاف، مذہب کے خلاف، دین کے خلاف ہر وقت باتیں کرتا ہے، غلط باتیں پھیلاتا ہے۔ اُس کے لئے ہم کانوں میں روئی نہیں ٹھوس سکتے ہیں، دشمن کی باتیں تو سنائی دیتی ہیں، اِس کے لئے کیا تدبیر ہونی چاہئے، وہ یہ کہ ہم علم سے خود کو آراستہ کریں، خود کو مضبوط بنائیں، جب ہم علمی طور پر مضبوط ہو جائیں گے تو دشمن کی

باتوں کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوگا، ہم مضبوط ہیں، ہم چٹان کی طرح مضبوط ہو جائیں تو کوئی اگر لاٹھی مارتا ہے تو اُلٹا اُس کے ہاتھ میں درد ہوگا، چٹان پر کوئی لاٹھی مارتا ہے تو چٹان کو کچھ نہیں ہوتا ہے یا تو لاٹھی ٹوٹ جاتی ہے اگر نہیں ٹوٹتی ہے سخت ہے تو لاٹھی مارنے والے کے ہاتھ میں درد ہوتا ہے، یہ اُس کا Reaction ہے۔ تو ہمیں چٹان کی طرح مضبوط ہونا چاہئے علم سے، عقل سے، دانش سے اور اِس کے لئے کتابوں کا مطالعہ اور اچھی صحبت میں رہنا، Discussions کرنا، سوال و جواب اور علمی ماحول پیدا کرنا یہ کام ہے۔

زمانۂ قدیم میں آپ نے مصر کی تواریخ پڑھی ہوگی، وہاں پر امامؑ کے ارشاد کے مطابق بہت لائق اور دانشمند لوگ پیدا ہوئے تھے، تو وہ کیا کرتے تھے دارالحکمت کے عنوان سے مجالس کرتے تھے، اُن مجالس میں علم کی باتیں ہوتی تھیں، نامعلوم اِس زمانے میں یہ امام کا امتحان ہے یا ہم کچھ کام نہیں کر سکتے ہیں۔ بہر حال اِس زمانے میں بھی علمی مجالس ہونی چاہئے، Discussions ہونا چاہئے، تاکہ ہم خود کو تیار کریں، یہ دین کی خیر خواہی ہے، امامؑ کی وفاداری ہے اور اپنے اداروں کے لئے بھی اِس میں بہت ہی مدد ہے، اگر ہم آپ کوشش کریں اور مسائل کو حل کریں علمی طور پر خود کو مضبوط بنائیں تو ہمارے اداروں کو اِس سے بہت مدد ملے گی اور مسائل کم ہو جائیں گے اور جماعتوں کے اندر کسی نہ کسی طرح سے علم پھیل جائے گا، علم جو ہے وہ پھیلنے والا ہوتا ہے، وہ رُکتا نہیں ہے، ایک دفعہ علم Out ہو گیا، شائع ہو گیا تو وہ روشنی کی طرح ہے کہ بلند مقام پر جب روشنی کو جگہ ملتی ہے تو اُس کی تابش اور کرنیں بہت دُور دراز تک پڑتی ہیں۔ اسی طرح علم کے شائع ہونے سے، علم کی اشاعت سے اور آپس میں علمی طور پر صحبت کرنے سے اِس سے جماعت کو اور مذہب کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔

میرے کہنے کا مطلب ہے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا جو صرف معمولی علم سے گزارا ہو کیونکہ غیر اسماعیلیوں نے بہت کچھ کام کیا اور اُن لوگوں نے جو اسماعیلیت کے Against ہیں انہوں نے اور پوری طرح سے دُنیا نے بھی بہت کچھ ترقی کی ہے، تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایک طرف دُنیا ہے اور ایک طرف دین ہے۔ جب دُنیا طاقتور ہوتی ہے تو دُنیا کا پلّہ بھاری ہوتا ہے اور دُین کا جو پلّہ ہے وہ ہلکا ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف دُنیا ہے اور ایک طرف دین ہے اور دُوسری بات یہ ہے کہ اگر مانا جائے کہ دُنیا کے اندر سرد جنگ جاری ہے۔ سرد جنگ آپ جانتے ہیں کہ مذہب کے خلاف بہت کچھ کاروائی ہوتی ہے وہ اگر قصد نہ کریں تو خود بخود بھی کاروائی ہوتی ہے اور قصد کرتے ہیں، تو اِس کے لئے اگر ہم سستی سے کام لیں اور مستقبل کو نہ سوچیں، اپنی اولاد کو علمی طور پر مضبوط نہ بنائیں، تو ہمارے سامنے بہت سی مشکلات آئیں گی اور ایسی بہت سی مشکلات آچکی ہیں اور آرہی ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ اگر ہم اپنے دین کے خیر خواہ ہیں تو ذاتی طور پر بھی کم سے کم جدوجہد کریں اور بہت کچھ سیکھیں۔ ہم اِن نئی نسل کی مدد کریں ان کو موقع دیں، یہ اپنے لیکچروں میں اور ریلجس سینٹروں میں اور اپنی دیگر Duties میں اُس علم کو مہیا کریں، جو مضبوط ہے تو رفتہ رفتہ اِس سے بہت فائدہ ہو سکتا ہے، انقلاب آسکتا ہے علمی طور پر اور مجھے بہت دکھ ہوتا جب علماء کے پاس اور علم کے خادموں کے پاس علم نہ ہو اور کہانیوں سے، قصوں سے گزارا کر

کے وقت کو ضائع کریں اور حالانکہ آپ کو معلوم ہے جماعت کا جو وقت ہے کتنا عزیز ہوتا ہے۔

میں ایک فرد ہوں میرا وقت عزیز ہوتا ہے، میرے ساتھ اِن کا اُن کا وقت جمع کریں تو اور زیادہ اِس کی قیمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پوری جماعت کے وقت کو یکجا کریں ٹوٹل کریں تو آپ اُس کی قیمت نہیں لگا سکیں گے کیونکہ پوری جماعت کا وقت ایک دن کا وقت مثلاً کسی جماعت خانے میں دو، تین ہزار کی جماعت ہے تو اُس جماعت میں ایک گھنٹہ کوئی لیکچر سننا ہے یا پچاس منٹ سننا ہے، اب دیکھنا ہے کہ فی کس ایک ایک گھنٹہ ہزار گھنٹے، دو ہزار گھنٹے، تین ہزار گھنٹے تو اُس میں ایک مومن کی پوری زندگی بنتی ہے، تو ایسے قیمتی وقت میں اگر اُن کو کوئی صحیح چیز نہیں ملتی ہے جو کہ مفید ہو اور وہی باتیں ملتی ہیں جو دُہرائی گئی ہیں تو اُس سے جماعت کا جو وقت ہوتا ہے وہ ضائع ہوتا ہے۔ اِس کے لئے اُستادوں کو اِس کا احساس ہونا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ میں کیا کرسکتا ہوں؟ اتنی ساری جماعتوں کے وقت کو یکجا کریں، ٹوٹل کریں تو ایک مومن کی پوری زندگی بن جائے گی، ایک شخص پوری زندگی دیتا ہے، میں پچاس منٹ کا لیکچر دیتا ہوں وہ سودا ہوتا ہے، اُدھر سے وہ پوری زندگی ادھر سے پچاس منٹ کا لیکچر۔ تو اُس زندگی کی قیمت کے موافق میرے پاس کچھ علم ہو تو ٹھیک ہے اگر نہیں ہے تو جماعت کی زندگی اِس طرح سے ضائع ہو جاتی ہے۔

اِس کے لئے علم کی ضرورت ہے، ٹھوس علم کی ضرورت ہے اور خصوصاً ایسے علم کی ضرورت ہے جو کل کو کام آئے، جو دشمن کے خلاف [یعنی] Anti-Ismailis کے خلاف کام آئے۔ تو اِس کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ ہم کیا کرسکتے ہیں؟ ہم تو کچھ بھی نہیں کرسکتے ہیں ہم صرف اتنا کرسکتے ہیں کہ اگر ہم کو چند احباب ملتے ہیں اُن کو کچھ باتیں بتائیں، ایسی باتیں بتائیں کہ وہ ٹھوس ہوں۔ شاید یہ باتیں آہستہ آہستہ، کسی نہ کسی طرح سے نئی نسل کو پہنچیں۔ مثلاً آپ میں سے جو حضرات ہوشیار ہیں، نمائندگی رکھتے ہیں، گائیڈز ہیں، آنریری واعظین ہیں تو بہت اچھی بات ہے کہ ہم کو یہ موقع مل رہا ہے، تو علم کی اِس اہمیت کے بعد دو باتیں میں آپ کو بتاؤں، کہ لوگ اسماعیلیت کے خلاف باتیں کرتے ہیں، امامؑ کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور حالانکہ اسلام کے اندر امامت ایک ایسا تصوّر ہے جس کو انہوں نے شعوری طور پر بھی اور لاشعوری طور پر بھی تسلیم کیا ہے۔

سنئے میں اہم بات بتاتا ہوں، اب تک میں نے جو باتیں بتائیں وہ تو علم کی اہمیت کے بارے میں بتائیں اور خاص Point کی بات ابھی میں آپ کو بتاتا ہوں، میں کہہ رہا ہوں کہ شعوری طور پر اور لاشعوری طور پر بھی سب مسلمانوں نے امامت کو تسلیم کیا ہے، لیکن تسلیم کرنے کے بعد بھی انکار کرتے ہیں، انہوں نے شعوری اور لاشعوری طور پر کیسے امامت کو قبول کیا ہے۔ اچھا رسول اللہؐ کے بعد بحث درمیان میں آئی تھی یا نہیں آئی تھی کہ کسی جانشین کا ہونا لازمی ہے، کسی خلیفے کا ہونا ناگزیر ہے، اِس پر سب متّفق ہوئے تھے یا نہیں ہوئے تھے؟ آپ تواریخ کو دیکھیں بحیثیتِ مجموعی اسلام کے جتنے بھی فرقے ہیں اُن سب کے نزدیک یہ امر مسلمہ ہے، تسلیم شدہ ہے کہ رسولؐ کا کوئی جانشین ہونا چاہئے، آپ اِس تصوّر کو لیں، رسولؐ کا

کوئی جانشین ہونا چاہیئے ۔ پہلے یہ بات نہ کریں کہ کون ہونا چاہیئے، ابابکر ہونا چاہیئے یا علی ہونا چاہیئے یا زید ہونا چاہیئے یا کون ہونا چاہیئے، اِس کو ذرا چھوڑیں، پہلے یہ تحقیق کریں الگ الگ تحقیق کریں، بات کو Point کو الجھائیں نہیں، پہلے یہ پوچھیں کہ رسولؐ کے بعد جانشینی کے سلسلے میں مسلمانوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی تھی اُس کا Result کیا نکلا۔ اُس میٹنگ میں کس قسم کی [بات چیت ہوئی] تھی، اُس بات چیت میں لیڈروں نے اور دُوسرے لوگوں نے رسول اللہ کو کفنایا دفنایا نہیں، اُس کو اسی طرح رکھا کیوں؟ انہوں نے اِس مسئلے کو اہمیت دی کہ بحیثیتِ مجموعی انہوں نے کہا اگر غیر مسلمانوں کو پتا چلے کہ آج دُنیا سے آنحضرتؐ رُحلت کر گئے ہیں اور اُن کا کوئی جانشین نہیں ہے اگر اُس کے دشمن کو پتا چلا تو ابھی ابھی مکہ پر چڑھائی ہوگی اور مسلمانوں کے خلاف جنگ چھڑ جائے گی، انہوں نے اِس خطرے کے پیشِ نظر [ایسا کیا] کچھ بدخواہی سے نہیں، کچھ دشمنی سے نہیں۔

عام طور پر بادشاہوں کے وہاں بھی ایسا ہوا کرتا ہے، بادشاہ دُنیا سے گزر گیا تو اس خاندان کے جو خیر خواہ ہوتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں آپ کو معلوم ہے؟ ہوسکے تو موت کو چھپاتے ہیں اور ایک دم سے اُس کا جانشین مقرّر کرتے ہیں، نہیں تو حکومت کے خاتمے کا خطرہ ہوتا ہے، تو اسی طرح اصحابِ رسولؐ نے جو سوجھ بوجھ رکھتے تھے ضرورت محسوس کی کہ رسولؐ کا کوئی جانشین ہونا چاہیئے۔ بعض حضرات اِس کو یعنی بُرے معنی میں، بُرے Sence میں لیتے ہیں، کہتے ہیں کہ رسول کو کفنایا نہیں، دفنایا نہیں اِس کو چھوڑا اور اِدھر خلافت کے لئے باتیں ہوگئیں، ہوسکتا ہے اِس میں خود غرضی کا پہلو بھی ہو لیکن اسلام کو سنبھالنے کا بھی مسئلہ اِس میں ہے۔ دونوں میں سے کون سی بات پیشِ نظر تھی یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ بہر حال صورتِ حال یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے مبارک جسم کو کفن نہیں دیا اور کچھ بھی نہیں کیا، ایک دم سے خلافت کے لئے کانفرنس ہوئی۔ اچھا! اِن تمام باتوں سے یہ طے ہوا، یہ ثبوت ملا کہ رسولؐ کی جانشینی ضروری تھی۔ پھر میں پوچھتا ہوں کیوں ضروری تھی؟ ابھی ابھی آپ نے، ہم نے بحث کی نا! اِس لئے ضروری تھی کہ کوئی غیر مسلم اسلام کے نظام کو درہم برہم نہ کرے اور سردار کے نہ ہونے سے وہ یعنی ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور اسلام کے اندر انتشار نہ پھیلے، لہٰذا ایک شخص کا ہونا ضروری تھا۔

یہاں پر ایک سوال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو آسمانی کتاب نازل کی تھی جو قرآن کے نام سے تھی، اگر اُس سے پیغمبر کی جانشینی ہوسکتی اور وہ خاموش کتاب جو بولنے والی نہیں تھی سب مسلمانوں کو سنبھال سکتی اور خاطر خواہ ہدایت [کر سکتی] کسی ہادی کے بغیر، کسی امام کے بغیر، کسی خلیفے کے بغیر، تو اِس کی کیا ضرورت تھی کہ ایک دم سے رسولؐ کی جو رسومات تھی اُس کو ادا کئے بغیر جانشینی کے لئے میٹنگ کریں۔ اِس سے ظاہر ہے کہ آج جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کی موجودگی میں کسی خلیفے کی کسی امام کی کیا ضرورت ہے؟ اگر اِن کی اِس بات کی کوئی اہمیت ہوتی، اگر اِن کی یہ بات صحیح ہوتی تو بہتر یہ تھا کہ شروع ہی میں کسی جانشین کو نہیں لیتے اور قرآن ہی کو رہنما، امام، پیشوا مانتے اور اسی سے اپنے مسائل کو حل کرتے۔ یہ بات بالکل

انہونی تھی، ناممکن تھی، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ افراد کے درمیان قرآن کو رکھیں اور اختلافات کو وہ مٹائے اور کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے اِس کا فیصلہ سنائے یہ بات ناممکن تھی لہٰذا یہ ایک Point ہے، یہ ایک علم ہے۔

آج اگر کوئی شخص قرآن کو امامؑ سے آگے بڑھا کے یہ کہتا ہے کہ قرآن ہے اور قرآن کے ہوتے ہوئے کسی خلیفے کی کسی امام کی کیا ضرورت ہے، تو اُس کو سمجھنا چاہیئے، اُس کو کہنا چاہیئے کہ قرآن کے لئے ہم بھی سر جھکاتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی عزیز کتاب ہے، صحیح ہے لیکن اگر خدا اور رسول کا اِس میں یہی منشاء ہوتا کہ قرآن ہی کافی ہوتا اگر اصحابِ رسول کے سامنے یہ بات مناسب ہوتی کہ وہ کسی لیڈر کو، کسی خلیفے کو، کسی امام کو تسلیم نہ کریں قرآن کی موجودگی میں، تو اُس وقت یہ بات ہوتی اور حالانکہ اُس وقت میں کسی قدر یہ بات آسان بھی تھی، چونکہ سب لوگ قرآن کو سمجھتے تھے سب لوگوں کو رسولؐ نے قرآن سکھایا تھا اور ابھی ابھی اُن کے سامنے کچھ نئے مسائل بھی نہیں تھے، وہ وقت بالکل وہی تھا جس میں کہ رسولؐ اُن کے سامنے ابھی ابھی تھے اور رسولؐ نے سب باتیں بتائیں تھیں، سارے مسائل حل کئے تھے، اُس میں کوئی نیا مسئلہ نہیں تھا۔ اِس کے باوجود انہوں نے قرآن کے ساتھ ساتھ ایک ہادی کی ضرورت محسوس کی۔ چلئے! ہادی جس کو انہوں نے چُنا کس کو چننا چاہیئے تھا؟ یہ تو مسئلہ الگ ہے بہرحال یہ ثابت ہے کہ سب مسلمانوں نے بنیاد میں اِس کو مان لیا ہے کہ امام کا ہونا لازمی ہے۔ اب یہی کافی ہے دانشمند کے لئے، اب اگر اسماعیلیوں کے سوا کسی اور کے ہاں امام نہیں ہے، ہادی نہیں ہے، خلیفہ نہیں تو پھر اِس صورتِ حال کو پھر سوچیں گے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: ''کُن'' کی حقیقت، عبادت کی ضرورت اور نفس کے عناصر

کیسٹ نمبر: ۱۴ تاریخ: مئی، ۱۹۷۸، کراچی

Click here for Audio

توبہ سے بھی پاکیزگی ہوتی ہے، امام کی محبّت سے بھی پاکیزگی ہوتی ہے، پرہیزگاری سے بھی پاکیزگی ہوتی ہے اور توحید سے، یعنی خدا کی وحدانیت کو سمجھنے سے بھی پاکیزگی ہوتی ہے غرض یہ کہ پاکیزگی کے بہت سے طریقے ہیں۔ جس طرح مادّی طور پر آپ دیکھتے ہیں کہ دُنیا کے اندر پاکیزگی کے لئے صرف پانی نہیں ہے پانی کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہوسکتی ہیں، مٹی سے بھی پاکیزگی ہوتی ہے، ہَوا سے بھی پاکیزگی ہوتی ہے اور کسی چیز سے جب تک فرسودہ [نہ ہو] اُس سے بھی پاکیزگی ہوتی ہے اور سب سے بڑی پاکیزگی نور سے، روشنی سے ہوتی ہے۔ ہمارے عزیزوں نے اپنے مضمون کو پوری طرح سے شاید پیش نہیں کیا، تو ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ نور سے کس طرح پاکیزگی ہوتی ہے اور سب سے بڑی پاکیزگی نور سے ہوتی ہے۔ اب تک ہم نے آپ نے یہ سوچا تھا کہ ساری پاکیزگی کا وسیلہ پانی ہے لیکن آپ نے خیال کیا ہوگا کہ پانی بھی پاکیزگی کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔ پانی جو خود پاک ہے بعض دفعہ وہ ناپاک ہوجاتا ہے کیوں؟ وہ میل کو اُتارتا ہے اور خود لیتا ہے، لیتا ہے آخرکار وہ تھک جاتا ہے اور خود میلا ہوجاتا ہے، ناپاک ہوجاتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہے بہت سی جگہوں میں گندا پانی جیسے گندی نالی میں اور ایسی جگہوں میں جہاں کا پانی اکثر غلاظت اور نجاست سے گندا ہوجاتا ہے۔ تو اِس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ہمیشہ پانی پاک ہے، جب پانی ہمیشہ اور ہر مقام پر پاک نہیں ہے تو آپ علم کو بھی ہر مقام پر پاک نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ایک علم جو برائے نام علم ہے ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ناپاک ہو۔ علم اصل میں ناپاک نہیں ہے، لیکن لوگوں نے اُس کو ناپاک بنایا ہے، جس طرح کہ جب پانی اپنے سرچشمے سے بہتا ہے تو وہ ناپاک نہیں ہے اُس کی اصلیت پاک ہے لیکن یہ پانی بہتے بہتے اور لوگوں کے تصرّف میں جب آتا ہے تو ناپاک ہوجاتا ہے اِسی طرح علم اگرچہ ذاتی طور پر پاک ہے لیکن اِس کو لوگ جب استعمال کرتے ہیں تو اپنے خیالات اور نظریات کی آمیزش اور آلودگی سے اُس کو آلودہ بنا کر ناپاک کردیتے ہیں، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب پانی پاکیزگی کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو پھر وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا ہے۔

اب اُس کے لئے ایک اور چیز ہے جو اُس سے اُوپر ہے وہ نور ہے تو اُس کی مثال یہ ہے کہ ندّی پاک ہے

تھوڑی سی گندگی کو وہ Disolve کرسکتی ہے لیکن بہتے بہتے نمکیات اور معدنیات اور مٹی اور دیگر آلائشوں کو لیتے لیتے ندّی بھی جراثیم سے پُر ہو جاتی ہے اور سمندر بھی نمکیات سے پُر ہو جاتا ہے اب اِس کی جگہ نور ہے اور وہ یہ کہ نور یعنی سورج اپنی بے پناہ کرنوں کے طوفان سے سمندر کے کثیف پانی کو لطیف بناتا ہے اور اُس پانی کو جس کی عادت ہمیشہ اُوپر سے نیچے بہنے کی ہے نور [اُسے] پرواز کی قوت بخشتا ہے تو پھر یہ پانی کثیف سے لطیف بن کر بلندی کی طرف پرواز کرتا ہے بادلوں کی شکل میں اور جب یہ پانی پرواز کرتا ہے تو اُس میں نمکیات، معدنیات اور جراثیم اور دیگر آمیزش و آلائشیں باقی نہیں رہتی اِس معنی میں خدا نے کہا کہ: وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا (۲۵:۴۸) اور ہم نے بلندی سے پاک اور صاف پانی کو نازل کیا۔

خدا یہ نہیں کہتا کہ فلاں چشمے کا پانی پاک ہے، خدا یہ نہیں کہتا ہے ندّی کا پانی پاک ہے، خدا یہ نہیں فرماتا کہ نہر کا پانی پاک ہے خدا سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اُس پانی کو پاک اور پاکیزہ قرار دیتا ہے جو بادلوں سے برستا ہے، تو دیکھا آپ نے کہ قرآن کے اندر سائنس بھی ہے اور یہ ہے سائنس کہ اُس [پانی] میں جراثیم نہیں ہوتے اُس میں بھی پہلے دن جب بارش برستی ہے تو شاید فضا میں سے گرد وغیرہ اُس کے اندر ہوتی ہے لیکن کچھ دیر بارش برسنے کے بعد جو دُوسرا پانی اُس کے پیچھے برستا ہے تو وہ بڑا صاف پاک اور پاکیزہ ہوتا ہے۔ اچھا تو اِس میں دُہرے معنی ہیں ایک یہ معنی ہیں کہ سائنسی اور ظاہری طور پر وہ بارش کا پانی صاف اور ستھرا ہے اور دُوسرے معنی اِس کے اندر یہ ہیں کہ وہ علم جو ابھی ابھی سرچشمے سے رواں دواں ہو وہ بہت پاکیزہ ہے، یعنی جب علم پیغمبرؐ سے اور امامؑ سے ظاہر ہوتا ہے نازل ہوتا ہے تو اُس وقت وہ علم بہت پاک اور پاکیزہ ہوتا ہے اور ٹھیک ہے اگر اُس پاک اور پاکیزہ علم کو پاکیزگی سے بہایا جائے تو وہ پاک ہی ہے، جس طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ پانی اگر دُور سے آتا ہے تب وہ ناپاک ہو جاتا ہے تو پانی اگر دُور سے بھی آتا ہو تو رستے میں کوئی کثافت اور غلاظت اُس میں مل نہ جائے تو وہ پانی صاف اور ستھرا رہے گا تو میں علم کی بات کرتا تھا جو کہ اِس پاکیزگی کے موضوع سے مل گیا۔

بہر حال علم بھی ایک طرح کی پاکیزگی ہے اور علم نور ہے اور میں نے کہا کہ پاکیزگی کا سب سے بڑا وسیلہ نور ہے اور میں نے کہا کہ پانی جب خود آلودہ ہو جاتا ہے تو نور اُس کو نکھارتا ہے اُس کو Sterilize کرتا ہے اور اُس کی کثافتوں کو الگ اور لطافت کو الگ کر کے اُس میں تمیز کر کے نئے سرے سے اُس کو بلندی کی طرف اُٹھاتا ہے تو [یہ] امامؑ ہی کی طاقت اور اُس کا نور ہے کہ دُنیا والے اگر آج علم کو آلودہ کرتے ہیں، اُس کو گندا کرتے ہیں تو امام نور کا سورج ہے [جو] اِن تمام آلودہ علوم کو پاک اور پاکیزہ کرسکتا ہے رُوحانیت میں اور قیامت میں بھی، آج بھی کل بھی امامؑ ہی ہے جو تمام آلودہ علوم میں صفائی پیدا کرسکتا ہے۔ تو اِس کے لئے ہم اسماعیلی خوش نصیب ہیں کہ ہم نور اور علم کے سرچشمے کے قریب ہیں لہٰذا اگر ہم قرآن کی طرف توجہ دیں تو دُوسروں کے مقابلے میں ہم زیادہ کامیاب ہو جائیں گے اور ہم زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گے اور سب سے زیادہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم قرآن سے رُجوع کریں کیونکہ معلمِ قرآن ہمارے پاس ہے جو امامِ زمانؑ ہے۔

میرے خیال میں آپ نے جو کچھ پوچھا اگرچہ مکمل الفاظ میرے ذہن میں نہیں اُترے ہیں بات یہ ہے کہ آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ جس طرح ہم رُوح کی مثال پانی سے دیتے ہیں اِسی طرح [کیا] ہم علم کی مثال بھی پانی سے دے سکتے ہیں؟ اِس سلسلے میں شاید آپ کو کوئی اُلجھن درپیش ہو اور وہ مثال مناسب نہیں لگتی ہو تو اِس کے بارے میں میں یہ کہوں گا کہ رُوح اور رُوحانیت کی مثال جب ہم کسی مادّی چیز سے دیتے ہیں تو وہ مادّی چیز ہو بہو اُس رُوحانی حقیقت کی ترجمانی نہیں کرسکتی ہے، ہاں یہ بات صحیح ہے کہ کسی قدر ہم کو اُس حقیقت سے قریب تر کرسکتی ہے لیکن ہو بہو ترجمانی اِس لئے نہیں کرسکتی ہے کہ وہ ایک رُوحانی حقیقت ہے اور یہ ایک مادّی چیز ہے۔ کتنی کمزور ہے وہ مثال جو خداوند نے خود قرآن میں اپنے نور کی مثال ایک گھر کے چراغ سے دی ہے (۳۵:۲۴)۔ لیکن اِس کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے کہ رُوحانیت رُوحانیت ہے اور مادیت مادیت ہے، دُنیا دُنیا ہے اور آخرت آخرت ہے۔ آخرت کی کسی حقیقت کی مثال دُنیا کی کسی چیز سے دیں تو کوشش سے ہم اُس حقیقت کے قریب ہی جائیں گے لیکن ہو بہو وہ حقیقت الفاظ میں اور مادّی مثال میں نہیں آسکتی ہے تو اِس لئے جس طرح رُوح کی مثال پانی سے دی جاسکتی ہے اِسی طرح علم کی مثال بھی پانی سے دی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ جس طرح پانی Circle میں ہے تو علم بھی Circle میں ہے، جس طرح پانی کا ایک مرکز ہے جو بحرِ محیط ہے، سمندر ہے اِسی طرح علم کا بھی ایک مرکز ہے۔ جس طرح پانی کی ایک Unity ہے اِس طرح علم کی بھی ایک وحدت ہے اور جس طرح دُنیا کی پوری آبادی پانی سے ہے۔ اِسی طرح رُوحانی زندگی، رُوحانیت کی ساری آبادی علم سے ہے جس طرح پانی کے اجزاء ہیں اسی طرح علم کے بھی اجزاء ہیں۔ جس طرح پانی سے ہر چیز زندہ ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے کہ: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۳۰:۲۱)، دُنیا کے اندر جو چیز زندہ ہے وہ پانی ہی سے ہے اور جاندار مخلوق کے علاوہ نباتات کا انحصار بھی پانی پر ہے اُگنے والی چیزیں پانی کے بغیر نہیں ہیں تو اِسی طرح آپ کو تمام رُوحانی آبادی میں علم ہی علم نظر آئے گا۔ اِسی طرح پانی کے ذائقے مختلف ہیں اور اُس کا رنگ بھی ہر مقام پر الگ [الگ] ہے تو اِسی طرح علم کے مدارج میں بھی فرق ہے۔ تو خدا نے خود ہی مثال دی ہے کہ ایک سمندر ہے جو بڑا میٹھا ہے اور ایک سمندر ہے جو کھارا ہے (۵۳:۲۵)۔ تو میٹھے سمندر سے صحیح علم مقصود ہے اور کھارے سمندر سے وہ علم مُراد ہے جو ظاہری علم ہے اور جس طرح پانی کے اندر بھی ایک دُنیا ہے زندہ مخلوقات کی دُنیا اِسی طرح علم اور رُوحانیت میں بھی ایک رُوحانیت کی دُنیا پوشیدہ ہے اور جس طرح سمندر سے سامانِ آرائش موتی وغیرہ نکالے جاتے ہیں اِسی طرح علم سے بھی رُوح کی زینت بنتی ہے، تو یہ علم کی مثال ہے۔

علم دُوسرے لوگ ہم کو پہنچا سکتے ہیں، جیسے علم الیقین ہے اور معرفت آنکھوں دیکھا حال ہے، کیونکہ وہ شناخت ہے [اُسے] معرفت نہیں کہتے ہیں جب تک کہ دل کی آنکھ سے حقائق کا مشاہدہ نہ کیا جائے اور حقائق کو براہِ راست نہ پہچانا جائے، علم سکھانے سے حاصل ہوسکتا ہے لیکن اگر کوئی ہم کو معرفت بیان کرتا ہے تو ہم علم کی صورت میں اُس کو Accept

کرتے ہیں ۔معرفت کے طور پر نہیں تو ہمارے لیے اُن کی معرفت علم بن بن کر حاصل ہوتی ہے ۔

معرفت کے معنی شناخت کے ہیں اور شناخت میں دیکھنا شرط ہے اور دیکھنے کے بغیر ،مشاہدے کے بغیر کوئی شناخت نہیں ہے رُوح کو ،خدا کی صفات کو ،خدا کی تجلیات کو ،خدا کے ظہورات کو دیکھنا اور رُوحانیت کا مشاہدہ کرنا معرفت ہے اور معرفت بہت اُونچا مقام ہے ۔اِس لئے خدا نے علم کے سلسلے میں کوئی بڑی شرط نہیں رکھی اور کسی بڑے انعام کا ذکر نہیں کیا کہ تم فلان علم کو حاصل کرو گے تو میں تم کو یہ دے دوں گا ۔لیکن معرفت کے سلسلے میں ایک بہت بڑے انعام کی شرط لگائی وہ یہ کہ خدا نے فرمایا جب تم ہم کو پہچان لو گے اور صحیح معنوں میں پہچانو گے تو میں تمہاری ملکیت بن کر تمہارے ہاتھ آؤ نگا تم کو ایک خزانے کی حیثیت سے ملوں گا یہ مفہوم اِس حدیثِ قدسی کے اندر ہے: کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیّاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِکَیْ اُعْرَفَ ۔میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا اور میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو اِس کے لئے میں نے مخلوق کو پیدا کیا تا کہ میری پہچان ہو کتاب :احادیثِ مثنوی ص ۲۹۔خدا حکمت کی زبان میں ارشاد فرماتا ہے تو اُس کا سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، یہ حکمت کی زبان میں ہے اور اِس میں انسان کی عقل حیرت زدہ ہو جاتی ہے کیونکہ اِس میں یوں لگتا ہے کہ خدا ماضی میں ایسا تھا[یعنی] چھپا ہوا خزانہ ۔حالانکہ اب بھی وہ چھپا ہوا خزانہ ہے اور اُس وقت تک وہ چھپا ہوا خزانہ ہے جب تک کہ کوئی عارف اُس کو پہچان نہیں لیتا ہے اور کسی عارف نے اُس کو پہچان لیا اور آنکھوں سے اُس کو دیکھا اور معلوم کر لیا کہ بس یہی خدا ہے اور اُس کا دیدار کیا گیا تو خدا اُس پر بادشاہ نہیں بنتا ،اُس [خدا] کے جتنے نام ہیں اُن ناموں کو بھی وہ اُٹھاتا ہے سب ناموں کو وہ اُٹھاتا ہے اور اپنا نام اُس وقت خزانہ رکھتا ہے ۔

خزانہ کتنا سادہ نام ہے کہ وہ ہمارا خزانہ بن جاتا ہے وہ ہمارا خدا نہیں رہتا ہے وہ ہمارا بادشاہ نہیں رہتا ہے وہ اُس وقت ہم سے حساب کتاب لینے والا نہیں بنتا ہے وہ ہمارا خزانہ ہے ہمارا خزانہ ہماری ملکیت ،ہماری جائیداد ،ہمارا مال ۔یہ جاننے والا جانتا ہے کہ اِس کے اندر کتنی رحمت ہے اور کتنی بڑی مہربانی ہے اور اِس سے بڑھ کر کوئی اور مہربانی نہیں ہے ۔جہاں لوگوں سے جنّت کا وعدہ کیا گیا ہے ،جہاں لوگوں سے بہشت کا وعدہ کیا گیا ہے ،جہاں لوگوں کو نجات دلانے کا وعدہ کیا گیا ہے اور جہاں رُوحانی سلطنت کا وعدہ کیا گیا ہے اُن تمام وعدوں سے یہ بڑھ کر ہے کہ خدا کسی کے ہاتھ آئے تو خزانہ بن کر آئے پھر تو خدا خاموش سونے چاندی کی طرح خاموش آپ اُس کو صَرف کریں اور وہ خاموش ،آپ اُس کو کچھ بولیں تو وہ خاموش یعنی وہ اِس قدر نرم مہربان اور دولت کی طرح ،خزانے کی طرح خود کو سونپنے والا خود کو Submit کرنے والا ،سپردگی کے ساتھ کہ وہ خزانہ ہے بس اور کچھ نہیں ،تو یہ علم اور معرفت کے درمیان فرق کی بات ہوئی ۔کبھی بحث ہوئی تھی کہ عاشق بڑھ کر ہے یا عارف بڑھ کر ہے ،عاشق !ابھی بھی خدا کا کوئی عاشق ہو سکتا ہے تھوڑی سی گریہ وزاری کی گئی اور خدا کے شوق میں دو چار آنسو بہائے گئے تو ایک غریب عاشق ہو گیا لیکن عارف !عارف وہ تو بہت اُونچی بات ہے ،شناخت کے بغیر ،خدا کے دیدار کے بغیر اور آخری دیدار

کے بغیر اور اُس کی تمام تجلیّات کو دیکھے بغیر کس طرح کوئی عارف ہوسکتا ہے۔عالم، عاشق، عارف، عارف سب سے اُوپر ہے۔

ہمارے بزرگانِ دین نے اِس پر بحث کی ہے اور پیر ناصِر خسروؒ کی ایک اعلیٰ سطح کی کتاب ہے اس کا نام ''زادالمسافرین'' ہے اور وہ معقولات کی کتاب ہے، معقولات اور محسوسات۔محسوسات یہ ظاہری چیزیں جو ہم پانچ حواس کے ذریعے سے اُن کو پاتے ہیں اور معقولات وہ چیزیں جو ہم عقل کی قوتوں سے اُن کو پاتے ہیں ظاہری حواس کے ذریعے سے نہیں۔تو اِس کتاب کے اندر معقولات سے بحث کی گئی ہے اور وہ اعلیٰ درجے کے فلسفے کی، حکمت کی اور معقولات کی کتاب ہے۔اُس کے اندر ''کُن'' کے بارے میں بھی اور کس چیز کو خدا نے کُن فرمایا؟ اُس سے بھی بحث کی گئی ہے اور یہی سوال جو آپ نے منظّم الفاظ میں کیا ہے۔کہا ہے کہ کُن کس سے فرمایا گیا؟ کُن یعنی ہوجا، سامنے کوئی تھا یا پھر خدا نے یوں ہی نیستی سے Nothingness سے خطاب کیا کہ ''ہوجا'' اور فرماتے ہیں کہ اصل میں یہ Nothingness نہیں ہے وہ ایک نام ہے بلکہ ہستی دو حصّوں میں ہے ایک ہستی جو ہمارے سامنے ہے، وجود Existence یہ ہستی ہے اُس کو ہستی کہتے ہیں، دُوسری ہستی جس کا نام نیستی ہے لیکن وہ بھی ہستی ہے، وہ لطیف ہے کہ وہ نظر آنے والی نہیں ہے اور وہ کس قسم کی ہستی ہے؟ وہ ہے ''ابداع''۔ابداع کا مطلب یکا یک ایک چیز [کا] وُجود [جو] ظاہر [میں] موجود ہوتا ہے [مگر] ظاہر نہیں ہے، جیسے رُوح، جیسے خدا کا نور، جیسے خود خدا، جیسے جنّت یہ سب ہیں، لیکن ظاہر نہیں ہیں، تو خدا ایسی چیزوں کو ہمارے باطن کے اندر یا اِس دیدۂ ظاہر کے سامنے کُن فرماتا ہے تو اُن چیزوں کا ایک ظہور ہوتا ہے تو اِس کو کہتے ہیں کُن فرمانا، تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا نے جہاں کُن فرمایا تھا اور وہ جن چیزوں سے کُن فرماتا ہے وہ چیزیں Nothingness میں نہیں ہیں، یعنی نیستی میں نہیں ہیں بلکہ وہ باطنی صورت میں موجود ہیں تو اُن کا ظہور ہوتا ہے۔

اب اِس کو ایک واضح مثال میں پیش کریں تو مثال کے طور پر فرض کریں یہ دُنیا یہ کائنات نہیں تھی تو خدا نے اِس کو کُن سے ظہور میں لایا۔تو جو میں نے ابھی بیان کیا اِس کی روشنی میں اِس کا مطلب یہ ہوا کہ دُنیا نہیں تھی تو اِس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اِس کا کوئی نقشہ نہیں تھا، یہ رُوحانیت میں تو موجود تھی عالمِ امر جو ہمیشہ موجود ہے یہ ظاہری کائنات، بیرونی اور ظاہری عالم، بیرونی جہان موجود تھا لیکن عالمِ امر میں رُوحانی شکل میں تھا اور خدا نے اُس سے کُن فرمایا تو مطلب یہ ہے کہ وہ ابداع کی شکل میں عالمِ امر سے عالمِ خلق میں اِس کا ظہور ہوگیا۔تو اِس معنی میں خدا کا کُن فرمانا بجا اور صحیح ہوتا ہے اور دُوسری صورت میں اِس کے اندر کوئی منطق نہیں بنتی ہے کہ خدا نیستی سے کُن فرمائے جو چیز کچھ بھی نہیں ہے، نہ اُس چیز میں سننے کی قوت ہے، نہ سمجھنے کی طاقت ہے کچھ بھی نہیں ہے ایک ایسی چیز سے جو کچھ بھی نہیں ہے خدا کُن فرماتا ہے اور دیکھیں! اگر یہ ممکن ہے کہ خدا Nothingness سے کُن فرمائے اور وہ ایک دم سے چیز بن کر ظاہر ہوجائے تو اُس Nothingness کے مقابلے میں ہم کچھ چیز تو ہیں اور خدا ہمیں حکم دیتا ہے کہ ''ہوجا'' یہ کرو وہ کرو تو ہم اِس قدر جلدی سے کچھ چیز کیوں نہیں بن سکتے ہیں؟

جہاں خدا کے امر کے لئے یہ ممکن ہے کہ ایک نیستی یعنی کچھ بھی نہیں ہے، ایک فرضی چیز بھی نہیں ہے اُس سے جب خدا کُن کہتا ہے ہوجا کہتا ہے تو وہ چیز ہوجاتی ہے، تو اُس کے مقابلے میں ہم کو جو خدا فرماتا ہے کہ تم یہ کرو تو یہ بھی ایک طرح سے ہوجا فرمانا ہے، ہمیں بھی اِس معنی میں اِس سمت میں خدا [کُن] ہوجا فرماتا ہے اور بار بار [کُن] ہوجا فرماتا ہے تو ہم کیوں نہیں ہوتے ہیں۔

جب ہم کو بول دیا جاتا ہے تو اِس کے معنی یہ نہیں کہ خدا ہم کو کُن ''ہوجا'' فرماتا ہے، جب ہم کو اور کوئی حکم دیتا ہے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ہم سے کُن فرماتا ہے تو ہم کسی وقت بھی کُن یعنی ''ہوجا'' کی تعمیل نہیں کر سکتے ہیں تو پھر اُس طرف سے اگر وہ تصوّر جو اہلِ ظاہر سمجھتے ہیں صحیح ہو کہ جب خدا Nothingness کو کُن کہتا ہے تو وہ Nothingness ایک وُجود بن کر سامنے آتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہاں خدا کے امر و فرمان کا یہ پاوَر ہو اور یہاں خدا کے حکم کا یہ پاوَر ہو۔ بہر حال عالمِ امر سے عالمِ خلق میں جب کوئی چیز ظاہر ہوتی ہے تو اُس وقت خدا ''کُن'' فرماتا ہے اور اِس کُن کے بارے میں اور بھی کچھ باریکیاں ہیں اِس کے بارے میں میں نے میزان الحقائق میں تھوڑی سی وضاحت کی ہے اور وہ کُن کس طرح فرماتا ہے آیا وہ آٹو میٹک بات ہے یا کہ لفظی طور پر خدا کُن فرماتا ہے؟ تو اُس کا میں نے تذکرہ کتاب کیا ہے تو یہ آپ کے اُس سوال کا جواب ہے جو کہ کُن کے سلسلے میں کیا۔

اِن کا یہ سوال ہے اِن کا کہنا کہ اگر عالمِ امر بجائے خود خدا کے تصوّر کی طرح قدیم ہو تو یہاں پر دو ہستیاں نظر آتی ہیں، ایک خدا کی ہستی اور ایک وہ ہستی جو عالمِ امر کے عنوان سے ہے، تو جب دو ہستیاں ہیں تو دو پاوَرفُل چیزیں نظر آتی ہیں تو آتش پرست لوگوں نے بھی دو خداؤں کو مانا جس کو ثنویت کہتے ہیں تو اِس کے لئے کیا جواب ہے؟ میں نے اِن کے سوال کو دُہرایا۔ اِس سوال کے لئے جواب یہ ہے کہ اصل میں ہم دو تین قسم کے جواب دیں گے اور آخر میں جو اصل جواب ہے وہ بعد میں بتائیں گے۔ سب سے پہلے ہم یہ بتائیں گے کہ مان لیا جائے کہ عالمِ امر موجود ہے اور خدا بھی موجود ہے تو اُس میں Twoness یا Duality یا کہ دُوئی لازم نہیں آتی ہے، وہ یہ کہ جو عالمِ امر ہے وہ خدا کی بادشاہی ہے اور اُس کا نام خود امر ہے تو امر خدا کا ہے وہ خدا کے امر کے تحت ہے اور اِس لئے دُوئی یا کہ Twoness لازم نہیں آتی ہے۔ بلکہ اِس میں اور بھی زیادہ خدا کی تعریف اُجاگر ہوجاتی ہے کہ لوگوں کے عام نظریہ کے برعکس خدا کی سلطنت ہمیشہ ہمیشہ سے قائم ہے کہ عالمِ امر میں اُس کی سب قدرتیں اور اُس کی ساری کاروائی، کاریگری ہمیشہ سے موجود ہے اور ویسے بھی آپ علمِ شریعت میں جائیں اور دیکھیں تو وہاں بھی خدا کے علاوہ کئی چیزیں آپ کو نظر آئیں گی مثلاً خدا کا عرش یہ خدا کا عرش اِس قدر قدیم ہے کہ آپ اُس کی کوئی Beginning کو ثابت نہیں کر سکیں گے اور روایتوں اور قصّوں کے مطابق بھی دیکھا جائے تو کہتے ہیں کہ دُنیا میں کچھ بھی نہیں تھا اور اِس دنیا کے اندر پانی کا ایک بے پایان سمندر موجود تھا تو اُس وقت بھی خدا کا تخت پانی پر تھا، وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ (۱۱:۷) اور خدا کا عرش پانی پر تھا اور اگر عرش کو عالمِ امر قرار دیں جس کا ہم اب اِس وقت ذکر کریں گے تو بھی شریعت کے لحاظ سے یہ

صحیح ہے، اِسی طرح بہت ساری چیزیں ہیں قلمِ الٰہی ہے یا کرسی ہے عقلِ اوّل ہے وغیرہ۔ لیکن یہ چیزیں چونکہ خدا کے امر و فرمان کے تابع ہیں اِس لئے Duality کا تصوّر لازم نہیں آتا ہے۔ Duality کا تصوّر یا Twoness یا کہ دُوئی اُس [وقت یا اُس] معنیٰ میں لازم آتی ہے کہ [جب] ہم خدا کے برابر کی طاقت کو تسلیم کریں، جو اُس کے برابر کی طاقت ہو، جس طرح آتش پرست لوگ یہ کہتے ہیں کہ نور ایک طاقت ہے اور ظلمت ایک طاقت ہے یا کہ بُرائی کا خدا اہرمن ہے اور نیکی کا خدا یزدان ہے، تو ایک طاقت بُرائی کا سرچشمہ ہے اور ایک طاقت بھلائی کا سرچشمہ ہے وہ لوگ اِن دونوں طاقتوں کو برابر برابر تسلیم کرتے ہیں اِس واسطے لوگوں نے اِن کو دو خداؤں کو ماننے والے قرار دیا اور اُن کے تصوّر کو ثنویت کہا اور وہ ثنوی ہو گئے۔ اِس کے برعکس اِس سلسلے میں جس طرح اب خدا ہے اور اِس کی ظاہری اور باطنی بادشاہی ہے تو Twoness لازم نہیں آتی ہے تو اگر ہم بہت پہلے سے خدا کی ایک رُوحانی سلطنت کو مانیں، اُس کے عرش کو مانیں یا عالمِ امر کو مانیں تو Twoness لازم نہیں آتی ہے، یہ پہلا جواب ہوا۔

اب دُوسرا جواب یہ ہے کہ خدا نہ ہستی ہے اور نہ نیستی ہے، اگر ہم عالمِ امر کو مانیں تو ہم اُس کو ایک رُوحانی ہستی قرار دیتے ہیں ایک Spritual Existence یا Entity قرار دیتے ہیں لیکن خدا کو ہم ہستی اور نیستی سے بالاتر مانتے ہیں کیوں؟ اِس لئے کہ خدا Opposite نہیں ہے، کسی چیز کے مدِمقابل نہیں ہے، خدا نور نہیں ہے کیونکہ نور کے مقابلے میں تاریکی آتی ہے اور آپ سوچیں تو پتا چلے گا کہ ہمیشہ نور کا قیام ظلمت پر ہے اور نور کا انحصار تاریکی پر ہے، جس طرح کہ بلیک بورڈ پر جب ہم لکھتے ہیں تو اُس کے لیے سفید چاک چاہئے، اور سفید کاغذ پر جب ہم لکھتے ہیں تو کالی سیاہی سے لکھیں گے۔ اور بلیک بورڈ پر جب لکھیں گے اور کالی سیاہی سے لکھیں گے تو Opposite نہ ہونے کو وجہ سے اُس کی ہستی نہیں بنے گی اور نور کی ہستی ظلمت کی وجہ سے ہے جب ظلمت نہ ہو تو نور کا تصوّر نہیں اور جب نور نہ ہو تو ظلمت کا تصوّر نہیں، اسی طرح دُنیا کے اندر ظالم اگر ہے تو عادل ہے عادل اگر ہے تو ظالم ہے عادل کی پہچان ظالم سے ہے ظالم کی پہچان عادل سے ہے یہ اُس حدیث کے مطابق ہے جو پیغمبرؐ نے فرمایا کہ: تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا چیزوں کی شناخت اُن کی اضداد سے ہوتی ہے۔

تو اِس لئے خدا کو اگر وجود مانا جائے تو نیستی اُس کے مقابلے میں آئے گی اور حالانکہ خدا کا تصوّر ایسا [ہونا] چاہئے کہ وہ کسی چیز کے مدِمقابل میں نہ ہو اگر ہم خدا کو وُجود کہتے ہیں تو یہ ہمارا پہلا سبق ہے، خدا نے پیغمبر نے امام نے بزرگوں نے ہم کو بچوں کی طرح سمجھایا ہے، حالانکہ دیکھا جائے، تو خدا نور نہیں ہے، نور میں ہوں، نور آپ ہیں، نور امام ہے، ہم سب کی رُوحیں جہاں پر ایندھن کا کام دیتی ہیں اُس مرکز اور اُس سرچشمے کا نام نور ہے اور وہ [سرچشمہ] امامؑ ہے اُس نور میں ہم آپ بھی ہیں ایک ذرّے کی حیثیت سے ہیں، لیکن اُس بڑے درجے کو آپ خدا کہیں یا امام کہیں کچھ بھی کہیں وہ بعد میں دیکھیں گے لیکن ایک درجہ ایسا بھی ہے جہاں ہستی کا تصوّر نہیں ہے نہ وہ ہستی ہے نہ وہ نیستی ہے، ہستی اور نیستی Existence

اور Nothingness یہ دونوں چیزیں اُس کے تحت آتی ہیں وہ ہستی اور نیستی کا بادشاہ ہے۔اس لئے خدا نور نہیں ہے۔

امامؑ جو اُوپر کے درجے میں ہے اُس میں امام نور اِس معنی میں ہے کہ نور کے مقابلے میں ظلمت ہے جو شیطان ہے، شیطان ظلمت ہے امام نور ہے تو یہ دونوں Opposite ہیں، شیطان سے مُراد دُنیا زمانے میں ایسے لوگوں کی جمعیت جو دُنیا میں امامؑ کے خلاف کام کرتے ہیں وہ شیطان ہیں اور نور امامؑ ہے جو ہدایت کا سرچشمہ ہے اور خدا یا کہ امام کا وہ درجہ جو سب چیزوں سے بالاتر ہے اِس سے اُوپر ہے، آپ فی الحال اُس درجے کو خدا کہیں گے اور اُسی درجہ میں امام کو مانتے ہیں یا نہیں مانتے ہیں یہ تو الگ بحث ہے اِس کو نہیں اُلجھائیں گے۔تو یہ اِس سوال کا دُوسرا جواب ہُوا جو ہم نے کہا کہ اگر عالمِ امر Existence میں ہے تو پھر یہ خدا کے برابر بن کر Twoness لازم نہیں آتی ہے خدا وُجود سے اور نیستی سے بالاتر ہے، یہ دُوسرا جواب ہوَا اب تیسرا اور آخری جواب یہ ہے کہ خدا مونو ریلزم ہے اور مونو ریلزم میں کوئی دُوئی ممکن نہیں ہے یا کہ وہ ایک ایسی وحدت ہے جہاں پر ساری وحدتیں مدغم ہیں، [یعنی] ملی ہوئی ہیں اور وہ ایسی وحدت ہے جہاں پر ہماری بھی ایک وحدت ہے، تو اِس وحدت نے کثرت کو اور Twoness کو ختم کر دیا۔اب نہیں ازل میں اور ہمیشہ سے وہاں پر Twoness ختم ہے، اِس نظریے کے تحت جب میں الگ اور خدا الگ نہیں ہیں تو پھر Twoness کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور کثرت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے بُت پرستی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے، وہ ایک ایسا تصوّر ہے ایک وحدت ہے ایک Unity ہے جہاں ہم سب کی انائیں، ہم سب کی "I" میری خودی اور آپ کی "I" اور ہم سب کی "I" سب کی خودی اُردو میں اور عربی میں "انا" [کہتے ہیں] میری انا آپ کی انا، اِن کی انا ہم میں سے ہر ایک کی انا، انا معنی مَیں جس حقیقت کو مَیں کہا جاتا ہے وہ خدا میں ہے بلکہ خدا بھی اُس Unity میں ہے اُس وحدت میں ہے کہ وہ وحدت بے مثال ہے وہ ایک حقیقت ہے جو سب حقیقتوں کی نمائندگی کرتی ہے وہ ایک حقیقت ہے جس میں سب حقیقتیں ہیں اُس میں سب حقیقتیں واپس لَوٹ کر نہیں [آتی] ہیں بلکہ ازلی طور پر اور ہمیشہ سے ہیں ہم اُس "I" کے لحاظ سے کب خدا سے الگ ہو گئے ہیں، نہیں ہوئے بالکل نہیں ہوئے۔اِس سلسلے میں قرآن کے اندر کئی آیات ہیں لیکن اُن کو بہت ہی ہوشیاری سے اور باریکی سے سمجھنے کا ہے۔

سوال دراصل ایک ہی فرد کے اندر بہت سی رُوحوں کی امکانیت کے بارے میں ہے، [اِسے] بنیادی سوال میں سمجھتا ہوں۔یہ بات صحیح ہے رُوحانیت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ایک انسان کے اندر رُوحانیت کی ایک کائنات ہے اور اُس کے اندر پوری کائنات میں جتنے نفوس ہیں اتنی رُوحیں پائی جاتی ہیں، حالانکہ رُوح اصل میں ایک ہے لیکن جسمِ لطیف کے ذرّات کی بدولت یہی رُوح جو تقسیم نہیں ہوتی ہے اِس لطیف جسم و ذرّات کی وجہ سے تقسیم ہو جاتی ہے، جس طرح کہ سورج تقسیم نہیں ہو سکتا ہے لیکن دُنیا میں جتنے افراد ہیں وہ ایک ایک آئینہ سامنے رکھیں تو اُن تمام آئینوں میں سورج کا عکس پڑے گا Reflection ہوگا اور جس کی وجہ سے اتنے ہی سورج نظر آئیں گے جتنے کہ آئینے ہیں، جتنے کہ افراد ہیں اِس معنی

میں سورج تقسیم ہوا اور حالانکہ فی ذاتہٖ فی نفسہٖ تقسیم نہیں ہوسکتا تھا تو رُوح کی بھی یہ بات ہے، رُوح بسیط ہے وہ مرکّب نہیں، Composed نہیں ہے، لیکن جہاں ایک لطیف جسم کے ذرّات اُس کو الگ الگ Catch کرتے ہیں اُس نسبت سے لاتعداد رُوحیں بنتی ہیں اور سائنس نے بھی ثابت کیا ہے کہ ہمارے جسم کے اندر Cells ہیں، کمرے ہیں اور ہر Cell کے اندر ہزاروں کی تعداد میں رُوحیں ہیں اور ایک شخص جب رُوح کے مشاہدے کے مقام تک پہنچتا ہے تو وہ رُوحوں کی ایک بھرپور دُنیا دیکھتا ہے، تب ہی تو رُوحوں کے زیادہ ہونے اور کثرت سے رُوحوں کے ہونے کی بات ہوگئی۔ اب وہ سوال جو قرآن کی روشنی میں ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ سے کہا کہ: میرے گھر کو پاک و پاکیزہ رکھنا تین قسم کی رُوحوں کے لیے تو یہ تین قسم کی رُوحیں ہم نے یہیں سے تسلیم کیا ہے جو آیت کے اندر ہے: عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَٰعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلْعَٰكِفِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ (۲:۱۲۵)، اِس میں ایک قسم کے لوگوں کے تین کام کرنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ الگ الگ تین قسم کے گروہوں کا ذکر ہے طَهِّرَا بَيْتِىَ میرے گھر کو پاک رکھنا (۱) لِلطَّآئِفِينَ اِس کے گرد طواف کرنے والوں کے لیے (۲) وَٱلْعَٰكِفِينَ اور اعتکاف کر کے اُس کے اندر مستقیم اور مستقل رہ کر عبادت کرنے والوں کے لئے (۳) وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ اور رکوع و سجود کر کے پھر چلے جانے والوں کے لئے۔

تو ظاہری طور پر دیکھا جائے تو خانہ کعبہ سے متعلّق یہ بات ہم کو ملتی ہے سب سے پہلے، ایک تو کُچھ لوگ اِس کے گرد اگرد طواف کر کے چلے جاتے ہیں، ایک وہ ہیں جو وہاں خدمت کرتے ہیں اُس کے اندر اپنی مسجد جیسی بنا کر اپنا گھر جیسا بنا کر خدمت بھی کرتے ہیں اور اُس میں لگے ہوئے ہیں اُس کے اندر رہتے ہیں وہ عاکِفین کی مثال ہے اور تیسرے وہ لوگ ہیں جو کہ وہاں اُس کے اندر عبادت بندگی کر کے پھر چلے جاتے ہیں، اِسی کے مطابق اِسی تاویل کے مطابق جماعت خانہ کے اندر دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ تین قسم کی رُوحیں ہیں، کچھ رُوحیں ایسی ہیں کہ اُن کو جماعت خانہ کے اندر آنے کی البتہ اجازت نہیں ہے، وہ صرف جماعت خانہ کے گرد اگرد طواف کرتی ہیں، چلی جاتی ہیں، کچھ رُوحیں ایسی ہیں جو جماعت خانہ کے اندر لگی ہوئی ہیں ہمیشہ سے ہیں اور کچھ رُوحیں ایسی بھی ہیں کہ جماعت خانہ میں آتی ہیں اور خدا کے لئے عبادت و بندگی کر کے چلی جاتی ہیں تو یہ تین قسم کی رُوحیں جماعت خانہ کے اندر ہیں اور اسی طرح خانہ کعبہ میں بھی اور اِسی کے مطابق انسان کے اندر بھی یعنی تین قسم کی رُوحانی طاقتیں ہیں کچھ طاقتیں مستقل ہیں، انہیں طاقتیں مانیں یا کہ رُوحیں مانیں اور کچھ رُوحیں آ کر پھر چلی جاتی ہیں، یا کہ کچھ رُوحیں ایسی ہیں کہ قریب آتی ہیں اور داخل نہیں ہوتی ہیں تو یہ ایک تاویل ہے مشاہدے کی چیز نہیں ہے جس کے مطابق ہم نے اُس آیت میں سے اِن تین الفاظ کو لیا تھا۔

وَإِذْ جَعَلْنَا ٱلْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَٱتَّخِذُوا۟ مِن مَّقَامِ إِبْرَٰهِـۧمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَٰعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلْعَٰكِفِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ (۲:۱۲۵)، اور ہم نے عہد لیا ابراہیم اور اسماعیل

کے ساتھ، اِس بات کا عہد لیا کہ وہ دونوں میرے گھر کو پاک و پاکیزہ رکھیں طواف کرنے والوں کے لئے اور رُکوع وسجود کرنے والوں کے لئے اور اِعتکاف کرنے والوں کے لئے، تو اِس میں اعتکاف الگ ہے، رُکوع وسجود کی بات الگ ہے اور طواف کا جو ادب ہے وہ الگ ہے، بہرحال یہ ایک تاویل ہے۔

زمانۂ آدمؑ سے لے کر آنحضرتؐ کے دَور تک اور آنحضرتؐ کے عہدِ مبارک سے اب تک اور قیامت تک دیکھا جائے تو ہم کو ایک [ہی] چیز نظر آتی ہے، ایک حقیقت نظر آتی ہے وہ بڑی ٹھوس حقیقت ہے اور وہ ایک ہی شان سے اور ایک ہی طرح سے نظر آتی ہے وہ عبادت کا طریقہ ہے، وہ ریاضت ہے، وہ محنت ہے جس میں مومن کی کامیابی ہے۔ کہنے کا مقصد تو یہ ہے کہ جب بھی رُوحانی ترقی کی ضرورت ہوئی تو اُس میں ریاضت سے کام لیا گیا محنت سے کام لیا گیا، اور محنت ہی کامیابی کی کلید ہے۔ محنت کے بغیر کبھی کامیابی نہیں ہوئی اِس لئے یہ لازمی ہے کہ رُوحانی ترقی کے لئے محنت کی جائے، یہ کیوں ایسا ہے کہ محنت کرنی پڑتی ہے؟ آرام آرام سے کامیابی کیوں حاصل نہیں ہوتی ہے؟ یہ ایک سوال ہے۔ عبادت کے دوران عبادت کے سلسلے میں سخت محنت کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے اِس کی کیا وجہ ہے؟ اِس کا کیا سبب ہے کہ انسان جب آرام سے عبادت کرتا ہے راحت سے عبادت کرتا ہے، آسائش سے بندگی کرتا ہے تو وہ [عبادت] کامیاب نہیں ہوتی ہے اور اُس میں ہر وقت ریاضت اور محنت کا تقاضا رہتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے سامنے دو مخالف طاقتیں ہیں ایک تو نفس امّارہ ہے اور دُوسری عقل ہے، لیکن نہیں معلوم اِس کی وجہ کیا ہے کہ انسان اکثر نفس کی طرف مائل رہتا ہے، اُسی کو ترجیح دیتا ہے اُسی کی پرورش کرتا ہے اور عقل کی فرمائش کو پسِ پشت ڈالتا ہے، جس کی وجہ سے نفس روز بروز قوی ہوتا جاتا ہے اور قوی سے قوی تر ہوتا ہے، مضبوط ہوتا [جاتا] ہے، اور پھر نتیجے کے طور پر عبادت کے دوران زیادہ زور لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے، کیونکہ نفس جب سامنے ہے تو پھر رُوح الایمان یا کہ عقل کو کوئی موقع نہیں ملتا کہ وہ اپنی غذا حاصل کرے اور کامیاب ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ مومن کو ہمیشہ محنت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ قرآن کے اندر دیکھا جائے تو مختلف معنوں میں نفس کی سختی اور صَلابت کا ذکر آیا ہے یعنی نفس کس طرح قوی ہو جاتا ہے، نفس کس طرح ایک اژدہے کی شکل اختیار کرتا ہے، اِس کے بہت سے اشارے قرآن میں موجود ہیں۔ کتابِ الٰہی میں کبھی تو یہ فرمایا گیا ہے کہ "دل کے گرداگرد ایک غلاف بن جاتا ہے" (۵:۴۱)۔ کبھی ارشاد ہوا ہے کہ "دل اندھا ہو جاتا ہے" (۴۶:۲۲)۔ کبھی کہا گیا ہے کہ "دل سخت ہو جاتا ہے پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے" (۷۴:۲)۔ تو یہ سب نفس کی باتیں ہیں اور [اِس میں] نفس کی مذمّت ہے۔

سوال ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم نے ایک ایسی مخالف طاقت ہمارے باطن میں کیوں پیدا کر دی جس کی وجہ سے ہم اکثر عبادت میں ریاضت میں ناکام ہو جاتے ہیں؟

تو اِس کا جواب یوں ہے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو انسان کی کوئی فضیلت نہ ہوتی اُس کو کوئی اجر وصلہ نہیں ملتا، اُس

سے کوئی آزمائش نہیں ہوتی، اُس کا کوئی امتحان نہ ہوتا، تو مومن کا جہاد اُس وقت ہوتا ہے، جب اُس کے سامنے کوئی قوی دشمن ہو اور وہ قوی دشمن جس کو ہلاک کرنا چاہئے نفسِ امّارہ ہے۔ دیکھا! آپ نے کہ تمام پیغمبروں کے زمانوں میں اِس بات پر زور دیا گیا ہے کہ نفس کی مخالفت کی جائے، نفس کے خلاف عمل کیا جائے، نفس کی خواہشات کے خلاف عمل کیا جائے اور دین کے اندر جتنے [بھی] احکام ہیں اُن تمام احکام میں بس یہی ایک فلسفہ ہے کہ عقل کے موافقت میں کام کیا جائے اور نفس سے دشمنی رکھی جائے، نفس کے خلاف عمل کیا جائے۔ لیکن اِس کے باوجود نفس اپنا کام کرتا ہے اور اپنے کام کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وجہ اِس کی یہ ہے کہ نفس ہمارے وجود میں ہے، ہمارے باطن کے اندر ہے اور اِس لئے کہ نفس کی جو خواہشات ہیں وہ بڑی میٹھی ہیں، بہت ہی شیرین ہیں۔ نفس جو کچھ کہتا ہے وہ اِس طرح سے کہتا ہے کہ ہم کو اُس کا کہنا بُرا نہیں لگتا، بہت ہی اچھا لگتا ہے، بہت ہی میٹھی آواز میں اور طرح طرح کے بہانوں کے ساتھ وہ ہم پر حکومت کرتا ہے۔ اُس کے پاس بہت سے حِیلے، بہانے ہوا کرتے ہیں، مثال کے طور پر بچپن میں نفس ہم کو یہ کہہ کہ بہلاتا ہے کہ ابھی تم چھوٹے ہو ابھی تو تمہارے جسم کی نشوونمائی کا زمانہ ہے اور ناز ونعمت میں پلنے کا وقت ہے، عبادت کی کیا ضرورت ہے، عبادت کے لئے آگے بہت وقت ہے۔ یوں کہہ کر دین اور ایمان اور عبادت سے ہم کو روکتا ہے، جب نوجوانی کا وقت آتا ہے تو نفس جو ایک حِیلہ گر ہے، جو مکّار ہے وہ کہتا ہے کہ اب تو جوانی کے ایام ہیں، جوانی کا زمانہ ہے اِس میں آرام کرو راحت پاؤ [حاصل کرو] کچھ تو دُنیا کی نعمتوں میں سے کھاؤ پیو، آگے چل کر دیکھا جائے گا، خدا کی رحمت بہت وسیع ہے وغیرہ اور پھر اِسی طرح بھرپور جوانی میں بھی یہ طرح طرح کے بہانوں سے انسان کو نیکی سے روکتا ہے۔ گویا وہ مہلت دیتا ہے اور آگے چل کر یکایک انسان پر بڑھاپے کا وقت آتا ہے پھر نفس کہتا ہے کہ آج ذرا آرام کرو تھوڑی سی تکلیف ہے، سردی لگی ہے یا گرمی ہے یا فلاں بیماری ہے پھر اُس کے بعد دیکھا جائے گا، اِسی طرح نفس پھر اُس وقت کے مطابق اپنے لئے ایک حِیلہ بناتا ہے، ایک بہانہ بناتا ہے، کرتے کرتے نفس انسان کو قبر میں ناکامی کے ساتھ سُلا دیتا ہے۔

تو دیکھا! آپ نے کہ نفس کیا ہے اور اُس کے تقاضے کیسے ہیں، اُس کا کام کیسا ہے اور کتنا [بڑا] دشمن ہے اِسی لئے خداوندِ عالم نے قرآنِ پاک میں نفس کی بہت کچھ مذمت کی ہے اور اسی لئے رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: اَعدیٰ عَدُوِّكَ نَفسُكَ الّتی بَینَ جَنبَیك، دشمنی کرو اپنے اُس دشمن سے جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان رہتا ہے۔ یعنی نفسِ امّارہ، دیکھا آپ نے کہ نفس کتنا ظالم ہے، کیسا قوی دشمن ہے اور وہ کیسے کیسے بہانے تراشتا ہے۔ اِس کے لئے دانا مومن ہوشیار رہتا ہے ہر وقت باخبر رہتا ہے اور جس قدر ہو سکے وہ نفس کے خلاف عمل کرتا ہے وہ نفس کے حِیلوں سے، بہانوں سے آگاہ ہے، اِس لئے جس قدر بھی ہو سکے مومن نیکی کرتا ہے اور جتنی بھی ہو سکے وہ مولا کی یاد سے رُوحانی دولت کو کماتا ہے، عبادت، بندگی، معرفت، نیک صحبت، اچھے خیالات اور خداوندِ عالم کی نعمتوں کی شکرگزاری، خدا کی تعریف، خدمت

کی آرزو اور حصولِ علم کا جذبہ اور اچھے مومنین کی رُوحانی ترقی پر رشک اور اپنی خطاؤں پر ندامت اُٹھانا، اِسی قبیل کے نیک کاموں اور نیک خیالات سے مومن اپنے ایمان میں نیکی میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ تو دانشمند مومن آگاہ رہتا ہے کہ یہ دُنیا ہے اور اِس دنیا کے اندر نیک کمائی کرنی ہے، نیکی کمانا ہے، اعمالِ صالح انجام دینے ہیں تا کہ یہ جو مختصر سی مہلت دی گئی ہے اِس سے خوب فائدہ اُٹھایا جائے اور پھر پشیمانی نہ ہو، مومن قیامت کے دن نہ پچھتائے کہ اُس نے دُنیا کے اندر نیک کام نہیں کیا، عبادت نہیں کی اِس کے لئے وہ باخبر رہتا ہے۔

تو انسان کے اندر جو نفس ہے وہ ایک مجموعہ ہے مختلف عناصر کا یعنی نفس کے اندر ایک عنصر ایسا بھی ہے جو کتّے کے مشابہ ہے، یعنی نفس کے اندر مختلف عناصر ہیں، نفس کی ساخت، نفس کی بناوٹ، نفس کا مجموعہ کئی کئی عناصر سے ہے۔ تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس نفس کے اندر ایک عنصر مردُم آزاری کا بھی ہے، نفس کے اندر جو مردُم آزاری کا جو عنصر ہے وہ کتّے کے مشابہ ہے وہ کتّے کی طرح ہے۔ نفس کے اندر ایک اور عنصر ہے جو خرگوش کی طرح ہے وہ خواب ہے وہ نیند ہے، یعنی نفس کے اندر جو نیند کا تقاضا ہے، جو نیند کا نشہ ہے وہ خرگوش کے مشابہ ہے کیونکہ دُنیا کے اندر نیند کے لحاظ سے خرگوش مشہور ہے وہ بہت سوتا ہے، وہ حرام خوری کا عنصر ہے، نفس ایک مجموعہ ہے۔ بہت سی برائیوں کا اور اِس لئے میں نے کہا کہ نفس کے اندر مختلف عناصر ہیں، نفس کے اندر ایک اور عنصر ہے جو سانپ کے مشابہ ہے یعنی سانپ کی طرح ہے وہ کینہ/ کینے کا عنصر ہے، سانپ کینہ رکھتا ہے، نفس کے اندر ایک عنصر گائے کا بھی ہے، نفس میں جو عنصر گائے کا ہے یا گائے سے متعلّق ہے یا گائے سے مشابہ ہے وہ کھانے پینے کی خواہش ہے، یعنی نفس کے اندر جو کھانے پینے کی خواہش ہے وہ گائے کا عنصر ہے، نفس کے اندر ایک اور عنصر ہے جو چیونٹی کے مشابہ ہے اور وہ طمع ہے، یعنی نفس میں جو طمع ہے، طمع بھی نفس کی ایک خاصیت ہے وہ چیونٹی کے مشابہ ہے۔ آپ نے کبھی سوچا ہوگا جب صبح ہوتی ہے تو صبح ہونے سے پہلے چیونٹی اپنے سوراخ سے نکلتی ہے اور پھر وہ چلتی ہے، پھرتی ہے، چلتی ہے پھرتی ہے کچھ کمانے کے لئے اور اپنے سوراخ میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں جمع کرنے کے لئے وہ چیونٹی چلتی رہتی ہے پھرتی رہتی ہے، چلتی رہتی ہے پھرتی رہتی ہے۔ لہٰذا علم نے اُس کو طمع مجسم قرار دیا ہے، یہی ایک چیونٹی طمع کی مظہر نہیں اور بھی بہت سے جانور ہیں مثلاً میں نے کہا سوّر یہ بھی حرص ہے اور بطخ وہ بھی حرص ہے اور اِسی طرح نفس کے اندر اور بھی بہت سے عناصر ہیں اُن تمام عناصر کے مجموعے سے نفس کو بنایا گیا ہے تو پھر کس طرح مومن ایسے نفس کو جو بہت سے بُرے عناصر سے بنایا گیا ہے اُس کو کس طرح شکست دے سکتا ہے، یہ بہت سخت کام ہے تو علم ہی ایک چیز ہے جو کہ مشکل کام کو آسان بنا دیتا ہے، مومن کو ہر چیز کی شناخت ہو، ہر چیز کی پہچان ہو اور ہر چیز کی خبر ہو تو شاید وہ اِس آگہی، اِس واقفیت اور اِس علم کے ذریعے سے اپنے کام میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

کیا آپ نے کبھی نہیں سوچا ہے کہ انسان کے اندر جو بچگانہ عادتیں بھی ہیں یعنی مثلاً انسان خواہ کتنا بڑا کیوں نہ ہو اُس

کے اندر بچگانہ عادتیں بھی ہیں، مثلاً رُوٹھنے کی، ناراض ہونے کی اور غصّہ کرنے کی [عادتیں] وغیرہ وغیرہ، جس طرح بچے کی عادتیں ہوتی ہیں، اِس کی وجہ کیا ہے؟ ہم میں سے ہر ایک اِس عمر میں بچہ تو نہیں ہے پھر بھی ہمارے اندر بچگانہ عادتیں کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس کے اندر مختلف عناصر ہیں اُس میں سے کچھ ایسے شریر بچوں کے عناصر بھی ہیں وہ عناصر ہم کو ستاتے ہیں ہم کو اُکساتے ہیں۔ کسی عالم نے کہا ہے کہ انسان کیا ہے؟ پتہ نہیں ہے، کیونکہ انسان کے اندر بہت سی چیزیں ہیں بہت سے جانور ہیں بہت سی مخلوقات ہیں، فرشتہ سے لے کر حیوان تک، کیڑے مکوڑے تک اور مختلف انسانوں کی عادتیں وغیرہ یہ سب کچھ انسان کے اندر ہیں تو اِن تمام چیزوں میں سے انسان کون سی چیز ہے، یہ تو اُس وقت پتہ چلے گا کہ انسان کس چیز کی طرف زیادہ مائل ہے، اگر انسان نیکی کی طرف مائل ہے تو فرشتہ ہے اگر انسان اِن مذکورہ چیزوں میں سے کسی ایک چیز کی طرف زیادہ جُھکتا ہے تو وہ انسان وہی چیز ہے، مثلاً انسان چاہے تو کتّا بن سکتا ہے اِسی صورت میں، چاہے تو اونٹ بن سکتا ہے، چاہے تو چیونٹی بن سکتا ہے، چاہے تو گائے بن سکتا ہے، چاہے تو خرگوش بن سکتا ہے، چاہے تو لومڑی بن سکتا ہے اور چاہے تو بھیڑیا بن سکتا ہے، چاہے تو وہ گدھا بھی بن سکتا ہے [اور] چاہے تو وہ فرشتہ بھی بن سکتا ہے۔

اِس لئے کہ انسان کے اندر بہت سے عناصر ہیں اور بہت سی چیزیں ہیں، بہت سی خصوصیات ہیں تو اِس لئے مومن کو خود شناسی کے سلسلے میں باخبر ہونا چاہئے، نفس کے فریبوں سے آگاہ ہونا چاہئے کہ نفس کس مجبوری سے ہم کو ستاتا ہے اُس کے اندر کیا چیز ہے، تو دنیوی طور پر ہم کسی چیز میں سے کوئی Taste محسوس کرتے ہیں تو اُس کی کوئی وجہ ہے، اُس میں کوئی جُزو ہے کوئی چیز ہے جس کی وجہ سے یہ Taste آرہا ہے، اِسی طرح ہمارے نفس کے اندر مختلف قسم کی عادتیں اِس لئے ہیں کہ نفس کو مختلف عناصر سے، مختلف اجزاء کو باہم ملا کر بنایا گیا ہے۔ اِس لئے اِس کو نا کام بنانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور اگر کوئی دانشمند اِس کو نا کام بنانا چاہتا ہے تو اِس کی تحلیل کرنی چاہئے، اِس کی شناخت کرنی چاہئے اور پھر آہستہ آہستہ اُس کے خلاف عمل شروع کرنا چاہئے، مثلاً مومن کو چاہئے کہ وہ بعض دفعہ اپنی عادتوں کو Check کرے۔ اگر مومن کی یہ بصیرت ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو سمجھتا ہے تو اُس کی یہ خوش نصیبی ہے، ایسے میں اصلاح کی اُمید ہے کہ خود کو وہ پہچانتا ہے، اُس کی نگاہ پہنچتی ہے اپنے عیوب تک تو پھر چارہ ہونے، کی علاج ہونے کی بھی توقع ہے، اگر انسان اپنے عیوب سے اپنی کمزوریوں سے اندھا ہے، کہتا ہے کہ میرا جو کچھ ہے سب ٹھیک ہے، تو اُس کو کہتے ہیں اندھا ہو جانا، رُوحانی ترقی میں سب سے پہلی بات یہ ہونی چاہئے کہ انسان کو اپنے عیوب اپنی کمزوریوں کی خبر ہو، احساس ہو کہ اُس میں کیا کمی ہے، کیا غصّہ ہے، کیا کینہ ہے، کیا غیبت کرنے کی عادت ہے، کیا ایک دم سے وہ ناراض ہو جاتا ہے یا وہ خوش نہیں ہے، وغیرہ۔ تو اِن چیزوں پر بڑی فراخ دلی سے سوچنا چاہئے، تنہائی میں سوچنا چاہئے، بار بار سوچنا چاہئے اور اگر خوش قسمتی سے مومن کی نظر میں اپنی کمزوریاں

آتی ہیں [یا] واضح ہو جاتی ہیں تو پھر ایک ایک کر کے اُن کمزوریوں کو دُور کرنے کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔

بعض تصوّف کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جو کامیاب صوفی ہیں جو رُوحانی ترقی کرنے والے ہیں وہ ایک چھوٹی سی لسٹ بناتے ہیں اور اُس لسٹ کو خفیہ رکھتے ہیں اور اُس لسٹ میں ایسے کامیاب مومن جن کو ترقی عزیز ہے، جو اپنی اصلاح چاہتے ہیں وہ اپنی کمزوریوں کو اپنی بُری عادتوں کو درج کرتے ہیں اور پھر ہفتہ [یا] ایک مہینہ تک کسی ایک چیز کو یا چند چیزوں کو پیشِ نظر رکھ کر اُن کو کم کرنے یا ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ہر بار یہ کوشش کرتے ہیں اور اِسی طرح وہ اپنے آپ کی اصلاح کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر غصّے کی مثال لیجئے، غصّہ! تو غصّہ کو خداوند نے کیوں پیدا کیا؟ ٹھیک ہے جس طرح میں نے کہا کہ یہ نفس کے عناصر میں سے ایک عنصر ہے، نفس کے اجزاء میں سے ایک جُز ہے اور پھر بھی سوال ہو کہ یہ کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ تو جواب ہے کہ اِس میں حکمت ہے، غصّہ ہے تو اُس کے استعمال کے لئے ایک موقع بھی ہے، آپ غصّے کو دینی غیرت کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں، دینی دشمن کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں اور اپنے ماتحتوں کی اصلاح کے طور پر اِس کو استعمال کر سکتے ہیں لیکن اُس میں یہ ہو کہ اُس میں اصلاح مُراد ہو، خیر خواہی ہو اور اُو پر اُو پر سے غصّہ ہو، دل میں اُس کو جگہ نہ دی جائے اُور اس کو ایک اوزار یا ہتھیار کے طور پر استعمال کر کے اُس سے اصلاح کی جا سکتی ہے اور اپنے ماتحتوں پر اُس کو استعمال کر کے یا گھر کے افراد میں بہت منظّم طور سے اور بہت ہی احتیاط سے کہ حدِّ اعتدال سے تجاوز نہ ہو یعنی حد سے زیادہ نہ ہو اور اِس طرح سے نہیں کہ کینہ کے ساتھ اور بُرائی کے ساتھ [ہو]، تو یہ سوال اِس لئے پیدا ہوا جو میں نے خود کہا تھا کہ اِس غصّہ کے پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے۔

آپ نے یہ سُنا ہے کہ اللہ کا بھی غصّہ ہے لیکن آپ کو جاننا چاہیئے کہ اللہ کے غصّے میں اور بندے کے غصّے میں بڑا فرق ہے، اللہ کے غصے میں بہت حکمت ہے، اُس میں بہت صلاح ہے، صلاح معنی بہت بہتری ہے لیکن اللہ کے غصّے سے متعلّق یہ تصوّر کبھی نہ ہو جو سوچا جائے کہ اللہ بھی ہماری طرح غصّہ کرتا ہے کہ ہم جب غصّہ کرتے ہیں تو آگ بگولا ہو جاتے ہیں اور ہمارا چہرہ جو ہے وہ بھی بگڑ جاتا ہے اور بس غصّے سے ہم ہانپتے کانپتے ہیں اور اتنا غصّہ ہو جاتے ہیں کہ ہمارا باطن غصے سے بھر جاتا ہے، ایسا نہیں ہے۔ دُنیا کا کوئی حکیم اِس طرح کا غصّہ نہیں کرتا ہے وہ پُرحکمت غصہ کرتا ہے کہ اُو پر اُو پر سے وہ غصّہ ہوتا ہے لیکن اُس کے دل کے اندر وہ غصّہ نہیں ہوتا ہے، اگر مردِ حکیم کے دل کے اندر غصّہ ہو تو اُس کو دُکھ ہو جائے گا غصّے کے اندر دُکھ ہے، جاہلانہ غصہ نہیں، حیوان کی طرح غصّہ نہیں، حیوان میں بھی غصّہ ہے، کتّے میں کتنا غصّہ ہے، گائے میں بھی غصّہ ہے، گھوڑے میں بھی غصّہ ہے، ہر جانور میں غصّہ ہے کیونکہ غصّہ جو ہے وہ نفسِ حیوانی سے ہے، تو پھر کیا خدا میں بھی اِس طرح کا غصّہ ہے؟ کہا جاتا ہے کہ خدا کا غضب ایسا نہیں ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے نام ہیں اُن میں آپ تلاش کریں کسی ایک نام میں ایسا غصّہ نہیں ہے،

اگر قہار ہے وہ بھی غصّہ نہیں ہے، جبّار وہ بھی غصّہ نہیں ہے، غصّے کا کوئی نام نہیں ہے، تو غضب اور غصّہ کو جب اللہ سے منسوب کرتے ہیں تو اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ قانون ہے، اللہ کا جو قانون ہے اُس کے اندر غصّے کی مثال ہے، اُس میں رحمت کی مثال ہے غصّے کی مثال ہے سب کچھ ہے۔

قانون کیا ہے؟ مثلاً ایک انسان قانونِ قدرت کے خلاف کام کرتا ہے تو وہ خدا کے غصّے سے دو چار ہو جاتا ہے یعنی اُس کو سزا مل جاتی ہے بس غصّہ کچھ اِس طرح سے ہے، ایسا نہیں کہ غصّے سے خدا کا چہرہ اور حُلیہ بگڑ جاتا ہے اور آگ بگولا ہو جاتا ہے یہ بات نہیں ہے خدا کے متعلّق کچھ اِس طرح کا تصوّر صحیح نہیں ہے۔ تو آئیے! پھر مردِ حکیم کے غصّے اور ایک جاہل کے غصّے میں کتنا فرق ہے، ایک حلیم الطّبع انسان اور ایک عام انسان کے غصّے کے درمیان کتنا فرق ہے۔ اِن تمام باتوں کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ غصّے میں حکمت ہے اور اُس سے ہم فائدہ لے سکتے ہیں اور اُس کو ایک چیز، ایک ہتھیار، ایک اوزار بنا کے استعمال کر سکتے ہیں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ انسان کے اندر مختلف طاقتیں ہیں اور مختلف کمزوریاں بھی ہیں، کبھی غصّے سے انسان Uncontrolled ہو جاتا ہے اور اِس سے آگے چل کر بڑی عمر میں بہت ہی تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا دین دَوا ہے، دین علاج ہے، دین میں شفا ہے اِس دنیوی زندگی کے لئے بھی اور آخرت کے لئے بھی، لہٰذا عبادت و بندگی اور اخلاق کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اُس میں راحت ہی راحت ہے۔

مجھے کہنا چاہئے کہ بڑی عمر کے لئے انسان کو سوچنا چاہئے، جوانی کا وقت کسی طرح سے گزر جاتا ہے کچھ نفسیاتی دباؤ اور غصّے کا اور کسی اور چیز کا دباؤ کم ہوتا ہے، ہر چیز برداشت ہو جاتی ہے، جب جسم میں سے خون کی کمی ہوتی ہے، گوشت میں کمی واقع ہوتی ہے تو اُس وقت انسان توازن کو برقرار نہیں رکھ سکتا ہے، اُس کا دماغی اور اخلاقی، نفسیاتی توازن بگڑ جاتا ہے، پھر وہ یا تو بہت باتونی ہو جاتا ہے یا غصّے والا ہو جاتا ہے یا وہ بہت شکایت کرنے والا ہو [جاتا] ہے اور کوئی نہ کوئی اُس میں خرابی اُبھر آتی ہے، اِس کے لئے ڈرنا چاہئے۔ آپ نے کبھی دیکھا ہوگا کہ کچھ بڑی عمر کے لوگ مرد، عورتیں ایسے ہو جاتے ہیں کہ آپ اُن کو نہیں چاہتے ہیں کسی بھی وجہ سے۔ اِس معنی میں نہیں چاہتے ہیں کہ وہ بالکل غصّہ والے ہو جاتے ہیں۔ بہت غصّے والے، جھگڑا کرتے ہیں۔ بہت زیادہ باتیں کرتے ہیں، کسی کی غیبت شکایت کرتے ہیں یا اپنے آپ کی تعریف کرتے ہیں اپنی زندگی کے کارنامے جتلاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں وقت میں یہ کیا وہ کیا یا ایسے ہوتے ہیں کہ وہ حرص والے ہوتے ہیں یا ایسے [ہوتے] ہیں کہ وہ غمگین ہو جاتے ہیں، آپ ذرا تجربے کے لئے سوچیں! دیکھیں! تو پھر اگر یہ باتیں صحیح ہیں تو آپ ڈریں اور ڈرنے کے نتیجے میں آپ اپنے لئے ایک مقام تلاش کریں خدا کے حضور میں ایک مقام حاصل کریں، ایک پُر امن جگہ لیں تا کہ آپ کو ضمانت ملے، خدا کے حضور میں ایک مقام حاصل کریں، ایک پُر امن جگہ لیں تا کہ آپ کو ضمانت ملے اور ہر طرح سے آپ دُنیا اور آخرت میں امن سے رہ سکیں۔

لیکن میں یہاں پر ایک چیز بتاؤں جو بہت ضروری ہے، رسول اللہؐ نے کبھی اِن ذیلی باتوں کی تشریح نہیں کی، دین کے اندر جسمانی تکلیفیں اِس طرح سے آئیں گی اور یہ ہوگا وہ ہوگا کوئی تشریح نہیں۔ اِس میں حکمت ہے، پیغمبر نے سب سے جو اعلیٰ مقصد ہے وہ بتایا جو اُس کے نیچے دُوسرے فائدے ہیں وہ نہیں بتائے اور سب سے بڑے نقصان کو بتایا، اُس کے نیچے جو چھوٹے نقصانات ہیں وہ نہیں بتائے تو یہ جاننا چاہئے کہ پیغمبرؐ نے کبھی ذیلی نقصانات کو نہیں بتایا اور ذیلی فوائد کو نہیں بتایا، سب سے بڑے نقصان کو بتایا اور سب سے بڑے فائدے کو بتایا بس! اور ثواب بھی زیادہ اِسی میں ہے کہ ہماری جو نیّت ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ ہو یعنی ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اُس میں ہمیں یہ نیّت نہیں رکھنی چاہئے کہ اُس میں جسمانی تکلیف ہے اِس کی سمجھ رکھنی چاہئے لیکن یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ہم محض اپنے جسم کی راحت کے لئے کام کرتے ہیں یا بڑھاپے میں آفتوں سے بچنے کے لئے کام کرتے ہیں، ہمیں اللہ کی خوشنودی پیشِ نظر رکھنی چاہئے یہ ہے سب سے بڑی نیّت ہے۔

زمانۂ قدیم میں ایک پیر نے اپنے مُرید سے پوچھا اور کہا کہ یہ چھت کے درمیان روشدان جو ہے وہ کس لئے ہے؟ اُس زمانے میں مکان کچھ اُس طرح سے بنتے تھے کہ روشدان یہاں بنتا تھا، تو مُرید نے اُس سوال کا جواب یوں دیا کہ یا حضرت! یہ تو روشنی آنے کے لئے ہے اِس لئے اس کا نام روشدان ہے، تو مُرشد نے فرمایا کہ نہیں یہ بات صحیح نہیں ہے، تم کہتے کہ اَذان کی آواز سنائی دینے کے لئے ہے تو یہ جواب بہت اچھا ہوتا، گو کہ اِس میں سے روشنی بھی آتی ہے وہ بات اگرچہ صحیح ہے لیکن وہ بات چھوٹی ہے تم کو ایسا جواب دینا چاہئے جو اعلیٰ سے اعلیٰ ہو اور جس سے معلوم ہو جائے کہ تمہاری نیّت کتنی اُونچی ہے اور کتنی اچھی ہے۔ تو اِسی طرح اسلام نے، پیغمبرؐ نے، قرآن نے، خدا نے کبھی ذیلی چیزوں کا ذکر نہیں کیا، مقصدِ اعلیٰ کو بتایا۔ جو کام [کرنے کے] ہیں اور جو نہیں کرنے کے کام ہیں اُن کے سب سے بڑے نقصان کو بتایا اور جو کام کرنے چاہئیں اُن کے سب سے بڑے فائدے کو بتایا۔ تاہم ہمیں ہر چیز کو سمجھنا چاہئے اور ہر چیز کو سمجھ کے کرنا چاہئے۔

میرے بیان کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں اپنی دُنیا کے بارے میں سوچنا چاہئے اور آخرت کے بارے میں بھی سوچنا چاہئے اور عبادت کے کیا کیا فوائد ہیں اُن کو سوچنا چاہئے، اُن کو سمجھنا چاہئے تاکہ مومن کو زیادہ سے زیادہ توجہ ہو اور اِن تمام فوائد کو سمجھیں کیونکہ انسان کی عادت کچھ ایسی ہے کہ وہ اپنے کام کے زیادہ سے زیادہ فائدہ کو سمجھنے سے شوق سے کام کرسکتا ہے۔ اگر فائدہ سمجھ میں نہیں آتا ہے تو وہ اپنے کام میں سُست ہو جاتا ہے یا سُست رفتاری سے کام کرتا ہے اِس لئے میں گزارش کر رہا تھا کہ عبادت بندگی میں بہت سے فائدے ہیں اور یہ عبادت ہم کو دُنیا میں بھی سلامت رکھتی ہے اور آخرت میں بھی ہم کو مقصدِ اعلیٰ سے ہمکنار کر دیتی ہے، اِس کے لئے عبادت، ریاضت اور علم، حکمت، معرفت بہت

ہی ضروری ہے کہ جس حد تک ہو سکے جتنا ہو سکے ہم اِس رُوحانی دولت کو کمائیں۔ خانہ آباد ان!

میں آپ کو ایک مفید بات بتاؤں وہ یہ کہ اِس دُنیا کے اندر مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں ہیں جن سے دوائیاں بنائی جاتی ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اِس سلسلے میں کس قسم کی جڑی بوٹی زیادہ مفید ہوتی ہے، وہ جڑی بوٹی زیادہ مؤثر ہوتی ہے اور اُس سے اچھی دوائی بنتی ہے جو زہریلی قسم کی ہو، بہت سخت ہو، اُس میں یا سخت بدبو ہو یا اُس میں کوئی تیزی ہو یا اُس میں ایک قسم کے زہر کے عناصر ہوں تو وہ بوٹی بہت ہی مؤثر دوا بنانے میں کام آتی ہے۔ لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کس طرح اُس سے دوائی بناتے ہیں، پہلے اُس کے زہر کو مارتے ہیں۔ ایک خاص طریقے سے اُس کے زہر کو مارتے ہیں، اُس کو کہتے ہیں کُشتہ بنانا، فارسی میں کُشتن یعنی مارنا، اُس کے زہر کو مارتے ہیں پھر اِس کی اصلاح کر کے اُس سے دوائیاں بناتے ہیں، اِسی طرح انسان کے اندر بھی کچھ ایسی صلاحیتیں ہیں جو سخت ہیں مگر اُن صلاحیتوں کی اصلاح کے بعد وہ بہت ہی مفید کام کرتی ہیں۔ چنانچہ شیطان ایک شر کی طاقت ہے، بُرائی کی طاقت ہے لیکن اُس کی اگر اصلاح کی جائے، اُس کو اگر مسلمان بنایا جائے تو وہ اتنا کام کرے گا، اتنا کام کرے گا، اتنا کام کرے گا کہ آپ تعجب کریں گے، بہت کام کرے گا، دُنیا کے اندر جو شریر انسان ہوتا ہے، جس سے لوگ تنگ آتے ہیں اگر اُس کو [نیک] بنایا جائے اور اُس کی اصلاح کی جائے تو وہ اتنا مفید ہوتا ہے، اتنا مفید ہوتا ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں ہے، کیونکہ اُس کے اندر بہت طاقت ہوتی ہے، وہ بہت Active ہوتا ہے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: چند اہم اصطلاحات اور اُن کی وضاحت

(خدا کی صفات، مکان اور لامکان، رُوح اور جسم لطیف اور کثیف، بسیط اور مرکّب علوی اور سفلی،
جسمِ فلکی اور جسمِ خاکی، تین سو تیرہ مومنین تخلیق اور ابداع نیستی اور ہستی نفی اور اِثبات، وحدت اور کثرت)

کیسٹ نمبر: ۱۵ تاریخ: ۱۹۷۸، کراچی

خدا کی صفات:

خدا اَحۡسَنُ الۡخَالِقِيۡن (۲۳:۱۴) ہے یہ لفظ قرآن ہی کا ہے۔ سنا آپ نے! کہ خالقین یہ صیغۂ جمع میں آیا ہے، خدا خالقین میں سے بہترین ہے۔ خالقین بہت ہیں لیکن خدا اُن سب سے بڑھ کر ہے اور خدا کی تخلیق بہت ہی اعلیٰ ہے۔ پہلے مرحلے پر قرآن انکار نہیں کرتا ہے کہ خدا نے مکھی پیدا نہیں کی، وہ مانتا ہے لیکن جب ہم اَحۡسَنَ الۡخَالِقِيۡن پر آتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ خالقین بہت ہیں۔ خداوندِ عالم نے ایک ہی چیز پیدا کی ہے بس ایک سے اگر کوئی چیز پیدا ہو جائے تو ایک ہی پیدا ہو جائے نا یعنی وحدت سے وحدت پیدا ہو جائے، وحدت سے کثرت کیسے پیدا ہو تو خدا نے جو ایک ہی تھا، اُس نے کوئی چیز اگر بنائی ہے تو عقلِ کُلّ بنایا ہے، پھر اُس نے نفسِ کُلّ بنایا، پھر اُس نے کائنات بنائی اور دُنیا کے اندر بھی تخلیق کرنے والے کتنے ہیں۔ انسان بھی کوئی نہ کوئی چیز بناتا ہے، انسان سے خیالات بنتے ہیں، افکار بنتے ہیں اور ظاہری طور پر باطنی طور پر بہت سی چیزیں انسان سے بنتی ہیں، تو انسان بھی ایک طرح کا خالق ہے اور اِس معنی میں قرآن نے کہا کہ: فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخَالِقِيۡن (۲۳:۱۴) خداوند عالم اَحۡسَنَ الۡخَالِقِيۡن ہے عوام اِس کو نہیں سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ قرآن کے اندر ایک دو الفاظ ایسے بھی ہیں جو کہ وحی کے نہیں ہیں اور وحی کے درمیان شیطان نے موقع پایا اور رسولؐ کی زبانِ مبارک کو تھوڑی سی لغزش دی اور شیطان نے اپنا لفظ اِس کے اندر ٹھونس دیا، کیونکہ خالقین جمع کے صیغے میں نہیں آنا چاہیئے۔ خود قرآن کو ہر طرح سے پاک بھی قرار دیتے ہیں اور ایسی باتیں بھی کہتے ہیں، میں کچھ کمزور تفاسیر سے یہ بیان آپ کو کبھی بتاؤں گا، وہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن میں ایک دو الفاظ اِسی طرح سے رسولؐ کی بے احتیاطی سے آ گئے اور شیطان نے موقع پا کر یہ الفاظ ٹھونس دیئے۔ چونکہ اِدھر قرآن کی حکمت کو نہیں سمجھتے ہیں، جب نہیں سمجھتے ہیں تو پھر شیطان کا سہارا لیتے ہیں، کتنی معیوب بات ہے اور کتنی کمزور بات ہے کہ قرآن کو بھی اور رسولؐ کو بھی اِس میں بدنام کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے اور خداوندِ عالم نے ضمانت دی ہے کہ رسولؐ سے ایسی لغزش کبھی ہونے والی نہیں ہے، [ارشادِ خداوندی ہے]:

وَمَا یَنطِقُ عَنِ الھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی (۵۳:۳۔۴) وہ نفس کی خواہش سے کبھی بولتا نہیں ہے قرآن اور کچھ نہیں ہے صرف وحی ہے اور بلکہ بعض محدثین تمام حدیثوں کو بھی وحی کا درجہ قرار دیتے ہیں اور یہ بات صحیح ہے اور ہمارے لئے بھی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ پیغمبرؐ اور امامؑ جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ خدا کی زبان ہے اور ان کا کہنا بالکل وحی کی طرح ہے، وہ خدا کی زبان ہے۔ تو ازل اور ابد کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے اور پھر اِس کے بعد اوّل اور آخر کے سلسلے میں بات کرتے ہوئے بات نکلی کہ خدا کے جو اوصاف قرآن میں بیان ہوئے ہیں وہ آخری نہیں ہے، اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوگا، جس طرح ہم نے مثال دی کہ خدا اوّل ہے اور اوّلُ الاوّلین ہے اور پھر اِس کے بعد خدا کا نہ اوّل ہونا اور نہ آخر ہونا، وہ اوّل و آخر سے بالا و برتر ہے۔

<u>مکان اور لامکان:</u>

اِس کے بعد لامکان، تو کیا لامکان کوئی مخصوص جگہ ہے اِس آسمان کے اُوپر یا اِس کائنات کے باہر کوئی خاص جگہ ہے؟ حالانکہ یہ بات غلط ہے لامکان کے لفظی معنی خود ایسے ہیں کہ اُن معنوں سے پتا چلتا ہے کہ مکان نہیں ہے وہ غیر مکانی کیفیت ہے، لامکان غیر مکانی کیفیت ہونے کے باوجود اُس کے اندر ہر چیز لامکانی طور پر ہے، رُوحانی طور پر ہے۔ جس طرح کہ آپ سمجھتے ہیں کہ رُوح مادّہ نہیں ہے، جب مادّہ نہیں ہے تو وہ لامکان میں ہوسکتی ہے اور لامکان رُوح کے لئے صحیح ہے۔ رُوح کے لئے مکان کی ضرورت نہیں ہے، جسم کے لئے مکان کی ضرورت ہے، تو رُوح کے لئے چونکہ مکان کی ضرورت نہیں ہے اور جس چیز کو مکان کی ضرورت نہیں ہے اُس کو لامکانی کہا جاسکتا ہے۔

آپ فرضی طور پر اِس کائنات کو سامنے سے ہٹائیں، اِس کو فنا قرار دیں، کہیں کہ یہ کائنات، آسمان، زمین، سورج، چاند، ستارے کوئی چیز نہیں ہے، اپنے ذہن میں ایسا ایک تصوّر قائم کریں، تو وہ تصوّر لامکان کے بارے میں ہوگا، یعنی جب یہ ساری کائنات غائب ہو جائے، فنا ہو جائے تو پھر وہ لامکانی کیفیت ہوگی، اِس پوری کائنات کو، اِس جہان کو اور ہر چیز کو جو مادّی طور پر سامنے ہے اُس کو ہٹائیں، اُس کو مٹائیں، تو پھر وہ لامکانی کیفیت ہوگی، یہ ایک مثال ہے۔ دُوسری مثال عالمِ خواب [کی ہے] عالمِ خواب یہ لامکان ہے، خواب کی حالت میں آپ کہاں جاتے ہیں، کس دُنیا میں جاتے ہیں؟ آسمان پر جاتے ہیں یا کسی خاص ملک میں جاتے ہیں، کہیں بھی نہیں جاتے ہیں، خواب میں جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ رُوح کی وجہ سے ہے، رُوح ہی دیکھتی ہے، رُوح چونکہ لامکانی کیفیت ہے، وہ Matter نہیں ہے، وہ مادّہ نہیں ہے، رُوح جو کچھ دیکھتی ہے وہ اپنے آپ میں دیکھتی ہے اور وہ لامکان ہے، یعنی وہ کوئی جگہ نہیں ہے، پس جب جگہ نہیں ہے تو وہ لامکان ہے، لامکان کی کیفیت سمجھانے کے سلسلے میں آپ کو دو مثالیں پیش کی گئیں۔ مثال کے طور پر ایک اِس کائنات کو

مٹانے [یا] ہٹانے کا تصوّر اور دُوسری مثال عالمِ خواب یا عالمِ تصوّر یہ لامکان ہے۔ آپ سوچیں! [خواب میں یا خیال میں] ایک شخص کو بمع اُس کے مکان کے آپ دیکھتے ہیں، یہ کہاں دیکھتے ہیں؟ وہ لامکانی کیفیت ہے، یہ تصوّر رُوح کے اندر ہے، نہ کہ رُوح کسی خاص جگہ میں جا کر جھانکتی ہے، یہ بات نہیں ہے۔ رُوح جو کچھ خواب میں دیکھتی ہے، وہی خیال میں بھی دیکھتی ہے تصوّر میں بھی یہی بات ہے، خواب ہو یا خیال یا تصوّر اور تفکّر یہ سب باتیں لامکان کی ہیں، لامکانی کیفیت کی ہیں۔

اِسی طرح پوچھا جاتا ہے کہ بہشت کہاں ہے؟ اگر بہشت مادّی ہے تو اُس کو کہیں نہ کہیں ہونا چاہئے، اگر بہشت رُوحانی ہے، تو وہ لامکانی ہے اور [اِسی طرح] دوزخ بھی۔ بہت سی چیزیں ہیں جو لامکانی ہیں، تو اُن کے لئے مکان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسان اپنے آپ میں، اپنے باطن میں، اپنی رُوح کی کیفیت میں ایک جہان ہے، ایک کائنات ہے جو لامکان ہے۔ عالمِ امر میں جو بھی چیز ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور اُس میں سب چیزیں ہیں اور عالمِ خلق میں کوئی چیز کبھی ہے تو کبھی نہیں ہے۔ مثلاً ہمارا جسم، جب دُنیا میں ہم پیدا نہیں ہوئے تھے، تو یہ جسم اِس طرح سے نہیں تھا، اِس کے اجزاء البتہ بکھرے ہوئے تھے لیکن یہ جسم اِس طرح سے نہیں تھا، جب یہ جسم وُجود میں آیا، تو اِس کی شکل وصورت مقرر ہوئی اور جب رُوح اِس جسم کو چھوڑے گی تو اُس وقت ہمارا جسم نہیں رہے گا، کچھ وقت کے بعد یہ ریختہ ہو جائے گا، بکھر جائے گا کیونکہ دُنیا کے اندر [اور] عالمِ خلق کے اندر جو بھی چیز ہے وہ کبھی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی ہے، اِس کے برعکس عالمِ امر میں جتنی چیزیں ہیں وہ ہمیشہ سے ہیں، عالمِ امر کی یہ تعریف ہے، عالمِ امر ایسا عالم ہے، ایسی دُنیا ہے کہ اُس کے اندر جو بھی چیزیں ہیں وہ ہمیشہ ہیں، وہ ٹلتی نہیں ہیں، وہ ہٹتی نہیں ہیں، یہاں تک کہ رُوح بھی وہاں سے الگ ہو کر دُنیا میں نہیں آتی ہے۔

ابھی میں نے کہا تھا کہ اِس تصوّر کے سمجھنے سے بہت فائدے ہیں، کس طرح فائدے ہیں؟ میں بعد میں اشارہ کروں گا، میں کہہ رہا ہوں کہ عالمِ امر کے اندر جتنی چیزیں ہیں وہ ہمیشہ سے ایک حال پر ہیں اور وہاں سے کوئی چیز آتی ہے تو سائے کی طرح آتی ہے، اصل چیز وہاں پر قائم رہتی ہے، ہماری رُوح بھی عالمِ امر میں اب بھی موجود ہے اور وہ اس دُنیا میں اگر آئی ہے تو وہاں سے Cut-off ہو کر نہیں آئی ہے، بلکہ اُس کا Shadow آیا ہے۔ جو Shadow یہاں آیا اور مقرر ہوا اِس کے لحاظ سے ہم عالمِ خلق میں ہیں اور رُوح کے اُس سرے کے لحاظ سے ہم عالمِ امر میں ہیں۔ اِس معنی میں پیغمبر نے کہا کہ: ”اَلْمُؤْمِنُ حَیٌّ فِی الدَّارَیْنِ مومن دونوں جہاں میں بیک وقت زندہ ہے“۔ ہم رُوحانیت میں وہاں زندہ ہیں جہاں کہ عالمِ امر ہے، لامکان ہے اور اِس شخصیت میں یہاں زندہ ہیں، اِس معنی میں کہا کہ: ”اَلْمُؤْمِنُ حَیٌّ فِی الدَّارَیْنِ مومن بیک وقت دونوں جہاں میں زندہ ہے“۔ تو میں عالمِ امر اور عالمِ خلق کی بات کر رہا ہوں۔

عالمِ خلق میں کسی چیز کی تخلیق ہوتی ہے اور عالمِ امر میں تخلیق نہیں ہوتی ہے، وہ [عالم] خدا کے نور کی طرح ہمیشہ موجود ہے، عالمِ امر ایک لحاظ سے نفسِ کُلّ ہے۔ اُس نفسِ کُلّ کے اندر رُوحانی شکل وصورت میں ہر چیز موجود ہے۔ قرآن

کی متعدّد آیتوں میں اِس کا اشارہ ملتا ہے کہ وہاں پر [یعنی] عالمِ امر میں جتنی چیزیں ہیں وہ موجود ہیں، لیکن دُنیا میں رُوح کے آنے کے یہ معنی ہیں کہ ایک سایہ آتا ہے۔ یہاں پر مولائے روم کا ایک شعر سناتا ہوں وہ یہ ہے کہ:

تن چو سایہ بر زمین و جانِ پاکِ عاشقان

در بہشتِ عدن تجری تحتہاالانہار مست

جسم جو ہے وہ سائے کی طرح زمین پر ہے اور عاشقوں کی پاک رُوح، اُس دائمیت کی بہشت میں، ہمیشگی کی بہشت میں اور اُس بہشت میں جس کے نیچے چار نہریں چلتی ہیں، اُس میں وہ رُوح، وہ جان مست ہے۔ لیکن سایہ زمین پر پڑ رہا ہے۔ سایہ زمین پر چلتا ہے، پھرتا ہے۔ تو یہ ہوئی عالمِ خلق اور عالمِ امر کی بات۔ آپ نہ بھولئے گا یہ اصطلاحات ہیں، فلسفے کی اصطلاحات ہیں اور اسماعیلی اصطلاحات ہیں، اِن اصطلاحات کے سمجھنے سے ایک تو آپ کے سوالات ختم ہوں گے اور آگے چل کر اِن کے سمجھنے سے بڑی بڑی اُونچی اُونچی کتابیں جو ہیں آپ پڑھ سکیں گے، اُن کا مطالعہ کر سکیں گے۔

<u>روح اور جسم:</u>

اِس کے بعد رُوح اور جسم ہے، خیر رُوح اور جسم کے سلسلے میں کچھ زیادہ وضاحت کی بھی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ رُوح کا ذکر عالمِ امر کے ضمن میں آیا اور جسم کا ذکر عالمِ خلق کے سلسلے میں آیا کہ رُوح عالمِ امر سے ہے اور اب بھی عالمِ امر میں ہے اور جسم عالمِ خلق میں ہے۔ یہ جسم عالمِ امر میں جا نہیں سکتا اور وہ رُوح اپنی پوری اصلیت کے ساتھ اِس دُنیا میں آ نہیں سکتی ہے مگر جسم کے سہارے سے، جسم کے وسیلے سے رُوح کا سایہ ظاہر ہوتا ہے۔ تو رُوح کو سمجھ لیا جائے اور جسم کو سمجھ لیا جائے اور رُوح کو سمجھنے، خود کو سمجھنے کے سلسلے میں امامؑ کے کتنے شاندار فرامین ہیں۔

<u>لطیف اور کثیف:</u>

اِس کے بعد لطیف اور کثیف ہے، ''لطیف'' رُوح کی طرح پاکیزہ اور صاف، روشن چیز، جس [کے لئے] کوئی دُوسری چیز رکاوٹ نہ [بن] سکے، اُس کو لطیف کہتے ہیں، مثلاً لطیف یہ ہے کہ وہ چیز اِس دیوار سے آئے گی اور پھر جائے گی۔ آپ بوتل میں رُوح کو بند کریں تو آپ اُس کو بند نہیں کر سکیں گے۔ گہرے سمندر کے نیچے بھی رُوح چلی جائے گی اور رُوح کے لئے کوئی آڑ نہیں ہے، کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اِس معنی میں لطیف کہا جاتا ہے اور کثیف وہ چیز ہے جو ٹھوس ہے، جس کو چھُوا جا سکتا ہے اور لطیف کے بارے میں یہ ہے کہ جسمِ لطیف آسٹرل باڈی ہے۔ مادّی چیزوں میں بھی اگر ہم لطیف کو سمجھیں تو چار عناصر کو لیجئے مٹّی ہے زیادہ کثیف ہے اور پانی ہے قدرے لطیف ہے، ہَوا ہے اُس سے زیادہ لطیف ہے، آگ اُس سے زیادہ لطیف ہے یعنی اِن چاروں میں سب سے زیادہ لطیف آگ ہے، وہ اِس معنی میں کہ تَوے کے نیچے جب آگ جلائی جاتی ہے، تو وہ آگ تَوے سے گزر کر اُوپر کو پہنچتی

ہے،اِس معنی میں ہم سمجھ گئے کہ کچھ چیزوں میں لطافت بہت زیادہ ہے، کچھ چیزوں میں کثافت زیادہ ہے۔

بسیط اور مرکّب:

اِس کے بعد بسیط اور مرکّب ہے، بسیط اور مرکّب کے کیا معنی ہیں؟ بسیط وہ چیز جو بالکل ایک حقیقت ہے، ایک جوہر ہے، اُس کے اجزاء نہیں ہیں اور اس کے معنی یہ کہ وہ ہر جگہ پر ہے وہ محدود نہیں ہے۔ اِس پوری کائنات میں وہ چیز پائی جاتی ہے، [یعنی] وہ بسیط ہے۔ اور مرکّب کے معنی چند اجزاء کو باہم ملا کر کوئی دُوسری چیز بنائی گئی [ہو]۔ چنانچہ ہماری رُوح جو ہے وہ بسیط ہے اور جسم جو ہے وہ مرکّب ہے، مرکّب [کا] مطلب ترکیب یافتہ، امتزاج۔ مثلاً ہمارا جسم اِس طرح سے مرکّب ہے کہ یہ چار عناصر سے بنا ہے اور رُوح بسیط ہے، اُس کے عناصر نہیں ہیں، وہ ایک جوہر ہے، جو بسیط ہے، پوری کائنات میں وہ پائی جاتی ہے۔

اِن اصطلاحات کے سمجھنے کے بعد ہم کو رُوح کی، خدا کی شناخت ہو سکتی ہے۔ جب ہم نے رُوح کے متعلّق یہ سمجھ لیا کہ رُوح بسیط ہے، تو پھر رُوح کے چلنے اور آنے اور جانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے۔ رُوح کے آسمان پر چلے جانے اور نازل ہونے، [کے] الفاظ تو آئیں گے لیکن حقیقت میں رُوح کہیں آتی جاتی نہیں ہے، [اگر] رُوح محدود ہو تو اِس کمرے کو چھوڑ کر دُوسرے کمرے میں جائے گی، [جبکہ] وہ پہلے سے دُوسرے کمرے میں ہے۔ دُوسرے کمرے کی کیا بات، پوری کائنات میں رُوح ہے۔ تو یہاں سے آسمان تک کیوں جائے؟ کس لئے جائے؟ وہاں بھی تو ہے۔ آنا جانا اُس چیز کے لئے چاہئے جو کہ مادّی ہو، محدود ہو، تو یہ جگہ چھوڑے اور اُس جگہ کو گھیرے، یہ جسم کی بات ہے۔

رُوح کے لئے آنا جانا نہیں ہے۔ ہم اِس کی مدد سے خدا کی شناخت کو سمجھیں گے اور خدا کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے کہ ''خدا آئے گا، خدا جائے گا'' یہ بات نہیں ہے۔ جب رُوح کے لئے یہ بات صحیح نہیں کہ رُوح آئے گی، جائے گی، ہم سمجھنے کے لئے اپنی عادت کی مجبوری سے کہہ سکتے ہیں کہ رُوح آئی نکلی، پرواز کر گئی، یہ تو ضرورت کے مطابق ہے اور اگر فی نفسہٖ دیکھا جائے تو رُوح کے لئے آئی گئی یہ بات نہیں ہے چونکہ وہ بسیط ہے، بسیط معنی ہر جگہ پر موجود ہے وہ مرکّب نہیں ہے۔ دیکھا اِن اصطلاحات کے سمجھنے سے ہم کس طرح رُوح کی شناخت اور خدا کی شناخت میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔ تو سمجھ لیجئے کہ بسیط وہ چیز جو ہر جگہ پر ہے، مثلاً ایک معمولی سی مثال Ether کہاں ہے؟ ہر جگہ پر ہے۔ تب تو ریڈیو کام کرتا ہے اور اسٹیشن سے لہر آتی ہے تو Ether وہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ پھر بھی یہ مادّی چیز ہے، دیکھیں رُوح رُوحانی چیز ہے، وہ لطیف ہے اور بسیط ہے۔ اب ہم نے مرکّب کو سمجھا اور بسیط کو سمجھا۔

علوی اور سفلی:

اِس کے بعد علوی اور سفلی، یہ دونوں اصطلاحیں ہیں، علوی جو چیز فضیلت کے لحاظ سے، شرافت کے لحاظ سے بلند و

بالا ہو۔ اور سفلی نچلے درجے کی چیز، اِس سے کوئی سمجھتا ہے کہ عالمِ علوی کچھ اُوپر ہے اور عالمِ سفلی کچھ نیچے ہے، یہ بات نہیں ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ جو لامکان ہے وہ عالمِ علوی ہے، جو مکان ہے وہ عالمِ سفلی ہے۔ عالمِ علوی یعنی اُوپر کی دُنیا یہ فضیلت کے لحاظ سے ہے، مکانی طور پر، جغرافیائی طور پر نہیں ہے۔ عالمِ سفلی یعنی نچلی دُنیا۔ اِس کو مکانی طور پر نہیں سمجھا جائے، جب کہا جاتا ہے کہ اُوپر کی دُنیا تو پھر اُوپر نہ دیکھا جائے، ویسے عام طور پر تو ابتدا میں یوں سمجھا جاتا ہے لیکن یہ بات نہیں ہے۔ عالمِ علوی کا مطلب لامکان جو یہاں نہیں، وہاں نہیں، اُوپر نہیں، نیچے نہیں، مکان کے طور پر اُس کو سمجھنا نہیں ہے، لامکان کے طور پر اُس کو سمجھنا ہے۔ اور عالمِ سفلی کا مطلب یعنی نچلی دُنیا لیکن حقیقت میں یہ ایک جسمانی دُنیا ہے، رُوحانی دُنیا کو عالمِ علوی کہا گیا ہے اور جسمانی دُنیا عالمِ سفلی ہے اور ظاہری طور پر کچھ اُوپر کی دُنیائیں جو ستارے ہیں اور چاند ہے یا کوئی اور آباد سیارہ ہے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ وہ عالمِ علوی ہے اور یہ عالمِ سفلی ہے۔ بہر حال وقتی طور پر جس طرح سے سمجھ لیا جائے، لیکن آخری بات تو یہ ہے کہ عالمِ علوی، رُوحانی عالم، عالمِ امر اور لامکان ہیں آپ لامکان کہیں عالمِ علوی کہیں اور عالمِ امر کہیں دونوں باتیں ایک ہیں اور عالمِ سفلی نچلی دُنیا ہے۔

جسمِ فلکی اور جسمِ خاکی:

اِس کے بعد جسمِ فلکی اور جسمِ خاکی ہے تو ہمارے دو جسم ہیں، ایک آسٹرل باڈی ہے، ایک یہ جسم ہے، اِن دونوں میں کیا فرق ہے؟ جس طرح کہا نا! کہ عالمِ امر میں سب چیزیں ہیں، تو رُوح کی حیثیت ہے یا Ether کی باڈی ہے، آسٹرل باڈی ہے اور اِس کے مقابلے میں جسمِ خاکی یہ جسم ہے، اِس کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کو سب سمجھتے ہیں اور سب جانتے ہیں۔

تین سو تیرہ مومنین (۳۱۳):

تین سو تیرہ مومنین جو دُنیا میں ہوتے ہیں اُن کے بارے میں سوال کیا ہے کہ وہ کس خدمت کی بنیاد پر ہوتے ہیں؟ یعنی اُن کو خداوند جو خصوصی درجہ عطا فرماتا ہے، اُس کا سبب کیا ہے؟ اُن کی اِس میں نیکی کیا ہے؟ اُن کی فضیلت و مرتبت کیا ہے؟ وہ چاہتے ہیں کہ اِس کا جواب دے دیا جائے، چنانچہ اِس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اُن کی خدمت، اُن کی فضیلت اور ریاضت و عبادت جو کچھ بھی ہے وہ زمانے کے تقاضے کے مطابق ہے یعنی شروع سے لے کر اب تک خدمت کا معیار ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہا ہے، رسول اللہؐ کے زمانے میں معاشرے کے لئے، قوم اور جماعت کے لئے، ملک و ملّت کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی اُن میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ اُن کی اب ضرورت نہیں ہے، اُن کی جگہ پر کچھ دُوسری چیزوں کی ضرورت ہے، دیکھا آپ نے! اِس سے معلوم ہوا کہ نیکی کا معیار ہر وقت بدلتا رہتا ہے، خصوصاً خدمت کا معیار۔ اِس

لحاظ سے (۳۱۳) مومنین کا درجہ مرتّب ہوتا تھا وہ اب مختلف ہو سکتے ہیں یعنی زمانے میں جس خدمت کی ضرورت ہے، مذہب کے لئے، جماعت کے لئے، گروہِ مومنین کے لئے اُس خدمت کے لحاظ سے وہ (۳۱۳) مومنین ہونگے اور بنیادی طور پر ایک تو اِس میں علم ہے اور ایک عبادت ہے لیکن عبادت کی کئی کئی شاخیں ہیں۔

عبادت! بہترین عبادت خدمت ہے، جماعت کی خدمت قوم کی خدمت، امامؑ کی خدمت لیکن دیکھنا ہوگا کہ اس دَور میں اِس زمانے میں خدمت کونسی ہونی چاہئے؟۔ظاہر ہے کہ اب وہ جہاد نہیں ہے جو زمانہ رسولؐ میں تھا یعنی تلوار ہاتھ میں لے کے کافروں کو قتل کرنا، ایسا جہاد اب نہیں ہے۔یقیناً علمی جہاد ہے، علمی جنگ اب پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے، اِس لئے اِس علمی جنگ میں خود کو علم کے ہتھیاروں سے لیس کرنا اور دُوسروں کو [بھی] علم کے ہتھیاروں سے لیس کر دینا یہ ایک اہم خدمت ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے کسی ارشاد میں فرمایا ہے کہ: ''میں اب علمی ذوالفقار سے جنگ کروں گا، یعنی علم کی تلوار سے میں جنگ کروں گا''۔(ہزار حکمت، ص:۶)

علم ایک ایسی تیز تلوار ہے کہ اُس کی مار بہت دُور، دراز تک جاتی ہے اور یہ تلوار بہت زیادہ خون بہاتی ہے۔ خون شکوک وشبہات ہیں، یہ علم کی تلوار شیطان کے خلاف، نفس امّارہ کے خلاف اور دینی مخالفین کے خلاف استعمال ہوتی ہے، لہٰذا اِس کی بہت اہمیّت ہے،۔وہ تلوار خواہ ذوالفقار ہو یا کوئی صمصام اور قمقام، ہر حالت میں جو سامنے دشمن کھڑا ہے اُسی کو مار سکتی ہے، یہ تلوار بہت دُور دراز تک مار سکتی ہے۔لہٰذا اِس جہاد میں جو بھی حصہ لے گا اس کو (۳۱۳) کا درجہ ملے گا اور آپ کو شاید تواریخی طور پر معلوم ہے کہ جنگِ بدر میں جو مسلمانوں کی طرف سے کافروں کے خلاف پہلی جنگ تھی، وہ (۳۱۳) مومنین تھے اور اُس میں مولانا علیؑ پہلی بار میدانِ کارزار میں آئے تھے۔تو دیکھا (۳۱۳) مومنین گو کہ وہ سب کے سب ایسے نہیں تھے جو (۳۱۳) کا درجہ ہے۔بہر حال جو کچھ بھی تھے اُس گنتی کا اطلاق، اُس کا استعمال ایک جنگ سے متعلّق ہے، اِس سے معلوم ہوا کہ (۳۱۳) مومنین میں سب سے بڑی خوبی جو ہے وہ علمی جنگ ہے۔علمی جنگ میں آپ کسی طرح سے بھی حصہ لیں، خود ہی علم کے کارخانے میں کام کریں، تلواریں بنائیں یا تلواریں استعمال کریں یا تلواروں کو خریدیں معنی یہ کہ یا تو آپ علم کا کام خود کریں یا دُوسرے سے کرائیں یا خود سیکھیں یا دُوسروں کو سکھائیں یا سیکھنے یا سکھانے کے درمیان کوئی بھی کام کریں، کوئی بھی وسیلہ مہیا کریں، تو ہر حالت میں یہ علمی جہاد ہو گیا۔

اب اِس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ (۳۱۳) مومنین جو ہیں وہ سب کے سب افریقہ سے ہوں، چونکہ یہ رُوحانی کام ہے تو کہیں بھی ہو سکتے ہیں اور کسی علاقے میں بہت زیادہ بھی ہو سکتے ہیں، کسی میں کم بھی ہو سکتے ہیں اور بہر حال (۳۱۳) مومنین کی خصوصیات میں سب سے اہم اور پہلی خصوصیت علم [ہے] یعنی علم کی خدمت میں حصّہ دار ہونا ہے کسی طرح سے بھی۔پھر دُوسری نیکیاں اور خوبیاں ہیں۔ایک اور چیز یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ (۳۱۳) مومنین جو ہیں اُن کو

پتا چلے، کیونکہ بعض دفعہ جو رُوحانی مراتب ہیں اُن کا پتا نہیں چلتا ہے، معلوم نہیں ہوتا ہے اور اُن کو معلوم نہ ہونے میں بھی مصلحت ہے اور فائدہ ہے۔ وہ گمان نہیں کرتے ہیں کہ اِس مرتبے پر فائز ہو چکے ہیں لیکن وہ رُوحانی طور سے ہیں اور ایک اور بات یہ ہے کہ یہ درجہ کچھ ظاہری نہیں ہے کہ اِس کے بارے میں اعلان ہو اور مولا کے حضور سے ٹائٹل آئے اور پیپر پڑھا جائے، یہ بات نہیں ہے، یہ بالکل رُوحانی معاملہ ہے، اِس لئے یہ مرتبہ کسی کے پاس ہوسکتا ہے اور ایک اور چیز اِس سلسلے میں یہ ہے کہ مومن جب خدا کے درجے تک جاتا ہے، خدا سے واصل ہو جاتا ہے، خدا کی صفت میں فنا ہوسکتا ہے، تو پھر اُس کے نچلے درجے جو ہیں وہ کچھ عجب نہیں ہیں۔ لہٰذا اِس درجہ میں مومنین و مومنات میں سے یعنی بھائیوں میں سے اور بہنوں میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے۔

ایک اور چیز یہ ہے کہ اِس کے لئے ہمت کی ضرورت ہے، وہ کوئی مقدّر نہیں ہے کہ کسی ایک کو یہ مرتبہ حاصل ہو اور پھر دُوسروں کے لئے یہ ناممکن ہو، ہمت کریں، خدمت کریں، عبادت کریں، علم میں آگے بڑھیں اور جو جہاد کرنے والے ہیں اُن سے تعاون کریں تو ہوسکتا ہے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں بھی وہی لوگ رُوحانیت میں آگے بڑھ سکتے تھے جو خدا اور رسولؐ اور امامؑ کی پیروی کرتے تھے اور اُن کے نمائندوں سے تعاون کرتے تھے۔ اِسی طرح اب بھی جو سب سے اعلیٰ جہاد ہے، جو علم کی ذوالفقار سے کیا جاتا ہے اُس میں حصّہ دار ہو جائیں، اُس میں شرکت کریں، علم کی غذاؤں کو پھیلائیں، علم کی روشنی کو پھیلائیں، علم کے ہتھیاروں کو مہیا کریں اور لوگوں کے ہاتھوں میں [علم کی] تلواریں پکڑائیں اور اپنے مذہب کو [علمی] ہتھیاروں سے محفوظ رکھیں تو پھر ہوسکتا ہے، یہ ہے (۳۱۳) مومنین، یہ داعی کے مرتبے کے لوگ ہیں۔

تخلیق اور اِبداع:

کسی کو تخلیق کے بارے میں کچھ شک نہیں ہے، میں اِبداع کے بارے میں کچھ وضاحت کرنا چاہوں گا۔ قوی طور پر تو یہ کہا گیا کہ اِبداع [کا مطلب] ''کُن'' فرما کر کسی چیز کو وجود میں لانا۔ اصل [میں] اِس کی وضاحت یہ ہے کہ اِبداع عالمِ امر کی کسی چیز کو حرکت میں لانا، جو چیز پہلے سے موجود ہے اُس سے کوئی کام لینا، اُس کو ظاہر کرنا، اُس کو حرکت دینا، اُس کو جلوے میں لانا یہ اِبداع ہے۔ اب یہاں پر بھی ایک انقلاب آیا کیونکہ اِس سے پہلے ہم آپ یہ سمجھتے تھے کہ خدا نیستی کو مخاطب کر کے اُس میں سے کسی چیز کو وُجود میں لاتا ہے، کُن فرمانے کے نتیجے میں، ہم نے کچھ یوں سمجھ لیا تھا لیکن یہاں ہم کو اِس وضاحت سے معلوم ہوا کہ عالمِ امر میں سب چیزیں موجود ہیں، کوئی چیز اُس جہاں سے باہر نہیں ہے، [خدا] ایسی ایک چیز کو حرکت دیتا ہے یا وُجود دیا کہ اُس کو ظاہر کرتا ہے یا اُس کو جلوہ نما کر دیتا ہے تو اُس کو اِبداع کہتے ہیں۔ کیونکہ بزرگانِ دین نے یہ صَراحت کی ہے کہ نیستی دراصل ایسی نہیں ہے جس کو ہم نے سمجھ لیا۔ Nothingness یعنی نیستی جس کو لوگوں نے Non-existence سمجھ رکھا ہے نہیں وہ الگ بات ہے تو اُس کے اندر سب کچھ ہے، لیکن چونکہ لطیف ہے، رُوحانی

کیفیت ہے، جسم میں نہیں ہے، ظاہر نہیں ہے، اِس معنی میں اُس کو ہستی کے مقابلے میں نیستی کہا گیا، ورنہ اُس کے اندر سب کچھ ہے۔ تو ایسی کسی چیز کو جب خدا کُن فرماتا ہے تو محض اُس سے کام لینے کے لئے ہے اور محض لوگوں پر ظاہر کرنے کے لئے ہے اور اُس کے ظہور کے لئے ہے ورنہ وہ مکمل ہے، موجود ہے، حاضر ہے، زندہ ہے۔

خیر اِس وضاحت کے ساتھ ساتھ آپ اِس قدر سمجھ لیں کہ ایک تو تخلیق ہے، جس میں وقت لگتا ہے اور ایک اِبداع ہے، جس میں وقت نہیں لگتا ہے، بس کُن فرمایا تو آنِ واحد میں کسی چیز کا ظہور ہو گیا۔ مگر کُن کا جسم پر اطلاق نہیں ہوگا، عالمِ امر کی چیز پر ہوگا، جسمِ لطیف پر ہوگا، رُوح پر اس کا اطلاق ہوگا یہ بھی آپ دھیان رکھیں۔

<u>نیستی اور ہستی:</u>

اِس کے بعد نیستی اور ہستی ہے، اِن دونوں کی کسی قدر وضاحت کی گئی۔ نیستی معنی وہ کیفیت جس کے متعلّق کہا جاتا ہے کہ اُس میں کچھ نہیں ہے۔ اور ہستی یعنی وجود، کسی چیز کی ہستی، کسی چیز کا بن جانا، کسی چیز کا وُجود میں آنا، تو اِس صفت کو ہستی کہتے ہیں۔ اِس کے مقابلے میں کسی چیز کے نہ ہونے کو نیستی کہا جاتا ہے، مگر اِس میں ہستی بھی اور نیستی بھی دو دو قسم کی ہیں، ایک ہستی ہے جو لوگوں کی نظر میں ہستی ہے، وہ خدا کی نظر میں نیستی ہے، وہ کچھ نہیں ہے، ایک نیستی ہے وہ لوگوں کی سمجھ کے مطابق نیستی ہے لیکن خدا کی نگاہ میں اُس کے اندر کچھ ہے، اِس کو کس طرح سمجھیں؟ یعنی اِس طرح سمجھیں گے کہ صوفیوں کے اِس نظریے کی مثال لیں فنافی الشیخ، فنافی الرّسول اور فنافی اللہ [ہے] ''فنافی الشیخ'' اِس کا مطلب کسی شخص کا اپنی طرف سے مٹ جانا اور خود کو مٹا کے شیخ کی زندگی کے ساتھ مل کر اُس کی بقا اور اُس کی ہستی میں ایک ہونا یہ فنافی الشیخ ہو گیا۔ اِس کے بعد ''فنافی الرّسول'' شیخ سے گزر کر اور خود کو رسول اللہؐ سے اِس طرح سے واصل کر دینا کہ اپنی ہستی کو مٹائیں اور رسولؐ کے وُجود کی مدد سے خود کو اُن میں زندہ کریں فنا کو سمجھنے کے لئے یہ دو مرحلے ہو گئے۔

اب تیسری فنا ''فنافی اللہ و بقا باللہ'' [ہے] اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں فنا کرنا اور خدا کی ہستی کی مدد سے خود کو زندہ کر دینا۔ تو دیکھا کہ یہ فنا اور نیستی ایسی نہیں ہے جیسا کہ لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ یہاں ہر مقام پر فنا بقا نظر آتی ہے اور نیستی ہستی بن کر نمایاں ہوتی ہے۔ اِس [حکمت] نے ہم کو قرآن کے بہت سے تصوّرات [کو سمجھنے] میں مدد کی ہے [قرآن میں ہے کہ]: ''كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸:۸۸) ہر چیز فنا اور ہلاک ہونے والی ہے لیکن اُس کی ذات باقی و برقرار رہے گی''۔ اِس میں بھی ہم کو یہی تصوّر ملتا ہے کہ شاید اُس وقت سب مومنین بلکہ سب انسان اپنی طرف سے فنا ہو جائیں گے اور خدا کی ذات سے واصل ہو کے اُس میں زندہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا ہمیں فنا کا ایک پہلو ایسا نظر آیا کہ اُس میں فنا ہونے کے باوجود بقا ہی بقا ہے۔

ایک مادّی مثال میں آپ کو پیش کرتا ہوں، ہم نے آپ نے لوہے کا فنا ہونا دیکھا ہے لوہے کے ایک ٹکڑے کو آگ کی ایک زبردست بھٹی میں ڈالیں اور اُس میں آگ دھونکیں تو کچھ دیر کے بعد وہ لوہا فنا ہو جائے گا۔ تو لوہا فنا ہو کے کہاں جائے گا؟ بس اُس کے اندر جو سیاہی تھی، جو کالا رنگ تھا وہ مٹ جائے گا اور آگ کی طرح سُرخ انگارا بن جائے گا، اب یہ لوہا فنا ہو گیا اور آگ میں فنا ہو گیا، فنا ہو کے آگ میں زندہ ہو گیا، دونوں باتیں ہو گئیں، فنا بھی اور زندہ بھی، یا کہ فنا بھی اور بقا بھی، ایک طرف سے فنا اور پھر دُوسری طرف سے بقا اُس کو مل گئی۔ اسی طرح فنا کے متعلّق ہم نے سمجھا، جب فنا کے متعلّق ہم نے سمجھا تو نیستی کے بارے میں بھی ہمیں خود اعلیٰ سے اعلیٰ تصوّر ملا۔

اگر خدا قرآن میں کہتا ہے کہ تم کچھ نہیں تھے یا تم مرے ہوئے تھے، تو ہمیں ایک دم سے نہیں سمجھنا چاہئے کہ بس ہم مرے ہوئے تھے تو خدا نے کہا اور اُس پر قطعی فیصلہ ہو گیا، ہمیں سوچنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم تھے لیکن ہماری کیفیت کا نام فنا تھا یعنی کسی دُوسری ہستی میں مل کر تھے۔ مثلاً ہمارے جسم کو لیں کہ ہمارا یہ جسم نہیں تھا، کیا اِس سے ہم سمجھیں گے کہ ہمارے جسم کے ذرّے نہیں تھے، ہمارے جسم کے ذرّے تھے، عناصر میں تھے، پانی میں، مٹی میں ہَوا میں اور گرمی میں، ہمارے جسم کے بکھرے ہوئے ذرّات دُنیا میں تھے، ہم پھیلے ہوئے تھے۔ اسی طرح اگر رُوحانی طور پر یا کسی طرح سے کہا جائے کہ ''تم نہیں تھے'' تو ہمیں ایک دم سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہم نہیں تھے، اِس ''نہیں تھے'' کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم تھے لیکن اس حالت میں نہیں تھے، کچھ دُوسری حالت میں تھے۔ اِس حالت میں نہ ہونے کی وجہ سے خدا نے ہم سے کہا کہ تم نہیں تھے۔ وَ كُنْتُمْ أَمْوَاتًا (۲:۲۸) اور تم مرے ہوئے تھے، دیکھیں! جس چیز کا نام مرا ہوا ہے، یا مردگی ہے، تو مطلب یہ ہے کہ ہماری یہ شکل نہیں تھی، مطلب یہ کہ ہماری یہ شخصیت نہیں تھی لیکن ہماری کیفیت تھی، کسی Source سے مل کر تھی، کسی سرچشمے میں ہم تھے، خدا کے نور میں تھے، بہشت میں تھے، رُوحانیت میں تھے، عالمِ امر میں تھے، ہم کہاں گئے تھے؟ [ہم] تھے! لیکن خدا کسی بھی وجہ سے کہہ سکتا ہے کہ تم نہیں تھے، یہ جھوٹ بھی نہیں ہے لیکن اِس کے معنی ہیں، اِس کی تاویل ہے۔

تو نیستی اور ہستی کے بارے میں ہم نے بات کی اور اِس لئے میں نے صوفیوں سے مثال دی کہ انسان اِسی طرح سے ہے، اِس کے باوجود وہ خود کو کہتا ہے کہ فنافی الشیخ یعنی اُس کی صفات ختم ہو چکی ہیں اور شیخ کی صفات میں وہ زندہ ہوا ہے اور اُس سے آگے چل کر رسولؐ کی صفات میں زندہ ہوا ہے اور اُس سے آگے چل کر وہ خدا کی صفات میں زندہ ہو چکا ہے۔ پھر منصور کی بات کیجئے، منصور نے جب ''انا الحق'' کہا تو اُس وقت وہ فنافی اللہ اور بقا باللہ کے درجے پر فائز ہو چکا تھا، یعنی اُس کی اپنی انا جو تھی وہ انسانی مقام پر نہیں تھی بلکہ وہ خدا کے اوصاف میں منتقل ہو چکا تھا۔ جس طرح لوہے کے ٹکڑے کی میں نے مثال دی اور لوہے کے ٹکڑے کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز کی مثال میں دیتا ہوں، کوئلہ آپ نے دیکھا ہے؟ کوئلہ کتنی کالی چیز ہوتی ہے، آپ اُس کو آگ میں ڈالیں تھوڑی دیر میں خود بخود اُس کا سیاہ پن ختم ہو جائے گا، وہ نور بن

جائے گا اور کوئلہ نہیں رہے گا، انگارا کہلائے گا، انگارا [یعنی] آگ کا ٹکڑا، پھر وہ کوئلہ کہہ سکتا ہے کہ میں آگ ہوں۔ لوہا بھی جو سرخ انگارا ہو چکا ہے وہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں آگ ہوں۔ کیونکہ وہ اب لوہا نہیں رہا اور کوئلہ جب کہ انگاروں کے درمیان ہے وہ کوئلہ نہیں رہا، اِسی طرح کوئی فردِ مومن جو منصور کی طرح خدا کے اوصاف میں فنا ہو چکا ہو تو وہ کہہ سکتا ہے انا الحق، انا الحق یا کوئی اور نعرہ بلند کر سکتا ہے۔

بہت سے لوگوں نے یہ نعرہ بلند کیا اور ضروری نہیں ہے کہ صرف نعرہ ہی بلند کریں، تب وہ خدا کی صفات سے متّصف ہوتے ہوں، وہ نعرے کے بغیر بھی اِس مقام تک پہنچ سکتے ہیں۔ تو ہر بار ضروری نہیں ہے کہ نعرہ بلند کیا جائے اور کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو نعرہ بلند نہ کریں لیکن وہ سمجھ پائیں کہ وہ اِسی درجے پر ہیں۔ لیکن وہ اپنی طرف سے نیست ہو جاتے ہیں اور وہ نیستی کی کیفیت میں چلے جاتے ہیں، اِس کو فنا کہا جاتا ہے، تو میں نے نیستی اور ہستی کی مثال میں کچھ اور وضاحت کی۔

<u>نفی اور اثبات:</u>

اِس کے بعد نفی اور اِثبات ہے، دیکھیں نفی کے معنی دلائل سے کسی چیز کو باطل قرار دینا یا کہ کسی چیز کے نہ ہونے کا ثبوت پیش کرنا یہ نفی ہے۔ اِثبات کے معنی کسی چیز کے بارے میں ثبوت (پیش) کرنا، کسی صفت کی موجودگی کا ثبوت، کسی حق کا ثبوت اور کسی چیز کی ہستی کا ثبوت یہ اِثبات ہے۔ تو خدا کے بارے میں بھی نفی اور اِثبات کے یہ دو الفاظ آتے ہیں، ہم جب کہتے ہیں کہ خدا بخیل نہیں ہے تو یہ خدا کی صفت سے بخالت کی نفی ہے، جب ہم کہتے ہیں کہ خدا سخی ہے، تو یہ خدا کی سخاوت کا اِثبات ہے، جب کہتے ہیں کہ خدا جھوٹ نہیں بولتا ہے، تو یہ خدا کی صفت سے جھوٹ کی نفی ہے، جب ہم کہتے ہیں کہ خدا اور خدا کا کلام سچ ہے تو یہ اثبات ہے، خدا کی سچائی کا اثبات ہے۔ اِسی طرح نفی اور اثبات کی دو اصطلاحیں آتی ہیں جو کہ چندان مشکل نہیں ہیں اور اِس کی بہت زیادہ وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

<u>وحدت وکثرت:</u>

اِس کے بعد وحدت وکثرت ہے، یہ دونوں اصطلاحیں کافی دلچسپ ہیں، وحدت کے معنی یکتائی اور ایک ہونا اور کثرت کے معنی زیادہ ہونا، بہت ساری چیزیں، تو یہ وحدت خدا کے متعلّق ہے، خدا کی صفت بیان کرنے کے لئے کہا جاتا ہے، خدا میں دوئی نہیں ہے خدا میں کثرت نہیں ہے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر علی

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ^ق.س^ کا پُرحکمت بیان

عنوان: واقعۂ قیامت اور صورِ اسرافیل، دینِ مجسّم

کیسٹ نمبر: ۱۶ تاریخ: ۴۔ ۸۔ ۱۹۷۸، کراچی

Click here for Audio

عزیزو! علم جس کو صحیح معنوں میں علم کہنا چاہیئے ایک عالی قدر شئے ہے، وہ ایک روشنی ہے، وہ ایک نور ہے جو عالمِ بالا سے روشنی دیتا ہے، اُس کو حاصل کرنے کے لئے سخت محنت اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ لوگ جو خیال کرتے ہیں کہ اُن کو کتابوں کے ذریعے سے علم مل رہا ہے، وہ حقیقت میں علم نہیں ہے، وہ ثانوی حیثیت کی چیز ہے۔ وہ وہی علم ہے جو زمانۂ قدیم میں پیغمبروں اور اماموں کی جانب سے بکھرا ہوا تھا اور جس کا تعلّق زیادہ سے زیادہ ماضی سے ہے، اُس علم سے زمانۂ حال کے جدید مسائل حل نہیں ہو سکتے ہیں۔ زمانۂ حال کی اُلجھنیں اور مسائل اُس تازہ ترین علم کی روشنی میں دُور ہو سکتی ہیں جو کہ حقیقی علم کے سرچشمے سے حاصل ہوتا ہو اور علم کا سرچشمہ امامِ زمانؑ ہے۔ اُس کے بغیر جو بھی چیز علم کے نام سے ملے اُس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ علم کا دُوسرا نام ہدایت ہے اور ہدایت کا دُوسرا نام نور ہے۔ پس علم کو ہم نور کہہ سکتے ہیں اور علم کو ہدایت بھی کہہ سکتے ہیں۔

دُنیا والے جس طرح دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کے پاس علم ہے، تو میں پوچھتا ہوں کہ اگر اُن کا یہ دعویٰ حق پر مبنی ہوتا اور واقعتہً اُن کے پاس علم ہوتا یعنی ہدایت ہوتی تو ہدایت میں نہ صرف دین کی کامیابی ہے بلکہ اُس میں دُنیا کی ترقّی بھی ہے، تو جن لوگوں کو علم کا دعویٰ ہے، جن لوگوں کو حقیقی ہدایت کا دعویٰ ہے [جو کہتے ہیں کہ] اُن کے پاس ہدایت ہے، تو میں کہتا ہوں کہ آج وہ لوگ دُنیا میں کامیاب کیوں نہیں ہیں؟ کوئی ایسی قوم دُنیا میں ہے جو دینی طور پر بھی اور دنیاوی طور پر بھی دونوں لحاظ سے کامیاب ہو تو ایسی قوم دُنیا میں کوئی نہیں جو دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے کامیاب ہو۔ یہ اِس لئے ایسا ہے کہ حقیقی رہنمائی اور صحیح ہدایت سے وہ لوگ ہٹ کر ہیں اور اگر وہ لوگ صحیح رہنمائی کو پاتے، دُرست ہدایت تک رسا ہو جاتے، حقیقی علم کو حاصل کر سکتے، تو وہ ہر لحاظ سے کامیاب ہوتے، جیسے رسول اللہ کے زمانے کے مسلمان کامیاب تھے۔ دیکھنا چاہیئے، غور کرنا چاہیئے کہ رسول اللہ کے زمانے میں مسلمان کیوں کر کامیاب تھے؟ اِس لئے کہ اُن کی جمعیت تھی، اِس لئے کہ وہ صحیح رستے پر چلتے تھے، اِس لئے کہ ہادئ زمان کی اطاعت کرتے تھے جو رسولِ برحق تھے، آنحضرتؐ کے بعد مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا، جمعیت نہ رہی، جب جمعیت نہ رہی تو صرف چند مسلمان جو امام کے تابع تھے وہ کس طرح دینی اور

دنیوی طور پر کامیاب ہوسکتے تھے، دینی طور پر اُن کا کامیاب ہونا صحیح ہے لیکن دنیوی طور پر اُن کے پاس جمعیت نہ رہی، تعداد نہ رہی کیونکہ مسلمان جو رسول اللہ کے زمانے میں جمع تھے وہ بکھر گئے۔

بہرحال یہ بات جو میں کرتا ہوں قرآن وحدیث کی روشنی میں ہے اور اِس کے لئے حدیث یہ ہے جو رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ: اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا = میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔ پھر فرمایا کہ: اَنَا دَارُ الْحِکْمَت وَ عَلِیٌّ بَابُھَا = میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے یعنی اِن دونوں حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ علم اور حکمت رسولِ اکرمؐ کی نورانی حیثیت سے باہر نہیں ہے، آنحضرتؐ نے اپنی نورانی حیثیت کو ایک گھر سے تشبیہہ دی ہے، ایک شہر سے تشبیہہ دی ہے کہ آنحضرتؐ کی نورانی حیثیت میں علم وحکمت محدود ہے اور اگر کوئی فردِ بشر اِس علم کے شہر تک پہنچنا چاہے اور حکمت کے اِس گھر تک رسا ہوجانا چاہے تو اُس کے لئے صرف ایک ہی رستہ ہے اور وہ امام کا رستہ ہے اور اُس کے لئے ایک ہی دروازہ ہے اور وہ امامِ زمان کا دروازہ ہے، اُس کی اطاعت وفرمانبرداری کا دروازہ ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ تازہ ترین علم اور جدید مسائل سے متعلّق ہدایت پیغمبر کے نور میں محدود ہے، تو اِس معنی میں جس کسی کو رُوحانی علم ملے گا تو اِسی رستے سے ملے گا اور اِسی دروازے سے داخل ہونے سے ملے گا یعنی کہ امامؑ ہی کے وسیلے سے ملے گا اور اِس کے مطابق قرآنِ پاک کی ایک آیت بھی ہے اور اُس آیت کا ارشاد یہ ہے کہ: وَیَقُولُ الَّذِیْنَ کَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلاً قُلْ کَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْداً بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ وَمَنْ عِندَہٗ عِلْمُ الْکِتَاب (۱۳:۴۳) اے رسولِ اکرم! کافر لوگ کہا کرتے ہیں کہ تم پیغمبر نہیں ہو، آپ اُن کو بتلا دیجئے کہ میں پیغمبر ہوں یا نہیں ہوں اِس کا گواہ اللہ تعالیٰ ہے اور اللہ کے ساتھ ساتھ وہ ہستی اِس بات کی گواہ ہے جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔ کتاب سے مُراد قرآن ہے اور اُس ہستی سے مُراد جس کے پاس قرآن کا علم ہے علیؑ ہے۔ علیؑ چونکہ امامت کا عنوان ہے، علیؑ سے مُراد نورِ امامت ہے اور علیؑ کی تشریح سب امام ہیں، تو اِس آیت سے اور اُس حدیث سے ظاہر ہے کہ وہ علم جو ابھی تک ظاہر نہیں ہوا ہو، جو ظاہر ہونا چاہتا ہے، وہ علم امام کے وسیلے سے ملتا ہے اور رُوحانی طور پر پیغمبرؐ اور امامؑ ایک ہی نور ہیں اور اِس نور تک رسا ہونے کے لئے امام کی شخصیت ہی رستہ ہے اور امام کی شخصیت ہی دروازہ ہے تو مطلب خود ہی صراطِ مستقیم ہے، خود ہی ہادی ہے، خود ہی دروازہ ہے اور نور کے لحاظ سے علم کا شہر ہے اور حکمت کا گھر ہے۔

تو اِس معنی میں، مَیں نے کہا کہ وہ علم جسے صحیح معنوں میں علم کہنا چاہئے وہ امام کے پاس ہے، جب [وہ علم] امامؑ کے پاس ہے تو کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو امامؑ کی شناخت تک پہنچ چکے ہیں، امام کو پہچانتے ہیں اور اُن کو یقینِ کامل حاصل ہے کہ دُنیا زمانے میں نبوّت اور اُلوہیّت کا دروازہ امامؑ ہی ہیں یعنی پیغمبر کی پیغمبری تک پہنچنے کے لئے اور خدا کی خداوندی تک پہنچنے کے لئے، دین میں ایک ہی رستہ ہے اور ایک ہی دروازہ ہے اور وہ رستہ امامؑ ہے اور وہ

دروازہ بھی امامؑ ہے کیونکہ امام کو صراطِ مستقیم بھی کہا گیا ہے کیونکہ دین میں ہر چیز زندہ ہوا کرتی ہے تو خدا کا راستہ امامؑ ہے، خدا کا دین بھی امامؑ ہے، خدا کا قلم، خدا کی تختی، خدا کا عرش، خدا کی کرسی، خدا کا گھر، خدا کا مظہر، اِن تمام مثالوں کا تعلّق براہِ راست امامؑ سے ہے۔ اِس معنی میں کہا گیا کہ امام صراطِ مستقیم ہے یعنی سیدھا راستہ اور اگر دین کو مجسّم اور زندہ مانا جائے تو وہ زندہ دین بھی امامؑ ہی ہے، اسلام ہی ہے، اسلام امامؑ ہی ہے، امام خود اسلام ہے کیونکہ اسلام مسلم کی صفت ہے، تو صفت موصوف میں ہوتی ہے اور اسلام مسلم کی صفت ہے، تو مسلم امامؑ ہے اور اسلام امام کی صفت ہے، جس طرح ایمان مومن کی صفت ہے، ایمان مومن سے الگ کوئی شئ نہیں ہے جب ایمان مومن کی صفت ہے تو اسلام مسلم کی صفت ہے، تو مسلم بھی اور مومن بھی ایک شخص کو ہونا ہے اور سب سے پہلا مسلم اور سب سے پہلا مومن پیغمبرؑ ہے اور امام ہے۔

جس طرح کہ مومن خدا کا بھی نام ہے، یہ ایمان کی بلندی کی علامت ہے کہ مومن خدا کا نام ہے، اِسی طرح مسلم کے معنی عام سے عام بھی ہو سکتے ہیں اور خاص سے خاص بھی ہو سکتے ہیں اور جہاں پر مسلم [کے معنی] خاص سے خاص ہیں تو وہ پیغمبرؑ ہے اور امامؑ ہے، یہاں تک کہ دین بھی امامؑ ہے۔ پیر ناصرِ خسروؒ نے اپنی کتاب وجہ دین میں يَدْخُلُونَ فِيْ دِيْنِ اللّٰه (۱۱۰:۱) کی تاویل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ داعی دین ہے يَدْخُلُونَ فِيْ دِيْنِ اللّٰه سے مُراد کہ داعی کی شخصیت میں رُوحانی ذرّات داخل ہوتے ہیں اور پوری سورہ اِس طرح سے ہے: اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجاً فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهُ كَانَ تَوَّاباً (۱۱۰:۱۔۳) اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْح جب خدا کی مدد اور فتح آ گئی تو اے رسولؐ! تم نے دیکھا کہ لوگ فوج در فوج ہو کر خدا کے دین میں داخل ہو جاتے ہیں، پس اپنے پروردگار کی تعریف کی تسبیح کر اور اُس سے بخشش مانگ کہ وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

مطلب اِس کا یہ ہوا کہ جب آنحضرتؐ پر رُوحانیت کے بڑے کام کے واقعات گزرنے لگے تو حضورؐ نے دیکھا کہ آپ کی ذاتِ عالی صفات میں لوگ ذرّات کی صورت میں داخل ہو رہے تھے، آپ دینِ خدا تھے یعنی خدا کے دین تھے اور لوگ خدا کے دین میں داخل ہو رہے تھے یعنی کتنے سو برس کے بعد دُنیا والے کس طرح خدا کے دین میں داخل ہو جائیں گے اُس کا نمونہ رُوحانیت میں آپ کے سامنے تھا کہ سب لوگ ذرّات کی شکل میں آنحضورؐ کے جسم میں داخل ہو رہے تھے۔ اِسی طرح جب داعی یا حجّت پر رُوحانیت کے واقعات گزرتے ہیں تو اُس وقت اسرافیل صور بجاتا ہے اُس داعی یا حجّت کی شخصیت میں اور پھر دُنیا والے ذرّات بن بن کر اُس داعی میں اور اُس حجّت میں داخل ہوتے ہیں، یہ ہوا خدا کے دین میں سب لوگوں کا داخل ہونا۔ جب یہ تاویل نہ ہو تو پھر کس طرح دُرست ہو سکتا ہے کہ خدا آنحضرتؐ سے کہے کہ سب لوگ خدا کے دین میں داخل ہوتے ہیں۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں سب لوگ خدا کے دین میں داخل نہیں ہوئے تھے، یہ بات تو مٹھی بھر لوگوں سے متعلّق تھی، بہت تھوڑے لوگ خدا کے دین میں داخل ہوئے تھے، عرب کے حدود میں سے، دُنیا والے

سب کے سب کب خدا کے دین میں داخل ہوئے تھے۔

تو یہ بات تاویل میں دُرست ہے کہ آنحضرتؐ کی شخصیت میں دُنیا کے سب لوگ مشرق سے مغرب تک جتنے لوگ اُس زمانے میں بستے تھے سب لوگ آنحضرت کی شخصیت میں داخل ہوئے تھے، یہ ہوا لوگوں کا خدا کے دین میں داخل ہونا۔ خدا کا دین آنحضرت خود تھے اور اِسی طرح ہر زمانے میں خدا کا دین امامؑ ہے اور پھر امامؑ کے بعد حجّت ہے اور حجّت کے بعد داعی خدا کا دین ہے جس میں لوگ رُوحانی طور پر ذرّات بن بن کر داخل ہو جاتے ہیں، یہ ہوا لوگوں کا قیامت کے دن، دینِ خدائی میں داخل ہونا اور قیامت کا دن حجّت کے نزدیک اُس وقت ہے جب کہ اُس پر رُوحانی واقعات گزرتے ہیں اور داعی کے لئے قیامت کا دن اُس وقت ہے جب کہ اُس پر رُوحانی واقعات گزرتے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ کل کو قیامت کے روز جو کچھ ہونا ہے وہ پیشگی طور پر پیغمبر، اساس، امام، حجّت، داعی اور ہر حقیقی مومن کی نظر میں ہے [یعنی] قیامت پیشگی طور پر آتی ہے اور وہ سب کچھ دیکھنے میں آتا ہے جو کچھ کہ قیامت کے دن سامنے آنے والا ہے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ حقیقی مومن کی شخصیت میں ذرّات کی صورت میں لوگ داخل ہوتے ہیں جب کہ اسرافیل صور پھونکتا ہے۔ اِس سلسلے میں ایک آیت پڑھ کر سناؤں، سورۂ یاسین سے: وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ (۳۶:۵۱)۔ جب صور پھونکا جائے گا تو لوگ قبروں سے اُٹھ اُٹھ کر اپنے ربّ کی طرف بھاگ جائیں گے۔ دیکھئے! اِس آیت کی تاویل کرنے سے پیشتر اگر اِس کے ظاہری معنی میں جائیں گے تو عجیب لگے گا اور اِس کا مطلب یوں ظاہر ہوگا [یا] یوں لگے گا جیسے پروردگار کسی مقام پر ہو اور صورِ اسرافیل وہاں سے بجتا ہو تو پھر لوگ قبروں سے اُٹھ اُٹھ کر وہاں جاتے ہوں جہاں پر پروردگار ہے۔ یہ بات ظاہر میں دُرست نہیں ہے، اِس کی تاویل ہے اور تاویل یہ ہے کہ جب کسی شخص پر انفرادی قیامت گزرتی ہے تو اُس وقت اُس کے کان میں اسرافیل صور پھونکتا ہے اور دُنیا بھر کے لوگ ذرّات بن بن کر اُس آدمی، اُس مومن کے پاس جاتے ہیں اور پروردگار کے پاس جانے سے مُراد یہ ہے کہ پروردگار کا اسم جو اسمِ اعظم ہے وہ اُس مومن میں ہے اور ہم یہ بھی مانیں گے کہ جہاں پر پروردگارِ عالم کا اسمِ اعظم ہے وہاں پر اُس کا نور بھی ہے اور وہ سب لوگوں کا پروردگار ہے کہ اُن کی رُوحانی پرورش وہیں سے ہوتی ہے اور کتنی خوشی کی بات ہے کہ جب مومن روزانہ صبح اُٹھ کر کتنے ہزار دفعہ اسمِ اعظم کو پڑھتا ہے تو اُس میں سے جو نورانیت پھیلتی ہے وہ سب رُوحوں کو رُوحانی غذا کی حیثیت سے پہنچتی ہے، اِس معنی میں پروردگار سب رُوحوں کا پروردگار ہے کیونکہ دُنیا میں جتنے نفوس ہیں، جتنی رُوحیں ہیں اُن کی زندگی، اُن کا قیام اور اُن کی بقا البتہ کسی طاقت پر قائم ہے، اگر اُن کو رُوحانی قوت نہ آئے تو وہ ختم ہو جائیں گے، خواہ کافر کیوں نہ ہوں، اُن کو کچھ انرجی، کچھ طاقت رُوحانی طور پر پہنچتی ہے اور جو طاقت اُن کو رُوحانی طور پر پہنچتی ہے یہ اُن کی غذا کا کام دیتی ہے، اِس معنی میں پروردگار، پروردگار ہے۔ پروردگار رُوحوں کا پروردگار اِس معنی میں نہیں کہ وہ رزق و روزی

مہیّا کرتا ہے جس کو لوگ کھاتے ہیں، یہ تو جسم کی بات ہوگئی۔

پروردگار کی ربوبیت اور اُس کی پرورش کا اطلاق سب سے پہلے رُوحوں پر ہونا چاہئے۔ بہرحال وضاحت میں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے مطلب سے دُور چلیں جائیں، تو اِس لئے ہم لوٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہاں مومن میں اسرافیل کا صور بجتا ہے تو اُس صور کی آواز کی طرف لوگوں کے ذرّات بھاگتے جاتے ہیں۔ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ جب صور پھونکا جائے، فَإِذَا هُم پس یکا یک وہ مِنَ الْأَجْدَاثِ قبروں سے إِلَىٰ رَبِّهِمْ اپنے پروردگار کی طرف يَنسِلُونَ بھاگتے ہیں۔ تو دیکھئے! قبروں سے مُراد یہ جسم ہے۔ اب ہم سب کے اجسام جو ہیں وہ قبروں کی حیثیت سے ہیں، اُس میں سے ایک ذرّہ، ایک ایٹم بھاگتا ہے وہاں پر جہاں پر کہ کوئی قیامت برپا ہو رہی ہو۔ مثلاً اس آیت کے مطابق فرض کریں مشرق میں یا مغرب میں ایک حقیقی مومن پر رُوحانیت کی قیامت گزر رہی ہے، تو نامعلوم طور پر ہم میں سے ایک ذرّہ جو کہ ہماری رُوح کے بہت سے ذرّات ہیں اُن میں سے ایک ذرّہ ہماری نمائندگی کرتے ہوئے اُس مومن کے پاس رُوحانی طور پر پہنچے گا کیونکہ وہاں صورِ اسرافیل بج رہا ہے کیونکہ وہاں پروردگار ہے۔

تو اس معنی میں اُس ذرّے کے لئے ہمارا یہ جسم جو ہے وہ قبر کی حیثیت رکھتا ہے، تو اِس قبر میں وہ ذرّہ سویا ہوا تھا، اب اسرافیل کا صور بج گیا تو اِس جسم کو چھوڑ کر وہ ذرّہ بھاگے گا، معلوم نہیں اِن ذرّات میں سے کون سا خوش نصیب ذرّہ ہے جو قیامت کے مقام میں حاضر ہو جاتا ہے۔ تو پھر وہ ذرّہ ہماری نمائندگی کرتے ہوئے وہاں حاضر ہو جائے گا اور قیامت کا منظر وہاں دیکھے گا اور اُس پر قیامت گزرے گی، کچھ عرصے کے لئے اُس ہستی میں جس پر کہ قیامت گزری ہے یہ ذرّہ حاضر رہے گا اور اُس کی رُوحانی پرورش ہوتی رہے گی اور بہت سے واقعات اُس ذرّے پر گزریں گے، درحالیکہ ہم کو اِس کا پتا نہیں ہے، ہم کو معلوم نہیں ہے کہ ہمارے جسم میں سے ایک ذرہ گیا ہے، تو ہم کو پتا نہیں ہے، ہم کو پتا نہیں چلے گا۔ اب اِس مقام پر ایک اور خاص بات کہنے کی ہے کہ خدا جو ہم سے پوچھتا ہے واقعۂ الست میں: وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ (۷:۱۷۲)۔ میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے آدمؑ کے پیدا کئے جانے کے بعد اور اُس میں سے بہت کچھ اولاد ہونے کے بعد، خود آدم سے نہیں، آدم کی اولاد کی پشتوں میں سے رُوحوں کو لیا، تو اِس سے ظاہر ہے کہ الست کا جو واقعہ ہے وہ آدمؑ سے آگے نہیں جاتا ہے بلکہ آدم سے اِس طرف آتا ہے چونکہ اِس آیت سے ظاہر ہے کہ جن کی پشتوں سے خدا نے رُوحوں کو لے کر پوچھا تھا کہ: آیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو وہ لوگ آدم کی اولاد ہیں [یعنی] بنی آدم ہیں۔

آدم خود آدم نہیں ہے، آدم سے کئی کئی پشتوں کے بعد خدا نے یہ کام کیا اور رُوحوں کو اُن کی پیٹھ سے [یا] پشت سے لے کر۔ عجیب بات ہے کہ خدا اُن لوگوں کی پشت میں جو رُوحیں تھیں وہیں پر [اُن سے] پوچھتا نہیں ہے، اُن کی پشت سے

لیتا ہے تو کہاں لیتا ہے؟ اِس کا پتا نہیں ہے، اِس کا پتا رُوحانیت سے چلتا ہے، یہ کہ خدا اِن رُوحوں کو وہاں لے جاتا ہے جہاں پر کسی مومن پر رُوحانیت کے واقعات گزرتے ہیں اور پشت سے مُراد سب لوگوں سے، بنی آدم کی پشت سے، [یعنی] بنی آدم سب لوگ ہیں، دُنیا کے اندر جتنے لوگ بستے ہیں وہ سب آدم کی اولاد ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ [خدا] ایک مومن پر یا حجّت پر یا داعی پر جو قیامت کا منظر گزرتا ہے تو وہاں پر اِن آدمیوں کی پشت سے رُوحوں کو لیتا ہے اور وہاں پر روشنی ہے، شعور ہے، وہاں پر اِن روحوں کو پہنچاتا ہے۔ پہنچانے کے بعد اِن ذرّات کو شعور ملتا ہے چونکہ وہاں اسمِ اعظم عمل میں ہے، Action میں ہے اور اسمِ اعظم روشنی دے رہا ہے تو اُس روشنی میں پہنچاتا ہے، وہاں پر قیامت ہے، وہاں پر ازل اور ابد ایک ہو رہے ہیں اور وہاں پر الست کا مقام ہے۔ تو خدا پوچھتا ہے، کیا پوچھتا ہے؟ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ چونکہ وہاں پر Feeding ہوتی ہیں، پروردگار کا ثبوت ملتا ہے، غذا ملتی ہے اور خدا کا دیدار ہوتا ہے اور سب کچھ ہوتا ہے، تو اُن کو روشنی میں رکھ کر، اُن کو شعور دے کر خدا پوچھتا ہے، تاریکی میں لاشعوری میں نہیں پوچھتا ہے۔

خدا کے عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی سے اگر کچھ پوچھنا ہے تو اُس کو پہلے شعور دے، عقل دے، روشنی دے، علم دے، پہچان یعنی معرفت دے، تب پوچھے تو اب اِس میں کہنے والا جو کچھ بھی کہے گا وہ صحیح ہوگا، ایسا نہیں کہ خواب میں پوچھے، ایسا نہیں کہ لاشعوری کیفیت میں پوچھے، پھر ہم کو جتلائے کہ میں نے تم سے پوچھا تھا، یہ تو خدا کی خدائی نہیں ہوئی، کوئی انسان جو عقل و دانش رکھتا ہے ایسا نہیں کرے گا کہ کسی کو دھوکے میں ڈالے اور لاشعوری طور پر یا مستی کے عالم میں یا بچپن میں کوئی بات پوچھے، یہ بات نہیں ہے، تو جہاں خدا کہتا ہے کہ میں نے پوچھا، تو اِس کے معنی شعور کے ہیں، عقل کے ہیں، روشنی کے ہیں اور دیدۂ دل یعنی دل کی آنکھ کھلنے کے ہیں۔ جب ذرّات وہاں پہنچتے ہیں، جب خدا اُن ذرّات کو اپنی حکمت سے وہاں پہنچاتا ہے جہاں پر کہ قیامت Action میں ہے، جہاں پر کہ اسمِ اعظم کام کرتا ہے اور روشنی پھیلا رہا ہے تو اُس وقت خدا نے پوچھا اور رُوحوں نے جو کچھ کہا، صحیح کہا: قَالُوا بَلٰی انہوں نے دیکھا کہ پروردگار رُوحانی طور پر رُوحوں کی پرورش کر رہا ہے اور اُس کے پاس سب بندوبست ہے، تو انہوں نے جان بوجھ کر عقل و دانش کی روشنی میں کہا کہ ہاں! آپ ہمارے پروردگار ہیں۔

تو میں اِس بات کی وضاحت کر رہا ہوں کہ رُوح کی نمائندگی کس طرح ہوتی ہے اور قیامت کس طرح آتی ہے اور یہ تشریح یہاں سے پیدا ہوئی ہم کہہ رہے تھے کہ خدا کا دین جو ہے وہ دینِ مجسم ہے، ایک زندہ شخصیت خدا کا دین ہے۔ تو خدا کا دین سب سے پہلے پیغمبر ہے اور اُس کے بعد خدا کا دین اساس ہے، پھر امام ہے خدا کا دین، حجّت خدا کا دین ہے، داعی خدا کا دین ہے، ہم میں ہر ایک اگر درجۂ کمال کو پہنچے تو خدا کا دین ہے۔ تو اسماعیلی نظریے کے مطابق خدا کی ہر چیز زندہ اور مجسم ہوا کرتی ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا علم کی بات تھی کہ آپ نے اندازہ کیا، کیا یہ علم جو امام کا علم ہے، یہ علم جو رُوحانیت کا علم

ہے، کیا ہر شخص کے پاس ہوسکتا ہے؟ ایسا علم نہیں ہوسکتا ہے، یہ ہے علم۔

اب اِس گفتگو کی روشنی میں قیامت کی جو تشریح ہوئی، قبر کی جو تاویل ہوئی اور اسرافیل کی جو وضاحت ہوئی اِس کو ایک طرف رکھیں اور کتابوں میں جو کچھ اِس سلسلے میں لکھا گیا ہے اُس کو اِس طرف رکھیں، اِس لئے میں نے کہا تھا کہ کتابوں میں علم نہیں ہے۔ ابھی آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ کتابوں میں اصل چیز نہیں ہے، اصل چیز کتاب میں نہیں ہوتی ہے اگر کتاب میں علم آسکتا اور وہاں پر علم ٹھہر سکتا تو پھر دُنیا میں پیغمبروں کے آنے اور اماموں کے ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ جس طرح سورج کی روشنی کو Store نہیں کیا جاسکتا ہے، ہر وقت روشنی چاہئے، بس اِس کے سوا اور کوئی بندوبست نہیں ہے، دن کے وقت روشنی کو جمع کریں اور رات کو استعمال کریں ایسا تو نہیں ہوسکتا ہے، بس یہ ہے کہ روشنی کا کوئی سرچشمہ ہونا چاہئے، اِس کے بغیر بکھری ہوئی روشنی کو آپ جمع کر کے اُس سے کام نہیں لے سکتے ہیں۔ تو علم اور ہدایت کی بھی یہی مثال ہے، ہدایت جو پیغمبروں نے اماموں نے بکھیر دی ہیں اُس کو جمع کر کے اُس سے ہدایت نہیں لی جاسکتی ہے، اگر ہدایت اِس سے مل سکتی ہے تو آپ اِس تذکرے میں غور کریں جو میں نے ابھی بتایا کہ اصل علم کیا ہے اور نقلی علم کیا ہے، اِس کی میں نے مثال دی۔

بہرحال یہ آپ کو احساس دلانے کے لئے ہے کہ براہِ راست علم حاصل کرنے کے لئے کوشش کی جائے یا تازہ ترین علم کو جس طرح حاصل کرنا چاہئے یا جس طرح سننا چاہئے، اِس طرح سے سنا جائے اور اِس کے بغیر ہماری رُوح کی تکمیل نہیں ہوسکتی ہے اور رُوح کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا ہے اور جب تک لوگوں کو اِس رُوحانی علم کا پتا نہیں ہے تو وہ کتاب کی باتوں کو علم ہی سمجھتے ہیں اور اُس کا نام علم رکھتے ہیں اور دیکھئے! اگر آج اسلام کے سب فرقے حق پر ہوتے اور اُن کو ہدایت ملتی تو وہ الگ الگ نہیں ہوتے، ایک ہی اسلام ہوتا، اسلام کے اتنے کثرت سے فرقے نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کو انہوں نے ہدایت سمجھ رکھا ہے وہ ہدایت نہیں ہے، ہدایت اُس چیز کو کہنا چاہئے جس کے نتیجے میں کوئی منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہوجائے۔ اگر ہم سب کا راستہ ایک ہوتا اور سب ہدایت کے راستے پر چلتے تو آج ایک دُوسرے سے اختلاف نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ سب حق پر نہیں ہوسکتے ہیں، اُن میں سے صرف ایک جماعت حق پر ہے، جو ہدایت والی جماعت ہے اور امامؑ کی جماعت ہے۔ ویسے تو دُنیا کا اصول ہے کہ ہر کوئی خود کو حق قرار دیتا ہے، اپنی بات کو حق جتلاتا ہے اور دُوسرے کو باطل قرار دیتا ہے لیکن نہیں، حق جو ہے وہ حق ہے اور جو راستی ہے، سچائی ہے، جو ہدایت ہے وہ ہدایت ہے۔

بہرحال ہمیں اگر شکرگزاری کرنی ہے تو عملاً شکرگزاری کرنی چاہئے یعنی جو چیز ہے اُس چیز کو ہم لیں تو تب ہم سے قدردانی ہوگی یا اُس کو لینے کے لئے ہمیں کوشش کرنی چاہئے، ہمیں کوشان رہنا چاہئے، تب کہا جائے گا کہ ہم شکرگزار ہیں، اگر ہم اُس چیز کے لینے کے لئے شوق نہیں رکھتے اور زبانی زبانی کہتے ہیں کہ شکر ہے، تو یہ محض زبانی شکر ہوگا۔ ہمیں سخت محنت کرنے کی ضرورت ہے چونکہ یقین ہے کہ جس رستے پہ چل رہے ہیں وہ کامیابی کا رستہ ہے اور حقیقت کا رستہ ہے، جب

ہم کو یقین ہے کہ ہم راہِ راست پر ہیں تو ہمیں چلنے میں سستی نہیں کرنی چاہیئے۔

میرے خیال میں عرصے سے ہم اپنی جمعیت کے ساتھ جدو جہد کرتے [رہے] ہیں، اِس میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ان شاء اللہ آپ نے ہم نے جو کچھ کام کیا ہے وہ اپنی جماعت اور اپنے مذہب کے لئے بہت ہی مفید کام ہے، لیکن اِس کے ساتھ ساتھ ہماری خواہش ہے کہ ہمارے عزیز خود بھی علم کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھائیں، دُوسروں کے فائدہ اُٹھانے میں ذرا بھی شک نہیں ہے، جو کچھ کارنامے انجام دیئے گئے ہیں وہ سب دُوسرے اسماعیلیوں کے لئے بہت ہی مفید اور بہت ہی نتیجہ خیز ہیں۔ تاہم اپنے طور پر بھی زیادہ کوشش کی جائے یعنی علم کی دولت سے مالامال ہو جائیں اور اِس میں مایوسی کی بات نہیں ہے۔ اب تک آپ نے جو کچھ ذاتی طور پر سیکھنے سمجھنے کے سلسلے میں کوشش کی ہیں وہ قابلِ قدر ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ رُوحانی علم کی دولت سے مالامال ہو جائیں، تو زیادہ بہتر ہے تاکہ اِس سے خاطر خواہ فائدہ ہو۔ آپ جو قربانیاں دے رہے ہیں، جو خدمت انجام دے رہے ہیں وہ بے مثال ہے اور کافی کارنامے ہوئے ہیں۔ میں ہر بار کہتا ہوں لیکن اب [آپ] اور زیادہ سے زیادہ خود کو علم کی دولت سے آراستہ کریں اور علم کے زیور سے خود کو سجائیں تو زیادہ بہتر ہوگا اور بہت ہی اچھا رہے گا کہ آپ نے خود کو علم کی دولت سے مالامال کیا اور دُوسروں کو بھی مالامال کرنے کے لئے خدمات انجام دیں۔

تو بہت زیادہ اِس میں کوشش ہو اور ساتھ ہی میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ ہماری جمعیت میں سے بہت بڑے بڑے اسکالرز پیدا ہو جائیں تو پھر ہمیں بہت ہی خوشی ہوگی اور ہمارے لوگوں کو اِس کا احساس ہوگا کہ ہمارا جو کام تھا وہ بہت اچھا تھا اور مفید کام تھا کہ ہم نے نہ صرف کتابیں بکھیر دیں بلکہ اسکالرز بھی پیدا کئے، ایسا ہونا چاہیئے، یہ ہماری نیّت ہے اور یہ ہماری دُعا ہے۔ اِس کے لئے آپ کو جو بھی اچھا مشورہ سوجھے وہ کہیں کہ کس طرح ہم زیادہ سے زیادہ علم کو کمائیں یعنی پہلے خود کو علم سے، علم کی دولت سے، علم کے خزانوں سے مالامال کریں، ہم میں جو نئی عمر کے ہیں اُن کو بہت زیادہ علم دیں، ہم میں جو زیادہ قابل ہیں اُن کو زیادہ حوصلہ دیں کہ وہ ہماری جمعیت کی طرف سے ہماری جماعت کو سمجھائیں، علم دیں، اور جہالت کے خلاف جنگ کریں اور جن باتوں میں کمزوری ہے اُن میں جماعت کو سمجھائیں، افراد کو سمجھائیں اور جماعتی لیول پہ کام کریں، انفرادی طور پہ کام کریں اور وعظ و نصیحت ایسی ہو کہ لوگ حیرت زدہ ہو جائیں اور اُن کو تعجب ہو اور اُن کو فائدہ ہو، تو یہ ہونا چاہیئے۔

ایک طرح سے یہ جمعیت ایک ٹریننگ سینٹر کی طرح ہونی چاہیئے، اِن مجالس سے زیادہ سے زیادہ علمی فائدہ ہونا چاہیئے، کبھی کبھار ہم عبادت بندگی بھی کریں گے، گریہ وزاری بھی کریں گے چونکہ ہمارے پاس، ہماری جمعیت کے پاس بہت سی چیزیں ہیں، بہت سے طریقے ہیں اور جیسی جگہ ہوگی اُس کے مطابق ہم کام کریں گے، اگر ہم ٹیکری [آغا خان

ٹکیری] پر ہیں یا کسی ایسی جگہ پر ہیں تو وہاں پر ہم گریہ وزاری بھی کریں گے اور اگر ہم ایسی جگہ پر ہیں کہ جہاں پر خاموشی سے عبادت کرنی چاہئے یا علم کی باتیں بتلانی چاہئیں تو وہ بھی ہونا چاہئے۔ تو ہمارے پاس ہر قسم کے طریقے ہیں، اُن طریقوں سے فائدہ اٹھا کر خود کو اور دُوسروں کو طاقت پہنچانا چاہئے۔ میں یہ بہت پسند کرتا ہوں کہ ہر بار اجتماع میں آنے کے بعد نئی نئی باتیں ملیں تا کہ ممبران کو فائدہ ہو اُن کو دلچسپی ہو، ہر بار ایک نہیں بلکہ کئی نئی باتیں ملیں، تاویل کی، حکمت کی، رُوح کی، قیامت کی، فرشتوں کی، امام کی تا کہ اُن کو معلوم ہو کہ امامؑ کا علم کیسا علم ہے، رُوحانی علم کیسا علم ہے؟ اور معرفت کیا چیز ہوتی ہے، رُوحانیت کس چیز کا نام ہے؟ اور روحانی علم کتنا انقلابی علم ہے؟ تو بے شک ہمارے نظریات میں انقلاب آوے تو آوے اور انقلاب کے بغیر ترقّی کیسے ہو، ترقّی کرنی ہے تو انقلاب کی ضرورت ہے اور انقلاب ہر مقام پر کامیاب ہے، انقلاب پُرانی عمارت کو گرا کر نئی عمارت کو قائم کرنا یہ بھی انقلاب ہے اور اپنے نظریات کی تجدید کرنا اور اُن کو دیکھنا اور جس نظریے کی تجدید کی ضرورت ہو اُس کی تجدید کرنا، اُس میں Renew کرنا یہ بھی انقلاب ہے اور انقلاب ہی چاہئے، انقلابی کوشش کے بغیر، انقلابی تعلیم کے بغیر ہم دُوسروں سے آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں، ہم تو یہ چاہتے ہیں۔

کاش ہمارے پاس وقت ہوتا اور آپ سب کو شوق ہوتا تو میں قرآن کے اِس سرے سے شروع کر کے اُس سرے تک فلسفے کے طور پر، تاویل کے طور پر پڑھاتا، تو آپ کو پتا چلتا کہ کس طرح امامؑ کے پاس قرآن کا علم ہے اور وہ کس طرح اپنے مریدوں کو پہنچاتا ہے؟ اور امامؑ قرآن کی حکمت کس طرح سکھاتا ہے؟ جب ہم کبھی کہتے ہیں کہ امام معلّمِ قرآن ہے، تو بعض لوگوں کو اِس بات سے تعجب ہوتا ہوگا وہ سوچتے ہوں گے کہ کبھی کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ امام کسی ہال میں بیٹھیں اور قرآن پر لیکچر دیں، لوگوں کو امامؑ کے معلّم ہونے میں تعجب ہوتا ہوگا حالانکہ جاننے والا ہی جانتا ہے کہ امامؑ بے شک معلّمِ قرآن ہے، وہ نورِ قرآن ہے، وہ آسمانی کتاب کے معلّم ہیں، اُس کی تعلیم رُوحانی طور پر ہے۔ جس طرح خدا نے آدمؑ کو تعلیم دی تھی، تو اس میں خدا سامنے آ کر کسی دنیوی ملّا، مولوی کی طرح مکتب میں بیٹھ کر آدم کو درس نہیں دیا تھا، خدا نے آدم کو جو علم الاسماء کی تعلیم دی تھی وہ معجزانہ تعلیم تھی، وہ رُوحانی تعلیم تھی، وہ آٹو میٹک تھی۔ دُنیا میں بھی دو طرح سے کام ہوا کرتا ہے، مادّی کاموں کی مثال لیں، تو کچھ کام ایسے ہیں کہ یعنی وہ ہاتھ سے ہوتا ہے، کچھ کام ایسے ہیں کہ بس یہ بٹن کو دبائیں وہ کام خود بخود ہوتا رہے گا، جب انسانوں کی یہ ہمّت ہے کہ اُن کی بنائی ہوئی مشینوں سے آٹو میٹک کام چلتا ہے، تو کیا خدا، پیغمبرؑ اور امامؑ کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ کچھ عجیب طریقے سے تعلیم دیں۔ اِس میں کیا شک ہے، مومن کے لئے کوئی شک نہیں ہے، لیکن سمجھنے کی ضرورت ہے، مثال کی ضرورت ہے کہ رُوحانی تعلیم معجزاتی تعلیم ہے وہ Miraculous ہے، وہ خود بخود دلوں میں اور دماغوں میں ہوتی رہتی ہے اور جس مثال کی طرف میں نے تھوڑا سا اشارہ کیا ابھی ابھی کہ جب رُوحانیت کا واقعہ گزرتا ہے، جب انفرادی قیامت آتی ہے، تو اُس میں سب تعلیمات سامنے آتی ہیں، سب تعلیمات سامنے

آتی ہیں اور اُس میں قرآن کی بھی تعلیم ہے۔

ہمارے بھائیوں اور بہنوں میں سے ایسے بھی ہوسکتے ہیں جن پر قیامت گزری ہوئی ہوگی لیکن اُن کے پاس ظاہری علم نہ ہونے کی وجہ سے وہ تاویل کو، اپنے روحانی واقعات کو قرآن سے نہیں ملا سکتے ہوں گے۔ اِس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک تو ظاہری علم کی ضرورت ہے ایک رُوحانی عبادت کی ضرورت ہے، اگر ظاہری علم نہ ہو قرآن کا ظاہری علم نہ ہو تو وہ ظاہری علم کو باطنی علم سے نہیں ملا سکتے ہیں، باور تو کرتے ہیں کہ اُن پر کچھ گزر گیا لیکن وہ اُس کو نہیں سمجھتے ہیں، اِس لئے بڑے کام سے پیشتر یا اُس کے ساتھ ساتھ ظاہری علم کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ یقین کے تین درجات ہیں سب سے اُوپر حق الیقین ہے اور اُس کے نیچے عین الیقین ہے، اِس کے نیچے علم الیقین ہے، گویا عروج کا، ترقّی کا پہلا زینہ علم الیقین ہے، دُوسرا زینہ عین الیقین ہے، آخری زینہ یقین کا حق الیقین ہے، تو پہلا زینہ نہ ہو تو دُوسرے زینے پر کس طرح چڑھا جا سکتا ہے۔ اگر کورس کو مکمل کرنا ہے تو ظاہری علم کی طرف توجہ دی جائے خواہ وہ علم زبانی ہو یا کتاب کی صورت میں ہو۔ تو ظاہری علم بذاتِ خود کچھ بھی نہیں لیکن اگر اُس سے آگے بڑھ کر رُوحانی علم تک پہنچا جائے تو ظاہری علم بہت مفید ہے، ورنہ بے مقصد ہے کیونکہ وہ بذاتِ خود کچھ بھی نہیں ہے۔ اِس لئے قرآن کا ظاہری علم چاہئے تا کہ اُس کی حکمت حاصل ہو، اِس لئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ''پیغمبر مومنین کو کتاب سکھاتا ہے اور حکمت سکھاتا ہے'' (۲:۱۵۱)۔ اِس میں دو باتیں ہیں، پہلے قرآن سکھاتا ہے پھر حکمت سکھاتا ہے، کیوں نہیں کہا گیا کہ کتاب کو چھوڑ کر حکمت سکھاتا ہے، کتاب کو چھوڑ کر حکمت کا سکھانا ممکن نہیں ہے، تو پہلے کتاب اور اُس کے بعد حکمت، قرآن کے ظاہر کو سمجھیں تو باطن کا جو مغز ہے وہ سمجھ میں آسکتا ہے، تنزیل کے بعد تاویل دُرست ہے اور تنزیل کے بغیر تاویل سمجھ میں نہیں آسکتی ہے۔

میں بات کر رہا تھا کہ ہمارے بہت سے بھائی اور بہن ہوسکتے ہیں جنہوں نے بڑے کام میں کافی کامیابی [حاصل] کی ہو لیکن وہ اُس کو دُوسروں پر ظاہر نہیں کر سکتے ہوں یا کہ اُس کی تشریح نہیں کر سکتے ہیں اور حقیقت کو نہیں سمجھا سکتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امامؑ بڑے پیمانے پر ترقّی اُن کو دیتا ہو جن کے پاس علم کی تیاری ہو۔ بیت الخیال تک جانا اور خیالات کی روشنی دیکھنا یہ تو بہت ہی آسان بات ہے، اِس کے لئے صرف ایمانداری، تقویٰ اور شب خیزی کی تیاری کی ضرورت ہے اور بڑا کام اس معنی میں بڑا کام ہے یا بڑے کام کے سلسلے میں جو پیروں، بزرگوں کا درجہ ہے اُس تک پہنچنے کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو معمولی سی ترقّی کرنی ہے تو یہ معمولی سی ترقّی ہوسکتی ہے، اگر کسی کو بہت بڑے پیمانے پر کام کرنا ہے تو اُن کو چاہئے کہ سب سے پہلے ظاہری علم ہے جس سے میری مراد اسماعیلی نظریے کے مطابق ظاہری علم ہے اُس کو اپنانا چاہئے۔ بزرگانِ دین کی کتابوں کو، فلسفے کو، دینی فلسفے کو اور اِس قسم کی چیزوں کو لینا چاہئے یعنی علم الیقین، جس کو کہتے ہیں، تو علم الیقین ہو تو عین الیقین ہوسکتا ہے۔ علم الیقین سے مُراد صاف ستھرا علم جس سے کہ ظاہری طور پر شکوک وشبہات کا ازالہ

ہوسکتا ہو جس سے کہ ہم کو تسلّی اور تشفی ہوتی ہو، جس سے کہ ہم کو اطمینان ہوتا ہو، جس سے کہ ہمارے سوالات حل ہو جاتے ہوں، یہ علم الیقین ہے۔ پھر اِس کی مدد سے ہم حق الیقین کی روشنی تک پہنچ سکتے ہیں۔ تو پہلے ہمارے شکوک وشبہات کا ازالہ ہونا چاہئے اور علم الیقین جس معنی میں علم الیقین ہے اُس کو سمجھنا چاہئے، اُس کو حاصل کرنا چاہئے یہ علم الیقین ایسی مجالس سے اور ایسی باتوں سے حاصل ہوسکتا ہے۔

پہلے مرحلے میں علم الیقین کے لئے بندوبست ہو اور جب عین الیقین کا مقام آئے گا تو خود بخود آپ ذاتی رُوحانی مشاہدہ سے چیزوں کو دیکھنے لگیں گے، بہت ہی شاندار مشاہدہ ہے جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا وہ عین الیقین کی باتیں تھیں مگر اُستاد جب آپ کو اپنے مشاہدات کی باتیں بتلاتا ہے تو وہ آپ کے حق میں علم الیقین ہے، اُس کے لئے عین الیقین ہے۔ جس طرح کہ علمِ غیب جب غیب سے ظہور میں آتا ہے تو وہ علمِ غیب نہیں رہتا ہے، وہ علمِ ظاہر ہو جاتا ہے، اسی طرح عین الیقین کی باتیں جب نیچے کو آتی ہیں اُستاد کی زبان کے ذریعے سے تو وہ علم الیقین کی باتیں بن جاتی ہیں۔ آسمان کی چیز جب زمین پر آتی ہے تو وہ زمینی چیز بن جاتی ہے، بادل سے جب بارش برستی ہے تو زمین پر بہنے والے پانی کو بادل نہیں کہا جاتا ہے، وحی کے ذریعے سے جب علم کی چیزیں ظاہر ہو جاتی ہیں تو وہ علم تنزیل ہی ہوتا ہے۔

اِسی طرح جب آپ کو کوئی کامل استاد مشاہدے کی باتیں بتلائے گا تو وہ آپ کے لئے علم الیقین ہے، اُس نے عین الیقین سے بتایا اور جب آپ عین الیقین کے مقام پر پہنچیں گے تو ظاہری باتیں بھی آپ کو عین الیقین کے مقام پر نظر آنے لگیں گی، تو ہر چیز کو آپ عین الیقین کے مقام پر دیکھیں گے، زمین کی چیزوں کو آپ آسمان پر اور ظاہر کی چیزوں کو باطن میں دیکھنے لگیں گے اور دُنیا کی چیزوں کو آخرت میں دیکھنے لگیں گے کہ دُنیا کی چیزیں آخرت میں کیسی ہیں، کس طرح ہیں اور ظاہری چیزیں باطن میں کس رنگ سے نمودار ہو جاتی ہیں یہ ہے رُوحانیت کی باتیں اور حقیقی علم کی باتیں جس کو علمِ لدّنی کہا جاتا ہے۔

ٹرانسکرائب: فرحت جناح ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان
عنوان: عقلِ کُلّی نفسِ کُلّی اور جسمِ کُلّی، مونو ریلزم
کیسٹ نمبر: ۱۷   تاریخ: ۱۰۔ ۸۔ ۱۹۷۸، کراچی

علم خداوندی کی بہت بڑی مہربانی ہے اور علم ایک اعلیٰ گوہر ہے، ایک موتی ہے۔ علم اور معرفت اللہ تعالیٰ کا عرش ہے خدا کا نور، خدا کی توحید ہے۔ اللہ کی Unity علم اور معرفت کے تخت پر ہے۔ خدا کی توحید وہی مومن سمجھ سکتا ہے جس نے اپنے دل کے اندر علم اور معرفت کا تخت قائم کیا ہو، کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ایک عرش یعنی تخت ہے۔ عرش کے معنی تخت کے ہیں، تو اِس سے مُراد علم اور معرفت ہے، نہ کہ کوئی مادّی تخت، اللہ کوئی جسم نہیں ہے کہ اُس کے لئے ایک جسمانی تخت کی ضرورت ہو، اللہ تو ایک حقیقت ہے، اللہ ایک وحدانیت ہے یعنی توحید اور Unity ہے۔ تو اُس کے لئے تخت علم ومعرفت کا ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا تخت علم کا ہے اور معرفت کا ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند نے حدیثِ قدسی میں ارشاد فرمایا کہ:
لَا یَسَعُنِیۡ ارضی ولا سمائی و یَسَعُنِیۡ قلبُ عبدِیَ المؤمِنِ التّقِی۔ میری زمین مجھ کو سمو نہیں سکتی، مجھ کو میرا آسمان سمو نہیں سکتا، مجھ کو اگر کوئی چیز سمو سکتی ہے تو وہ میرے بندۂ مومن کا قلب یعنی دل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ صرف بندۂ مومن کے دل میں سمو سکتا ہے۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ جو ذات آسمان میں سموتی نہیں ہے، زمین میں سموتی نہیں ہے وہ ذات بندۂ مومن کے دل میں کس طرح سمو سکتی ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اللہ کوئی مادّی شئی نہیں ہے وہ ایک حقیقت ہے، وہ ایک نور ہے، وہ ایک وحدت اور یگانگت ہے۔ لہٰذا بندۂ مومن کا دل ہی اِس قابل ہے کہ خدا کی حقیقت کو اپنے اندر سمولے یعنی خدا کی توحید کو بندۂ مومن ہی معرفت اور علم کی روشنی میں سمجھ سکتا ہے، یہ ہوئے معنی بندۂ مومن کے دل میں خدا کے سماجانے کے۔

<u>تو میں علم کی تعریف کر رہا تھا کہ علم ایک گوہر ہے، علم عقل کے گوہر میں ہے یعنی عقل کے موتی میں ہے۔</u> عقلِ کُلّ کے موتی میں، عقلِ کُل جو ایک مثال میں موتی ہے اُس سے علم ہے، علم کا سرچشمہ عقلِ کُل ہے اور مثال میں بتایا گیا ہے کہ یہ مادّی کائنات اپنی وُسعت اور اپنی عظمت کے ساتھ نفسِ کُلّی کے گھیرے میں ہے۔ جیسا کہ آیت الکرسی میں ہے کہ: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲:۲۵۵)۔ اللہ کی کرسی نے اس عظیم کائنات کو اپنے اندر سمولیا ہے، یعنی اللہ کی جو کرسی ہے وہ محیط ہے وہ حاوی ہے، اِس مادّی کائنات پر اور یہ مادّی کائنات اپنی بے پناہ وسعتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کرسی میں سموئی ہوئی ہے۔
اب یہاں کرسی سے مُراد وہ نہیں [جس پر] انسان بیٹھتا ہے، کرسی کا مطلب Dais ہے، کرسی کا مطلب Stage ہے،

کرسی کے معنی چبوترا ہے۔کسی بادشاہ کے تخت کو رکھنے کے لئے جو بلند جگہ بنائی جاتی ہے اُسے چبوترا یاDais یاStage کہا جاتا ہے،تو اُس کو کرسی کہا جاتا ہے اور یہاں اُس خدا کی کرسی سے مراد نفس کُلّی ہے۔نفس کُلّی نے اِس عظیم کائنات کو اپنے اندر ڈبولیا ہے یا سمولیا ہے،مُراد یہ ہے کہ نفس کُلّی رُوحوں کا ایک عظیم سمندر ہے،اُس عظیم سمندر کے اندر یہ مادّی کائنات اپنی بے پناہ وسعتوں کے ساتھ ڈوب گئی ہے یہ ہوئے معنی خدا کی کرسی میں آسمان وزمین اور پوری کائنات کے سمو جانے کے۔اب میں کہوں گا کہ یہ عظیم کائنات نفس کُلّی کے سمندر میں ڈوبی ہوئی ہے،تو پھر نفس کُلّی کا جو سمندر ہے وہ کس میں ڈوبا ہوا ہے؟ اُس کے لئے بزرگانِ دین بتلاتے ہیں کہ نفس کُلّی کا جو سمندر ہے وہ عقلِ کُلّی کے سمندر میں غرق ہے،نفس کُلّی کا جو عظیم سمندر ہے جو بے پناہ سمندر ہے،نفس کُلّی کا جو بے پایان وبیکران سمندر ہے وہ عقلِ کُلّی کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ جس طرح یہ کائنات نفس کُلّی کے گھیرے میں ہے یا جس طرح یہ کائنات نفس کُلّی کے سمندر میں ڈوبی ہوئی ہے،اِسی طرح نفس کُلّی عقلِ کُلّی کے گھیرے میں ہے یا کہنا چاہئے کہ نفس کُلّی پر عقلِ کُلّی محیط ہے۔

آپ ایک دائرہ فرض کریں جو پرکار سے بناتے ہیں،اِس دائرے کے گرداگرد ایک اور دائرہ ذرا وسیع کھینچیں،تو یہ دو دائرے کیا ہوئے،اندر والا جو دائرہ ہے وہ جسم کُلّی ہے،Universe،کائنات،آسمان،زمین ہے اور اِس کے باہر جو ابھی آپ نے ایک دائرہ فرض کرلیا یا کہ دائرہ کھینچا وہ نفس کُلّی ہے،تو جس طرح وسیع دائرہ محدود دائرے پر محیط ہے یا جس طرح بڑے دائرے کے اندر چھوٹا دائرہ محدود ہے،اِسی طرح اِس کائنات پر نفس کُلّی محیط ہے۔اب یہ بات ہوگئی،اِس کے بعد ایک تیسرا دائرہ کھینچیں جو کہ دُوسرے دائرے سے زیادہ وسیع ہو،اب یہ تیسرا دائرہ جو دو دائروں کو اپنے اندر محدود کرتا ہے وہ کیا ہے،وہ عقلِ کُلّی ہے،وہ عقلِ کُلّی ہے کہ عقلِ کُلّی نے نفس کُلّی کو گھیر لیا ہے،نفس کُلّی نے جسمِ کُلّی کو گھیر لیا ہے،تو تین چیزیں ہوگئیں،سب سے وسیع عقل،اُس کے بعد اُس کے اندر محدود نفس،اُس کے بعد اُس کے اندر محدود جسم۔تو ہماری اِس جزوی ہستی میں بھی یہی مثال ہے کہ ہمارے جسم کو رُوح نے گھیر لیا ہے اور رُوح کو عقل نے گھیر لیا ہے۔تو یہ جو تین دائرے ہم نے فرضی طور پر کھینچ لئے اِن میں سب اندر والا جو دائرہ ہے وہ جسم ہے،اُس کو اسماعیلی اصطلاح میں جسمِ کُلّی کہا جاتا ہے،جسمِ کُلّی میں ساری Universe آتی ہے آسمان،زمین اور سورج،چاند،ستارے ہر چیز،یہ جسم کُلّی ہے اور جسمِ کُلّی نفس کُلّی کے گھیرے میں ہے اور نفس کُلّی عقلِ کُل کے گھیرے میں ہے یہ تین چیزیں ہوگئیں۔اب دُوسری اصطلاح میں، مَیں کہوں گا کہ جس طرح خدا کی کرسی نے کائنات کو گھیر لیا ہے،اِسی طرح خدا کے عرش نے کرسی کو گھیر لیا ہے،تو عرش سے مراد عقلِ کُلّی ہے،کرسی سے مراد نفس کُلّی ہے۔زمین پر چبوترا ہوتا ہے،چبوترے پر تخت ہوتا ہے،اِسی طرح زمین Universe ہے،چبوترا نفس کُلّی ہے،تخت عقلِ کُلّی ہے۔تو عقلِ کُلّی علم کا مقام ہے،علم کا سرچشمہ عقلِ کُلّی ہے۔

اب اِس مثال سے آپ نے علم کی بلندی کو محسوس کیا،علم کی بلندی کو آپ نے دیکھا۔پھر میں دُوسری آیت میں

اِس کی وضاحت کرتا ہوں، یہ جو آیت ہے وہ فرشتوں کی زبان سے ہے کہتے ہیں کہ: رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا (۴۰:۷)۔اے خداوندا! تو نے ہر چیز کو رحمت میں اور علم میں سمو دیا ہے، یہاں رحمت سے مراد نفسِ کُلّی ہے اور علم سے مراد عقلِ کُلّی ہے۔ یہ ترتیب سے ہے کہ سب سے پہلے تو نے ہر چیز کو یعنی Universe کو رحمت میں سمویا ہے، تو رحمت روحِ کُلّی ہے، نفسِ کُلّی ہے کہ ہر چیز سے مُراد کائنات ہے اور رحمت سے مراد نفسِ کُلّی ہے کہ ہر چیز نفسِ کُلّی میں سموئی ہوئی ہے اور پھر نفسِ کُلّی عقلِ کُلّی میں سموئی ہوئی ہے۔ تو اِس طرح سے علم کی عظمت اور علم کی بلندی کا پتا چلتا ہے۔

پیر ناصرِ خسرو ؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں ارشاد فرمایا ہے کہ ''ہر چیز علم کے تحت ہے''۔ چونکہ ابھی اِس مثال سے آپ نے دیکھا کہ ہر چیز علم کے گھیرے میں آتی ہے، رُوح بھی علم کے گھیرے میں آتی ہے لیکن خدا علم کے گھیرے میں نہیں آتا ہے۔ ہستی اور نیستی بھی علم کے نیچے آتی ہے لیکن خدا علم کے نیچے نہیں آتا ہے۔ اِس لئے انہوں نے کہا ہے کہ خدا کو ہم نہ تو ہست کہہ سکتے ہیں اور نہ نیست کہہ سکتے ہیں، چونکہ خدا ہست اور نیست سے بالاتر ہے۔ تو جو ذات ہستی اور نیستی سے بالاتر ہو ہم اُس کو ہستی یا نیستی کیسے کہہ سکتے ہیں، خدا ہستی اور نیستی پر بادشاہ ہے لیکن اسماعیلیوں کے سوا لوگ خدا کی صفت کو بیان نہیں کر سکتے ہیں، وہ آدھی صفت کو بیان کرتے ہیں یا مخلوق کی صفات سے اُس کو موصوف کرتے ہیں، کبھی تو وہ رُوح کی صفات خدا کو دیتے ہیں، کبھی کسی مخلوق کی صفات سے اُس کو موصوف کرتے ہیں، کبھی اُس کو عقلِ کُلّ کی صفت دیتے ہیں، کبھی نفسِ کُلّ کی صفت دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ شرک ہے، یعنی خدا کی شناخت نہ ہو تو وہ شرک ہے، خدا کی پہچان نہ ہو اور خدا کی صفت سمجھ میں نہ آئے اور خدا کو اپنے درجے سے نیچے لے آئیں تو یہ ناشناسی شرک ہے مگر ہمارے بزرگانِ دین نے جو خدا کی صفت بیان کی ہے اُس سے دُنیا والے آج کل اِس نئی ریسرچ کے بعد تعجب کرتے ہیں اور اُن کو تعجب ہوتا ہے کہ اسماعیلیوں نے جو خدا کی Unity بیان کی ہے، وہ بہت ہی اعلیٰ، بہت ہی افضل ہے۔

میں علم کی تعریف کر رہا تھا اور علم چونکہ اسماعیلیوں کا ورثہ ہے اور اسماعیلیوں کو یہ مل سکتا ہے چونکہ اُن کا نظریہ، اُن کا نصب العین اور اُن کا رستہ خود بخود ایسا ہے کہ یہ علم کے مقامات کو پہنچتے ہیں اور دُوسرے لوگوں نے جو رستہ اختیار کیا ہے وہ علم کے سرچشموں کی طرف نہیں جاتا ہے، وہ اُن سرچشموں کے برعکس جاتا ہے۔ لہٰذا دُوسرے لوگ حقیقی علم کو حاصل نہیں کر سکتے ہیں اور انہوں نے جہالت کا نام علم رکھا ہے، وہ علم نہیں ہے، وہ علم کے برخلاف ہے، چونکہ علم جاننے کو کہتے ہیں اور جس چیز سے خدا کی حقیقت معلوم نہ ہو، جنّت کے احوال معلوم نہ ہوں، رُوح کی کیفیت معلوم نہ ہو تو دانا اُس کو کیونکر علم کا نام دے سکتا ہے اُس کو تو وہ جہالت قرار دیتا ہے۔ تو لوگوں نے اپنی لاعلمی سے اور جہالت سے، جہالت کو علم کا نام دیا ہے اور گمراہی کو ہدایت قرار دیا ہے، یہ ان کی نادانی ہے یہ ہے حقیقیوں میں اور دُوسرے لوگوں میں بنیادی فرق۔ تو اِس کے لئے کتنے خوش نصیب ہیں امامؑ کے مُرید اور اُس کے ماننے والے کہ اُن کو جو بھی علم ملتا ہے وہ پختہ علم ملتا ہے، حقیقی علم ملتا

ہے۔تو وہ ایسا علم ہے کہ وہ اٹل ہے اور اُس میں روشنی ہے، اُس میں شناخت ہے۔

میں نے کہا علم کے معنی جاننا ہے، تو یہاں پر سب سے بڑی چیز کیا ہے جس کو ہم جانیں، اگر علم صحیح معنوں میں علم ہے تو سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ ہم خدا کو جانیں، آخرت کو جانیں، رُوح کو پہچانیں اور اپنے درجے کو جانیں، یہ اگر ہے تو علم ہے، ہمارے علم میں یہ سب چیزیں ہیں اور یہ ساری خوبیاں ہیں۔تو اِس لئے امامِ عالی مقام نے اپنے مختلف ارشادات میں فرمایا ہے کہ: ''تم خدا کی حقیقت کو سمجھو اور اُس سے پہلے اپنی حقیقت کو سمجھو'' (دارالسّلام۔ ۲۹۔ ۹۔ ۱۸۹۹) اپنی حقیقت کا اِس میں اِس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اپنی حقیقت خدا کی حقیقت کے ساتھ مل کر ہے۔ ہم نے بہت دفعہ آپ کو بتایا ہے کہ انسان کی حقیقت بھی خدا کی حقیقت ہے اور یہ کسی جذبات سے یا کسی مستی سے نہیں اور علم کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مومن کی حقیقت جو ہے وہ خدا کی حقیقت ہے اور اسماعیلی مذہب اصل میں سب سے پہلے اسماعیلیوں کے لئے اور اُس کے بعد سارے بنی نوعِ انسان کے لئے رحمت ہے، اِس میں جو نظریہ ہے، امام کا جو تصوّر ہے، انسانِ کامل کا جو تصوّر ہے اور ہم امام کو جس درجہ میں مانتے ہیں، اُس میں بڑی رحمت ہے اور بہت حکمت ہے اور بہت بڑی تعلیم ہے کہ اِسی سے انسان کا کیا مقام ہے، اُس کی طرف رستہ ملتا ہے۔تو بہر حال بڑی خوش نصیبی ہے اُن لوگوں کے لئے جن کو یہ مقدّس دین ملا ہے اور وہ شب و روز تحقیق کرتے ہیں اور اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں اور ایسا ہی کرنا چاہئے کہ جو زندگی ہم کو دی گئی ہے، زندگی کی جو مہلت ہم کو ملی ہے اِس لئے ہے کہ ہم اِس میں کچھ کمائیں کچھ جانیں۔

علم اور عمل دو چیزیں ہیں، عمل سے مُراد کام ہے اور علم سے مُراد جاننا ہے، تو ہمارا سارا وقت کچھ جاننے اور کچھ کام کرنے کے لئے صَرف ہونا چاہئے اور اگر ہم دُنیا کا کام کرتے ہیں تو بھی اُس کی غرض و غایت دین اور خدمت ہونی چاہئے۔تو بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ کو خدمت کا بھی جذبہ ملا ہے اور آپ میں علم کی قدر دانی ہے، آپ کو علم سے دلچسپی ہے، آپ کو حصولِ علم کے لئے ایک عظیم جذبہ ملا ہے، تو اِن تمام باتوں میں خداوند کی مہربانی اور رحمت ہے۔ پوچھیں۔

سوال: سر! ایک دفعہ آپ نے یہ بتایا تھا کہ انسان ہے وہ خدا کا بھید ہے اور خدا انسان کا بھید ہے، تو سر اس کا کچھ خلاصہ بتائیں؟

جواب: جی ہاں! یہ ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے اور وہ حدیث یہ ہے: اَلانسانُ سِرّی وَ اَنا سِرُّہٗ حدیث میں ہے کہ انسان میرا بھید ہے اور میں اُس کا بھید ہوں، اِس میں یہی بات ہے، جو ابھی ابھی میں نے کی یعنی خدا کا یہ فرمانا کہ انسان میرا بھید ہے۔ اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کے ساتھ میرا کیا رشتہ ہے اور انسان میرے لئے کیا ہے وہ ایک بھید ہے۔ اِس کا مطلب یہ کہ بحیثیتِ مجموعی لوگوں کو پتا نہیں ہے کہ انسان کا درجہ کیا ہے اور انسان کا درجہ یہ ہے کہ وہ خدا

کے درجے کے ساتھ ایک ہے اور یہ بھید ہے، بحیثیتِ مجموعی اور میں اُس کا بھید ہوں یعنی میں اُس کا کیا لگتا ہوں، میرا اُس کے ساتھ کیا رشتہ ہے یہ کسی کو معلوم نہیں یعنی اکثر لوگ اِس کو نہیں جانتے ہیں، جن کو معلوم ہونا چاہئے، اُن کو تو معلوم ہے لیکن خدا نے یہ جو بتایا وہ اکثریت کے لحاظ سے ہے کہ بہت سے لوگ اِس بھید کو نہیں سمجھتے ہیں کہ خدا انسان کا کیا لگتا ہے اور انسان خدا سے کیا رشتہ رکھتا ہے، یہ اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں، نہیں سمجھتے ہیں اور حقیقت میں دیکھا جائے تو خدا کا اور انسان کا ایک ہی رشتہ ہے اور وہ یہ کہ اُن کی حقیقت ایک ہی ہے۔

جس کو ہمارے امامِ عالی مقام نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ''اسلام دراصل مونو ریلزم ہے'' (اسلام میرے مورثوں کا مذہب، ص: ۱۵)۔ مونو ریلزم یعنی ایک حقیقت ہے۔ [لوگوں نے] مذہب کے بارے میں، خدا کے بارے میں بہت سے نظریات قائم کئے ہوئے ہیں، کچھ نے کہا کہ ہمہ از وست یعنی ہر چیز خدا سے ہے، کچھ نے کہا کہ ہمہ اُوست سب کچھ خدا ہے، تو یہ ہمہ اُوست بھی اِسی نظریئے کے قریب ہے لیکن امامؑ نے فرمایا کہ ایک مقام ایسا بھی ہے کہ وہاں پر سب حقیقتیں مل کر ہیں، بلکہ وہ سب حقیقتیں مل کر ایک حقیقت ہے، تو اُس کو مونو ریلزم کہتے ہیں۔ اُس کو اردو میں یا فارسی میں یک حقیقت کہا جاتا ہے، تو اُس یک حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا نے فرمایا کہ میں اُس کا [یعنی] انسان کا بھید ہوں اور انسان میرا بھید ہے۔

<u>سوال: سر! حجّتِ شب کے بارے میں کچھ خلاصہ بیان فرمادیں۔</u>

جواب: حجّتِ شب [کی مثال ایسی] ہے کہ وقتی طور پر جس طرح سیارۂ زمین کا سایہ پڑتا ہے، آپ جغرافیائی طور پر یا سائنسی طور پر جب جاننے لگیں گے اور رات کے بارے میں جب ریسرچ کریں گے، تو آپ کو پتا چلے گا کہ یہ رات کیا ہے، سیارۂ زمین کا اپنا سایہ ہے۔ اب اِس وقت سورج جو ہے مغرب کی طرف ہے، جب مغرب کی طرف ہے تو اِس سیارۂ زمین کے نیچے سورج نظر نہیں آرہا اور سیارۂ زمین کا سایہ پڑ رہا ہے تو اِس کو ہم رات کہتے ہیں اور زمین کے جس حصّے پر رات ہے کل اُس حصّے پر دن ہوگا۔ یہاں پر ایک بہت بڑا بھید کُھل رہا ہے، مجھے ڈر ہے کہ اِس بھید کے کھلنے سے معلوم نہیں کیا ہوگا، وہ یہ کہ آج جہاں سے جہاں تک کفر پھیلا ہوا ہے، ہوسکتا ہے کہ آگے سے آگے اور آگے سے آگے چل کر بہت بہت دیر کے بعد وہاں پر ایمان کی روشنی ہو، اِسی طرح حجتانِ شب یعنی رات کے جو حجّت ہیں، وہ فی الحال کفر کی نمائندگی کر رہے ہیں لیکن کفر میں بھی خدا نے کچھ ایسے لوگ رکھے ہیں کہ اُن کو چلائیں، اُن سے کچھ کام لیں اور اُن کی حیثیت کے مطابق اُن کو کچھ بھلائی، اُن کی سطح پر کچھ بھلائی کی ہدایت دیں۔ ایسا نہیں جو کہ ایمان میں ہے، اِس طرح سے نہیں لیکن کفر کی سطح پر اُن کو کچھ کام بتائیں، لہٰذا خداوند نے اُن کے لئے کچھ سردار مقرر کئے ہوئے ہیں اور خدا کے اِس کام میں بڑی حکمت ہے کہ وہاں پر حجتانِ شب یعنی رات کے حجّت مقرر کئے ہوئے ہیں۔

میں ایک مثال بتاؤں، فرض کریں رام چندر تھا یا فرض کریں گاندھی تھا، گاندھی مسلمان تو نہیں تھا اور نہ وہ اسماعیلی تھا لیکن وہ ہندوؤں کا ایک لیڈر تھا اور ہندو کو اسلامی زبان میں کافر کہا جاتا ہے لیکن اِس کے باوجود وہاں کوئی

لیڈر ہونا چاہیئے۔تو وہ اِس لئے تھا کہ اُن کو اُن کی سطح کے مطابق کچھ رہنمائی کرے، کچھ اُن کی حیثیت کے مطابق نیکی کا راستہ بتائے، ایسی نیکی نہیں جو اسلام میں ہے لیکن اُن کے مذہب کے مطابق اور اُن کے عقیدے کے مطابق تو اِس میں حکمت ہے۔تو خدا ایسے لوگوں سے بھی کام لینے کے لئے کوئی لیڈر مقرر کرتا ہے۔

ہم نے اِس میں بس ہم یہ کوشش کر رہے تھے کہ علم کی مدد سے خود کو یہ تسلی دیں، خود یہ اطمینان حاصل کریں اور اپنے عزیزوں کو یقین دلائیں کہ ہم بس خدا سے الگ نہیں ہوئے ہیں، اُس انا کے اعتبار سے جو بلندی پر ہے۔تو میں گزارش کروں کہ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آسانی چاہتے ہیں اپنے کام میں، اِس اصول سے آسانی چاہتے ہیں کہ اگر ہم کو علم کی بلندی کا پتا چلا اور اُس بلندی پر ہماری نظر پہنچی اور وہاں سے ہم نے جھانک لیا تو پھر دُنیائے علم کا ہم با آسانی جائزہ لے سکتے ہیں اور ہمارا سارا کام آسان ہوسکتا ہے۔اس لئے کہ جو آخری بلندی ہے علم کی اُس مقام پر اگر ہم ایک بات کو سمجھ پائیں تو پستی کی ہزار باتوں کو وہ Cover کرسکتی ہے یہ ہے۔یعنی میں کہہ رہا ہوں کہ اگر علم کی آخری بلندی کی ایک بات کو ہم سمجھ پائیں تو عام دُنیا والوں کی ہزار باتوں کو بلکہ لاکھ باتوں کو وہ بات جو انتہائی بلندی کی ہے Cover کرسکتی ہے۔یہی سبب ہے کہ ہمارے دین کے اندر یہ فرمایا گیا ہے کہ کلمۂ باری کے نام سے ایک کلمہ ہے، جو ایک لفظ ہے اور اُس نے تمام کائنات وموجودات کے علم کو اپنے اندر سمو لیا ہے، ایک لفظ ہے اُس نے تمام علوم کو اپنے اندر سمو لیا۔ہماری جتنی دینی اصطلاحات ہیں اُن کے سلسلے میں اس کلمے کا نام ہے، کلمۂ باری یعنی اللہ تعالیٰ کا وہ کلمہ جو کہ عقلِ کُلّ سے بھی بلند ہے، جس مقام پر عقلِ کُلّ ہے اُس مقام پر گواہی کے طور پر اللہ تعالیٰ کا وہ کلمہ حاضر ہے۔تو عقلِ کُلّ جو بھی Action کرتا ہے، جو بھی کہتا ہے اُس کی گواہی اُس کی شہادت کلمۂ باری دیتا ہے۔

میں قرآن کے ریفرنس سے آپ کو بتاؤں کہ قرآن میں اِس کلمے کا کوئی نام ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ (۱۴:۲۴) یہ ہے، کیا اے رسولؐ آپ نے توجہ نہیں دی ہے کہ خدا نے ایک پاک کلمے کی مثال کس طرح دی ہے كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (۱۴:۲۴)۔وہ پاک کلمہ جو کلمۂ باری ہے، ایسا ہے جیسے ایک پاک درخت ہے۔تو یہاں پر دو چیزوں کا ذکر ہوگیا، ایک پاک کلمہ [اور] ایک پاک درخت۔اور پاک کلمے کی جو کیفیت ہے جو صورتِ حال ہے اُس کو اِس درخت کے عنوان سے بیان فرماتا ہے۔پہلے تو خدا نے ایک پاک و پاکیزہ کلمے کا ذکر چھیڑا اور پھر اُس نے چاہا کہ اُس مقدّس اور پاک و پاکیزہ کلمے کی تشبیہہ و مثال پاک درخت سے دے، تو فرماتا ہے کہ وہ پاک درخت جو اُس پاک کلمے کی مانند ہے ایسا ہے کہ اُس کی جڑیں زمین میں مضبوط ہیں اور اُس کی شاخیں آسمان میں جا لگی ہیں۔تو یہ رُوحانیت کی دو باتیں ہیں، ایک کا نام پاک درخت ہے [اور] ایک کا نام پاک کلمہ ہے۔تقریباً علم اور معلومات کے ذخیرے کے لحاظ سے دونوں برابر برابر ہیں۔تو تاویل میں پاک درخت رسولؐ ہے جو خاندانِ ابراہیمؑ سے ہے،

جس کا حسب ونسب مضبوط ہے اور جس کی شاخیں آئمہ ہیں کہ درخت کا پھل اُس کی شاخوں میں لگتا ہے، تو امامؑ اگر چہ رسولؐ کی شاخ ہیں تو وہ رسالت ونبوت کا پھل امامؑ میں لگتا ہے، درخت کی جڑوں میں، درخت کے تنے میں، درخت کی ٹہنیوں میں جو موٹی ٹہنیاں ہیں اُن میں پھل نہیں لگتے ہیں اور جو نازک نازک شاخیں ہیں آخیر میں اُن میں پھل لگتا ہے۔

بہر حال اِس موضوع کا مقصد یہ تھا کہ میں آپ کو مثال سے عرض کروں، مثال سے سمجھاؤں کہ اُوپر سے اُوپر جب جاتے ہیں تو وہ علم محدود ہو جاتا ہے۔ محدود ہونے کے معنی یہ نہیں کہ وہ کم ہو جاتا ہے بلکہ تمام علوم کی Unity ہو جاتی ہے، جس طرح درخت شاخوں میں پھیلا ہوا ہے اور جڑوں میں بھی یہ درخت پھیلا ہوا ہے مگر تنے میں سب درخت یکجا ہے۔ تنا وہ چیز ہے جس میں کہ جڑیں بھی اور شاخیں بھی ایک ہو چکی ہیں، تو اسی طرح علم میں سے ایک کلمہ ہے کہ جس کے اندر دُنیا اور آخرت کے تمام علوم سموئے ہوئے ہیں، جب آپ اِس چیز کو باور کرتے ہیں، تو یقیناً اِس کو بھی باور کریں گے کہ جب ہم بلندی کی طرف جاتے ہیں، نظریاتی طور پر، علمی طور پر اور رُوحانی طور پر تو اُس وقت تمام علوم آپس میں ایک ہو جاتے ہیں اور ایک ہی مطلب سے دُوسرے تمام مطالب سمجھ میں آتے ہیں۔ تو تمام علوم کا وہاں پر ایک سنگم ہے، جس طرح سمندر میں تمام دریا ملتے ہیں اور تمام ندیاں مل جاتی ہیں اور پانی کی جتنی شاخیں زمین پر پھیلی ہوئی ہیں وہ سب جا کر سمندر میں ایک ہو جاتی ہیں، اِسی طرح علم کا بھی ایک سنگم ہے، علم کا بھی ایک مرکز ہے۔

اس لئے اکثر ہم یہ کوشش کرتے ہیں کہ کچھ اِیسی باتوں کو سمجھیں کہ جن کے سمجھنے سے ہمارے سب مسائل حل ہو جائیں، ایک بات سو سوالات کو حل کرے بلکہ ہزار سوالات کو حل کرے بلکہ اِس سے زیادہ سوالات کو حل کرے، تو یہ بات ناممکن نہیں ہے، بہت آسان ہے۔ اِس لئے میں سمجھتا ہوں بلکہ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر مومن یہ سمجھ سکے کہ اُس کی ایک حقیقت خدا سے مل کر کس طرح سے ہے، اِس مسئلے کو وہ سمجھے تو میرے خیال میں کوئی مسئلہ، مسئلہ نہیں رہے گا، مثلاً جب وہ مونو ریلزم کے تحت مانے کہ اس کی ایک "I"، ایک انا خدا کی حقیقت سے مل کر ہے، جو کبھی بھی الگ نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔

اب اگر اِس تصوّر کو ہم مانیں، اِس کو قائم رکھیں تو پھر ہمارے دُوسرے سوالات بہت ہی آسان ہو جائیں گے، مثال کے طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان دُنیا میں کیوں آیا؟ اور اِس سوال سے کئی افراد کو اُلجھن پیدا ہوتی ہے اور اُن کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان دُنیا میں کیوں آیا اور آیا وہ بار بار آتا ہے یا ایک بار آتا ہے اور دُنیا میں آ کر کیوں اس قدر تکالیف اٹھاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے، اگر اِس نظریئے کو مانا جائے کہ انسان کی خود کی ایک انا ہے، ایک حقیقت ہے، ایک Unity ہے، اور وہ Unity خدا کی Unity کے ساتھ یا کہ مونو ریلزم کی Unity کے ساتھ ایک ہے، کیونکہ Unity سے Unity الگ نہیں ہو سکتی ہے۔ دو چیزیں ایک دُوسرے سے الگ اُس وقت ہو سکتی ہیں جبکہ اِن دونوں کے درمیان تضاد پیدا ہو جائے، یک رنگی نہ ہو، ہم نوائی نہ ہو تو اُن کی جدائی لازمی ہو جاتی ہے۔ اگر دو چیزیں

ہیں اور وہ یک صفت ہیں، اُن کے رنگ میں اختلاف نہیں ہے، اُن کے آپس میں تضاد نہیں ہے تو وہ کس معنی میں اور کس طرح سے ایک دُوسرے سے جدا ہو سکتی ہیں، ایک دُوسرے سے جدا نہیں ہو سکتی ہیں۔

اسی طرح اگر ہماری ایک وحدت ہے اور مانیں کہ خدا کی یا کہ مونو ریلزم کی ایک وحدت ہے تو یہ وحدت اور وہ وحدت آپس میں کیوں مخالف ہوئیں اور کس بنا پر اِن دو وحدتوں میں کثرت پیدا ہوگئی یا دوئی پیدا ہوگئی اور جدائی کس بنا پر واقع ہوئی، یہ لازم نہیں آتا ہے کہ حقیقی Unity سے پھر دوئی کو پیدا کیا جائے۔ بہر حال ہمیں ہر صورت میں ماننا پڑے گا کہ ہماری ایک حقیقت ہے جو مونو ریلزم میں ہے یا کہ خدا سے مل کر ہے، جب ہم اِس کو مانتے ہیں تو دُنیا میں آنے کے سلسلے میں ہم کو پھر آسانی اور مصلحت نظر آتی ہے۔ چلو ٹھیک ہے! اگر ہماری ایک حقیقت خدا ہے اور ہمیشہ کے لئے خدا ہے تو ہم اپنی خدائی کو اور اپنی بادشاہی کو قائم رکھنے کے لئے اور اُس کو کامیاب بنانے کے لئے، اُس کو کامران بنانے کے لئے دُنیا میں آتے ہیں اور پھر کون آئے گا، ہم ہی آتے ہیں اور سائے کی طرح آتے ہیں کہ ہماری حقیقت اپنی جگہ پر برقرار اور قائم ہے اور ہماری یہ شخصیت، ہماری یہ ہستی ایک سائے کی طرح دنیا میں آتی ہے۔ اِس کو مولائے روم نے خوب سمجھا تھا، وہ ایک کامیاب صوفی تھا، اُس نے اپنے کلام میں جگہ جگہ اِس تصوّر کا ذکر کیا ہے اور اُس نے کہا ہے کہ:

تن چو سایہ بر زمین و جانِ پاکِ عاشقان

در بہشتِ عدن تجری تحت الانہارِ مست

یہ جسم، اُس اصلیت کے ایک سائے کی حیثیت سے دُنیا میں آیا ہے۔ یہ سایہ زمین پر پڑ رہا ہے، یہ چھاؤں جو ہماری اصلی جان ہے، جو حقیقی رُوح ہے وہ تو ہمیشگی کی جنّت میں ہے، ایسی جنّت میں کہ اُس میں سے کوئی ہستی، کوئی جیو کبھی باہر نہیں آتا۔ تو قرآن میں بھی جنّت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ ایک بار اُس میں داخل ہوتے ہیں تو پھر کبھی اُس سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔ تو چونکہ الفاظ کی کمی ہے، اِس واسطے یہاں داخل ہونے کا ذکر ہوا ہے، نہیں تو اُس میں داخل ہونا ہی نہیں ہے کیونکہ اُس میں جو کچھ ہے وہ تو ہمیشہ سے ہے یعنی اگر مانا جائے کہ مونو ریلزم خود حقیقی جنّت ہے تو پھر اُس سے کوئی حقیقت کب خارج ہوئی، کب وہاں سے باہر آئی کہ پھر وہاں لوٹنے کا ذکر آتا ہے یا واپس جانے کا ذکر آتا ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

تو بات یہ ہے کہ قرآن نے ہم کو بچوں کی طرح سمجھایا ہے، اِس لئے کہ ہم حقیقت کو آسانی سے نہیں سمجھ سکتے تھے، اُس حقیقت کو جس کا اب اِس محفل میں ذکر ہو رہا ہے، اُس حقیقت کا سمجھنا بہت ہی مشکل ہے، بہت ہی مشکل ہے، یہ ہے حقیقت اپنی جگہ پر، اپنے مقام پر لیکن اس تک ذہنی طور پر رسا ہو جانا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا عام انسانوں کو کس طرح سمجھایا جا سکتا تھا، اِس لئے اُن کو بچگانہ زبان استعمال کی گئی، کہا گیا کہ ہم آئے ہیں پھر جائیں گے، یہ تو ایک مادی قسم کی بات ہوئی، حالانکہ رُوح کے لئے آنا اور پھر جانا نہیں ہے، اِس لئے کہ رُوح بسیط ہے، اِس لئے کہ رُوح محیط ہے۔ بسیط اور محیط کا کیا مطلب ہے؟ تصوّر

کریں کہ ایک حقیقت ہے جو ہر جا ہے یعنی Omnipresent ہے، ہر جگہ پر حاضر ہے، یہ تو بچپن میں ہم نے سیکھا تھا کہ خدا Omnipresent ہے، آگے چل کر ہم کو پتا چلا کہ یہ تو رُوح کی صفت ہے۔ پھر وہی بات کہ خدا کے بارے میں ہم کو سمجھانا کہ خدا ہر جگہ پر حاضر ہے، یہ بھی بچگانہ تعلیم ہے، ہم چونکہ خدا کو نہیں سمجھتے تھے اور خدا کے بارے میں نہیں جانتے تھے، لہٰذا ایک بات تو ہم کو یہ بتلائی گئی کہ خدا ہر جگہ پر ہے، حالانکہ کہ خدا کے لئے یہ کتنی چھوٹی بات ہے، خدا مکان ولامکان سے بالاو برتر ہے۔

اگر خدا کو ہر جگہ مانیں تو پھر وہ مکان کے تصوّر میں مقیّد ومحبوس ہو جائے گا، پھر جو لامکانی کیفیت ہے اُس صفت سے وہ یک طرفہ ہو جائے گا اور پھر خدا کے مقابل میں ایک اور چیز قرار پائے گی جو اُس کی ضد قرار پائے گی، اُس کی Opposite ہو جائے گی۔ مثلاً ہم نے خدا کے متعلّق مکان کا تصوّر قائم کیا، جب کہ ہم نے مان لیا کہ خدا Omnipresent ہے، یعنی خدا ہر جگہ پر حاضر ہے، پھر تو اِس کے مقابلے میں لامکان کا تصوّر بھی ہے یعنی Placeless جہاں، جس کیفیت میں کوئی مکان نہیں ہے تو چونکہ ایک تو مکان ہے اور ایک لامکان۔ یعنی ایک کیفیت مکان ہے اور ایک کیفیت لامکان ہے، مکان کا مطلب کوئی جگہ کا ہونا اور لامکان کا مطلب وہ کیفیت وہ حالت جو کہ مکان کے بغیر ہے۔ پھر تو خدا آدھی ہستی میں یا آدھی کیفیت میں موجود قرار پایا اور اُس کے مقابلے میں جو دُوسری کیفیت ہے وہ کیفیت خدا کے سامنے مدِمقابل قرار پائی یا یوں کہنا چاہئے کہ خدا ایک کیفیت میں ہُوا اور پھر دُوسری کیفیت میں نہیں ہُوا لہٰذا خدا محدود ہُوا۔

اب چھوڑیئے اِس تصوّر کو جو خدا کے بارے میں مکان سے متعلّق ہے کہ خدا مکان اور لامکان سے بھی برتر ہے یعنی خدا کے لئے یہ کہنا کہ وہ موجود ہے کوئی بڑی صفت نہیں ہے۔ جبکہ خدا ہستی اور عدم سے برتر ہے، اِس لئے آپ ایسی صفات کو رُوح کے لئے چھوڑیں اور واپس اپنے موضوع کی طرف لوٹیں ہم کہہ رہے تھے کہ رُوح Omnipresent ہے، اِس کو آپ مانیں کہ رُوح Omnipresent ہے، تو رُوح ہر جگہ پر ہے، جب رُوح ہر جگہ پر ہے تو آنا اور جانا کیسا، اگر رُوح کے بارے میں ہم کو آنے جانے کا بتلایا گیا ہے تو محض ہمارے لئے بچگانہ زبان استعمال کی گئی ہے، ہم کو سکھانے اور سمجھانے کے لئے یہ بات ہے۔ تو اِس لئے ہمیں جاننا چاہئے کہ دُنیا کے اندر بھی کئی چیزیں ہیں کہ وہ اگرچہ مادّی چیزیں ہیں لیکن اُن کے متعلّق آنا جانا جو ہے وہ مختلف ہے، مثلاً فرض کریں کہ پانی آتا ہے، ندّی کا پانی آتا ہے اور کوئی انسان آتا ہے دونوں میں فرق ہے۔ ندّی اِس طرح آتی ہے کہ وہ اپنی راہ پر قائم ہے، پہاڑ سے لے کر دریا سمندر تک اُس کی شکل قائم و برقرار ہے اور اُس کی روانی اور اُس کی چال، اُس کی ہستی کے اندر ہے یعنی جہاں سے جہاں تک ندّی پھیلی ہوئی ہے اور ندّی کی جتنی راہ ہے وہ پُر ہے کہ وہ آدمی کی طرح چلے اور مسافت کو طے کرے اور پچھلے رستے کو چھوڑے اِس طرح سے نہیں ہے۔ ندّی چلتی بھی ہے اور ٹھہری بھی ہے، تاہم ہم کہہ سکتے ہیں کہ ندّی بہتی ہے اور ندّی چلتی ہے، دریا بہتا ہے، دریا چلتا ہے اور نہیں چلتا ہے دونوں باتیں برابر ہیں۔ دیکھا! باوجود اِس کے کہ پانی ایک مادی شئ ہے لیکن پانی کی چال اور ایک آدمی کی چال دونوں میں فرق ہے۔

چلئے !اِس مثال کو سمجھنے کے بعد دُوسری چیز کو لیں، سایہ کو لیں، سایہ آیا گیا لیکن یہ کسی جانور کی طرح سایہ نہیں آیا، سائے کا ایک سرا اُس کی اصل کے ساتھ لگا ہوا ہے، وہ چھوٹا ہوتا ہے، بڑا ہوتا ہے، اِس طرف جاتا ہے، اُس طرف جاتا ہے لیکن جانور جو ہے، گائے، بیل، بکری، گھوڑا، گدھا جب چلتا ہے تو مسافت کو طے کرتا ہے تو پچھلے رستے کو چھوڑتا ہے اور آگے بڑھتا ہے لیکن سایہ جو چلتا ہے، پھرتا ہے وہ اِس طرح سے نہیں ہے۔

چلو! تیسری چیز کو لیں گھڑی کی سوئی کو لیں، گھڑی کی سوئی چلتی ہے، کہاں چلتی ہے، بس اپنے Dial میں چلتی ہے کہ اُس کا ایک سرا مرکز پر قائم ہے اور دُوسرا سرا جو ہے وہ گھومتا ہے اور اِس گھڑی کی چال .بہت مختلف ہے دُوسری چیزوں سے، ندّی سے، سائے سے اور گائے سے اور انسان سے، نیز گھڑی کی سوئی کا چلنا وہ الگ ہے۔ چلیں! اب دھوپ کی طرف جائیں، دھوپ بھی آتی ہے یعنی سورج کی روشنی لیکن دھوپ کی روشنی بھی تقریباً سائے کی طرح سرچشمے میں روشنی کا وہ سرا قائم رہتا ہے اور یہ سرا اِس زمین کی سطح پر آتا ہے اور چلئے! ایک اور چیز کو لیں آسمان کا چلنا، آسمان کی گردش .بہت مختلف ہے، اِس طرح کہ یعنی آسمان جو ہے وہ گولائی میں گھومتا ہے اور ایک پہیے کی طرح ہے کہ وہ اپنی جگہ پر آسمان چکر لگاتا ہے اور گردش کرتا ہے۔ دیکھا آپ نے کہ آنا جانا چلنا پھرنا ہر چیز کا الگ ہے، اب اگر رُوح کے لئے یا فرشتوں کے لئے آیا گیا کا لفظ استعمال ہوا ہے تو اِس کو کس طرح سمجھنا چاہئے؟ اِس کا سمجھنا مشکل ہے اور ہمیں اگر سمجھنا ہے تو اُن چیزوں کی طرح سمجھنا چاہئے جو وسیع ہیں، جس طرح دھوپ ہے ندّی ہے اور گھڑی کی سوئی ہے اور آسمان ہے، اِس طرح سمجھنا چاہئے کہ رُوح نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی ہے۔

رُوح اگر اپنی اصل سے دُنیا میں آئی ہے تو ٹھیک ہے آئی ہے انکار نہیں ہے لیکن اُس نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ اُس نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی ہے، اگر فرشتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فرشتے آئے گئے، تو فرشتوں نے بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ ایک اور چیز درمیان میں رہ گئی وہ بجلی یا ریڈیو اسٹیشن یا ٹی۔وی اسٹیشن کی بات تھی کہ اگر Wave یعنی لہر آتی ہے اسٹیشن سے تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ وہاں سے ختم ہو کر آتی ہے، بلکہ یہ چیز وہاں پر بھی موجود ہے یعنی گفتگو تو یہاں بھی آتی ہے اور درمیان میں ایک اور چیز ہے کہ آپ ایک Looking Glass یا کہ Mirror سامنے رکھتے ہیں تو اُس میں سورج اُترتا ہے، تو کیا سورج اپنی جگہ کو چھوڑ کر آپ کے آئینے میں اُترتا ہے یا کہ اِس سورج کا آنا دُوسری چیزوں سے .بہت مختلف ہے، سورج اپنی جگہ پر ہوتے ہوئے آئینے کے اندر اپنا جلوہ دکھاتا ہے، اپنا ظہور کرتا ہے، تو اِن تمام مادّی چیزوں کے آنے جانے کے قیاس کو سمجھیں، قیاس لگائیں، مثال سمجھیں پھر اُس کے بعد رُوح کے بارے میں آپ سوچیں، تاکہ آپ کو یقین آئے کہ ہم خدا کی اصلیت سے جدا ہو کر دنیا میں نہیں آئے ہیں۔

تو صوفیوں کا کہنا صحیح ہے کہ سائے کی طرح آئے ہیں، ابھی آپ کو یہ مطلب آسان ہو گیا کہ ہم قطعاً نہیں آئے ہیں۔

اب آپ ایک سوال کریں گے اگر ہم نہیں آئے ہیں تو اِس وقت ہمارا شعور، ہمارے خیالات، احساسات یہاں اِس ہستی کے ساتھ محدود کیوں؟ اگر ہم واقعتہً خدا کی وحدانیت کے ساتھ بھی مل کر رہتے ہیں تو جس طرح ہم اِس سرے کے متعلّق احساسات رکھتے ہیں، اِسی طرح اُس سرے سے ہم باخبر کیوں نہیں ہیں؟ یہ سوال آپ کا ہوسکتا ہے۔ اِس کے لئے جواب یہ ہے کہ چونکہ ہم اِس وقت زیادہ سے زیادہ تعلّق اس سرے سے رکھتے ہیں چونکہ ہم نفسانی ہیں، چونکہ ہم طبعی ہیں، چونکہ ہمارا ماحول، ہماری ذہنیت، ہمارا علم اتنا کچھ ہے، جتنے سے کہ ہم اپنے اِس سرے کو پہچانتے ہیں اور اُس سرے سے بے خبر ہیں اور اُس سرے سے ہم اُس وقت باخبر ہوں گے، خود کو وہاں اُس وقت پائیں گے جبکہ ہمارا جو علم ہے، جو ہماری معرفت ہے وہ بلند ہو جائے گی، ہم عبادت بندگی اور علم کے زور سے خود کو بلند بلند، بلند، بلند، بلند کریں۔ تو منصور نے البتہ عبادت و بندگی اور معرفت کے زور سے اپنی اِس انا کو اُس انا سے ملایا تھا، تو تب اُس نے اناالحق کا نعرہ لگایا۔ ہم بھی اگرچہ جذباتی انداز سے نہیں تو سنجیدگی سے اور علم الیقین کی روشنی سے اناالحق کہہ سکتے ہیں، چیخ کر پکار کر اگرچہ مستی کے انداز میں [نہیں]۔ بہت مضبوط دلائل کی روشنی میں [یہ بات] ہے کہ ہماری ایک حقیقت ہے جو کہ خدا میں ہے۔

میں نے کئی دفعہ ایک حدیثِ قدسی کی وضاحت کی تھی اور اُسی حدیثِ قدسی کی میں دوبارہ وضاحت کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے فرمایا: یَابْنِیْ اٰدَمَ اَطِعْنِیْ اَجْعَلُكَ مِثْلِیْ حَیًّا لَا تَمُوْتُ وَ عَزِیْزًا لَا تَذِلُّ وَ غَنِیًّا لَا تَفْتَقِر اے ابن آدم! تم میری فرمانبرداری اور اطاعت کرو تا کہ میں تم کو اپنے مانند قرار دوں گا یعنی اپنی طرح کا ایک خدا بناؤں گا اور ایسا بناؤں گا کہ تم پر کبھی موت واقع نہیں ہوگی اور ایسا غنی بناؤں گا کہ تم کبھی محتاج نہیں ہو گے اور ایسا معزز بناؤں گا کہ کبھی تم خوار و ذلیل نہ ہو جاؤ گے۔ اب اِس حدیثِ قدسی کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا مومن سے وعدہ فرماتا ہے کہ جب یہ مومن صحیح معنوں میں تابعداری کرے گا تو نتیجے کے طور پر خدا اِس کو خدا بنائے گا۔

اِس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، جب تک ہم اُن سوالات کو سامنے نہیں رکھیں گے اور اُن کی وضاحت نہیں کریں گے تو ہم مکمل طور سے اِس کو نہیں سمجھ پائیں گے۔ وہ سوالات میں سے ایک تو یہ ہے کہ آیا وہ خدا مجھ کو یا آپ کو جب خدا بنائیں گے تو میں اور آپ ایک نیا خدا قرار پائیں گے اور ازلی واقعات سے ہم بے خبر ہوں گے، تو پھر کس معنی میں ہم اُس جیسے خدا ہو گئے، خدا نے تو یہ وعدہ فرمایا کہ بس میرے میں اور تجھ میں کوئی فرق نہیں ہوگا اور دُوسری بات یہ ہے کہ خدا ہم کو جب خدا بنائے گا تو کیا ہم اِس میں دو ہوں گے، تو دو کیسے؟ ممکن نہیں ہے اور اگر ہم اُس کے ساتھ ایک ہو جاتے ہیں تو یہ ایک درمیان کی بات ہوگئی۔ ابھی ابھی جیسا کہ ہم کو اُس نے پیدا کیا، پھر بھی ہم اُس جیسے نہیں ہو سکے اور کس معنی میں ہم اُس جیسے ہو سکتے ہیں، جبکہ اُس نے ہم کو بنایا اور ہم اُس کی برکتوں سے ہو گئے اور درمیان میں ہم اُس سے جا ملے، پھر بھی صحیح معنوں میں ہم اُس جیسے نہیں ہو گئے۔ ہم تو طفیلی ہو گئے، ہم تو اُس کی برکت سے اُس کی مہربانی سے ہو

گئے،تو خدا نے تو یہ فرمایا کہ میں تم کو بالکل اپنے مانند بناؤں گا۔ اِس میں بھید ہے، راز ہے۔ خدا کا مقصد یہ ہے کہ خدا ہم کو یہ سمجھانا چاہتا ہے یا اِس حقیقت کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ میں تم کو ایک ایسے بھید سے پردہ اُٹھا کر بتاؤں گا کہ اِس فرمانبرداری کے نتیجے میں تم کو بتاؤں گا کہ تم اور ہم ایک ہیں۔ یہ گویا ہماری وہ انا ہم سے بتاتی ہے، ہم سے فرماتی ہے جو اُوپر ہے اور دُوسرا خدا نہیں ہے، دُوسرا خدا ہو تو اس کے معنی درست نہیں ہوں گے۔

خدا نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ: اَلانسانُ سِرّی وَ اَنا سِرُّہٗ انسان میرا ایک بھید ہے اور میں اُس کا ایک بھید ہوں۔ دونوں طرف سے برابر برابر بات ہے، انسان میرا بھید ہے یعنی انسان مجھ کو کیا لگتا ہے، انسان کے ساتھ میرا کیا رشتہ ہے وہ تو بھید ہے، کسی کو معلوم نہیں ہے، اِس میں بھی یہی اشارہ ہے کہ انسان بھید ہے وہ میری وحدت ہے، وہ میری Unity ہے، وہ میری انا ہے، وہ انا اِس انا سے خطاب کر کے فرماتی ہے کہ انسان میرا بھید ہے اور میں اُس کا بھید ہوں۔ تو یہ انا اُس انا کے بھید کی حیثیت سے ہے اور وہ انا جو بلندی پر ہے، اِس انا کے لئے بھید Secret ہے، بحیثیت مجموعی، As a Whole یہ بھید ہے، لوگوں نے نہیں سمجھا خدا کیا ہے؟ ہم ایسے خدا کو چاہتے ہیں یہ خدا اُس خدا سے بڑھ کر ہے جس نے لوگوں کو صرف جہنم سے بچانے کا وعدہ کیا ہے۔ ہمارا خدا ایسا ہے کہ اُس میں مہربانی اور رحمت کی انتہا ہے، اِس سے بڑھ کر کوئی رحمت نہیں ہے کہ ہمارا خدا ہم کو اپنا جیسا خدا بنائے گا وہ ثابت کرے گا کہ اوّل میں اور آخر میں ہم اُس کے ساتھ ایک ہیں اور دُوسرے جو خدا ہے وہ تو جزوی طور پر مہربانی کرے گا، کچھ کرے گا، کچھ نہیں کرے گا، پھر بھی اُس میں بخالت اور کنجوسی باقی رہے گی، وہ خدا جو دُوسروں کا خدا ہے وہ کچھ کر سکے گا اور کچھ نہیں کر سکے گا، مہربانی ادھوری رہے گی، رحمت ادھوری رہے گی۔ یہاں، یہاں تو کیا! پھر کوئی چیز باقی نہیں ہے، وہ تو ختم ہے، اِس میں پوری بادشاہی ہے کہ اِس معنی میں خدا نے کہا تھا کہ دیکھو! کل کو دیکھو! جب تم مجھ کو پہچانو گے نا! میں تمہارا خزانہ بنوں گا۔ یہ ہمارا خزانہ ہے، یہ معرفت کی روشنی ہے خدا نے بھی یہ فرمایا تھا جب مجھ کو پہچانو گے نا! تو میں تمہارے سامنے جواہرات، اشرفی، سونا، چاندی کی حیثیت سے خود کو سونپوں گا۔

اِس معنی میں خدا نے خود کو سونپا ہے، خدا نے خود کو اسماعیلیوں کے حوالے کر دیا ہے۔ اس معرفت کے نتیجے میں بس وہ ہماری ملکیت ہے، وہ ہماری انا ہے، وہ ہماری Unity ہے، وہ ہماری خودی ہے۔ اسماعیلی مذہب کے اندر انسانِ کامل یعنی امامؑ کا تصوّر اِس معنی میں ہے کہ مومنین کو اِس عظیم رحمت کی طرف رہنمائی کرے، یہ اسماعیلی مذہب ہی ہے، جس میں اتنی رحمت ہے، امامؑ ہی نے فرمایا کہ ''اسماعیلی مذہب اور اسلام مونو ریلزم ہے'' (اسلام میرے مورثوں کا مذہب، ص: ۱۵)۔ امامؑ ہی نے فرمایا کہ ''تم میرے رُوحانی بچے ہو'' (ممباسہ۔ ۱۲۔ ۱۱۔ ۱۹۰۵)۔ ہم اگر اُس کے رُوحانی بچے ہیں تو کل کو ہم اُس جیسے بننے والے ہیں اور آج بھی اگر ہم اپنی معرفت میں کامل ہیں، ہمارے نظریات صحیح ہیں اور علم الیقین میں ہم پختہ ہیں تو ہم اُمید رکھ سکتے ہیں کہ ہم اپنے باپ کے ساتھ ایک ہیں، اُس جیسے ہیں، رُوحانی فرزند ہونے کے

اندر یہ تاویل اور یہ حکمت ہے اور امامؑ نے ایک دُوسرے فرمان میں فرمایا کہ ''اہلِ بیت کی طرح ہو سکتے ہو، سلمان فارسی کی طرح ہو سکتے ہو اور اہلِ بیت سے بھی آگے جا سکتے ہو'' (دارالسّلام۔ ۲۹۔ ۹۔ ۱۸۹۹)۔ تم پیروں کی طرح ہو سکتے ہو اور پیروں سے بھی آگے جا سکتے ہو'' (دارالسّلام۔ ۲۹۔ ۹۔ ۱۸۹۹)۔ یہ ہوا پیروں سے آگے جانا، جس مقام کا ہم نے ذکر کیا وہ پیروں کے تصوّر سے اور اُس درجے سے آگے کی بات ہے یعنی پیر تو ایک مرتبہ ہے، پیر تو ایک درجہ ہے لیکن خدائی کا تصوّر آخری درجہ ہے،، بہت سے ارشادات میں امامؑ نے فرمایا کہ ''مومن کی نگاہ بلندی کی طرف ہونی چاہئے اور اُوپر جانے کے لئے ہونی چاہئے'' (راجکوٹ، ۲۱۔ ۱۰۔ ۱۹۰۳)۔ تو بہت سے ارشادات ہیں۔ امامؑ نے فرمایا کہ ''وہ اپنی روح کے عاشق تھے'' (دارالسّلام۔ ۲۹۔ ۹۔ ۱۸۹۹)۔ امامؑ نے فرمایا کہ ''مجھ کو کوئی خواب میں نہیں دیکھ سکتا ہے'' (راجکوٹ۔ ۲۰۔ ۲۔ ۱۹۱۰)۔ مطلب یہ کہ ہر مومن اپنی رُوح کو خدا کے رُوپ میں، امامؑ کے رُوپ میں دیکھتا ہے، نہ کہ امامؑ کی شخصیت کو دیکھتا ہے، امامؑ کے مرتبے کو اپنے آپ میں پاتا ہے، امامؑ کی نورانیت کو، امامؑ کے نورانی دیدار کو اپنے آپ میں پاتا ہے، اپنی رُوح ہی وہ شئ ہے، وہ معجزہ ہے جو کہ خدا کے رُوپ کو دھارے اور خدا کا ظہور کرے، خدا کے لباس میں ظاہر ہو جائے، یہ رُوح ہی ہے۔

تو بہر حال ابھی بات ہو رہی تھی کہ اگر ہم اعلیٰ سے اعلیٰ علم کی باتیں کریں تو دُوسری باتیں ہم کو ایسی لگیں [گی] جیسے بچوں کا کھیل تو اسماعیلیوں کے وہاں علم کی بلندی اتنی ہے کہ اُن کو دُوسرے مسائل بہت ہی عام لگتے ہیں۔ اور جس بہشت کا ذکر کیا جا رہا ہے اُس کی تو کوئی اہمیت نہیں رہتی ہے اور ایسی بہت سی چیزیں جبکہ ہماری انا خدا کی خدائی سے مل کر ہے تو بہشت جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہ کوئی شئ نہیں ہے اور ہاں یہی بہشت ہے اور سب سے بڑی بہشت ہے جو خدا کی حقیقت ہے۔ تو خدا کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے کوشش کی جائے لیکن ایک بات یہ ہے کہ اگر باور کیا جاتا ہے کہ یہ بات صحیح ہے اور بالکل صحیح ہے، تو اِس سے ہمارے فرائض میں اضافہ ہو جاتا ہے، ہماری ذمہ داری بڑھ جاتی ہے، نہ کہ ہم دُوسروں کی طرح سُست، کاہل اور دُوسروں پر Depend کرنے والے یا کہ تقدیر اور قسمت پر Depend کرنے والے ہیں، ایسا نہیں ہے۔ ہمیں یہ کام کرنا ہے اور جبکہ ہمارے شعور کی رسائی اس قدر بلندی تک ہے تو اس کے ساتھ ساتھ ہماری ذمہ داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں، عبادت بندگی اور حصولِ علم سے متعلّق جتنی ذمہ داریاں ہیں ان میں اضافہ ہو جاتا ہے، وہ ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ تو اِس لئے مومن کو عالی ہمت ہونا چاہئے اور جب سفر لمبا ہے، جب کارنامہ بہت بڑا ہے تو اِس کے لئے تیاری بھی بہت بڑی ہونی چاہئے۔

اِس درجہ کو حاصل کرنے کے لئے اگر ہماری ہزار جانیں جاتی ہیں تو بھی کچھ نہیں، اگر ہم ہزار بار دُنیا میں آئیں اور ہزار بار اِس مقصد کے لئے قربان ہو جائیں، تو بھی یہ جو سودا ہو رہا ہے بڑا سستا ہے اور اِس تجارت میں بہت ہی فائدہ ہے، اِس درجے کو حاصل کرنے کے لئے ہمارا سب کچھ جائے تو بڑی بات نہیں ہے، جب تک کہ ہم ازلی طور پر اُس مقام پر ہیں۔ تو جب ہم اِس دُنیا سے چلے جائیں گے، جب ہماری یہ ہستی مٹ جائے گی تو ہمارا شعور بلند ہو جائے گا اور اُس انا سے

قریب ہو جائے گا، تو پھر ہم اپنے آپ کو اِس انا کے اعتبار سے بھی بہت ہی بلندی پر پائیں گے اور بہت ہی خوش ہوں گے۔ اِس کے لئے اُمیدوں کے ساتھ اور یقین کے ساتھ دُنیا کے دکھوں کو بڑی خوشی سے اٹھانا چاہئے۔

اگر ایک شخص سمجھتا ہے کہ کل کو بادشاہ ہونے والا ہے، تو وہ دُنیا کی ہر مصیبت کو خوشی سے برداشت کرتا ہے، مایوسی اور نا اُمیدی میں جو تکلیف ہوتی ہے، وہ بہت بڑی مصیبت ہے اور کل کی اُمید پر جو بھی محنت اُٹھائی جائے تو وہ ساری محنت خوشی اور راحت بن جاتی ہے، اِس لئے اب جو لوگ جس طرح دُنیا کی زندگی سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے، حقیقت میں اور اگر وقتی طور پر کوئی شکایت کرتے ہیں تو وہ تو ایک بہانہ ہے کہ ہم خود کو گریہ وزاری پر ڈھالیں یا شکر گزاری کریں یا خدا سے رُجوع کریں لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو ہم اُس راحت کی اُمید پر اب بھی فی الحال بھی راحت میں ہیں۔ مَیں یہ چند باتیں کرنا چاہتا تھا اِس لئے کہ ابھی ابھی میں نے مناجات میں بار بار کہا کہ ہماری انا تمہارے ساتھ ایک ہے۔ اُس مناجات کے ربط میں یہ چند باتیں آرام سے اور نثر کے انداز میں کرنی تھیں۔ اِسی کے ساتھ میں اپنی بات کو روک لیتا ہوں تا کہ شاید آپ کا کوئی سوال ہو، نہیں تو ابھی ٹائم ایک چوتھائی ہو گیا صرف چھ منٹ باقی ہیں، تو دو بجے تک ہماری مجلس چلتی ہے۔

علم کے سلسلے میں، بولنے کے سلسلے میں، عبادت کے سلسلے میں، لکھنے کے سلسلے میں اور جس طرح فتح علی عزیز نے بات کہی میں بھی اُس کی تصدیق کرتا ہوں، میں تو بالکل ایک ملکیت ہوں آپ کی۔ میں بولتا بھی ہوں اور ایک آپ کا مال بھی ہوں، آپ مجھ سے فائدہ اُٹھائیں، مجھے خوشی نہیں ہو گی جب تک کہ آپ مجھ سے کچھ سیکھ نہیں جاتے ہیں۔ آپ نے جس قدر مجھے راحت پہنچائی ہے، جو مدد کی ہے ہر لحاظ سے اُس سے مجھے سکون نہیں ملے گا جب تک کہ اِس کے عوض میں آپ کو کچھ نہ دوں۔ ٹھیک ہے وہ جو آپ کی کوشش ہے اُس کا جو فائدہ ہے، جمعیت کو اور پوری جماعت کو جو کچھ فائدہ مل رہا ہے اُس میں تو آپ شریک ہیں لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ذاتی طور پر بھی علم کے اور ہنر کے لحاظ سے کچھ ملنا چاہئے۔ تو اِس کے لئے جہاں تک ہو سکتا ہے، جتنا ہو سکتا ہے آپ زیادہ محنت کریں۔ اب میرے لئے یہ مشکل ہے کہ ہر ایک کو پڑھاؤں، سمجھاؤں اور لکھوں، اصلاح کروں، آپ دیکھیں! اندازہ کریں بہت مشکل ہے میرے لئے۔ آپ خود اِس طرح سے لیں، اِس طرح سے پائیں، اِس طرح سے دیکھیں آپ کی آنکھ اِس طرح سے کام کرے، عقل اتنی کام کرے کہ اُس میں میرے لئے آسانی ہو، تو آپ آٹو میٹک سیکھیں اور کنز بتاؤں یعنی گُر بتاؤں، طریقہ سکھاؤں، آپ بہت کوشش کریں۔ اِس کے لئے یہ ہے کہ آپ کام شروع کریں اور طریقہ یہ ہے کہ آپ ایک پسندیدہ شخصیت پر کام شروع کریں، کسی کو سلمان فارسی عزیز ہو گا تو کسی کو فاطمہؑ عزیز ہو گی، اچھا تو کسی کو رابعہ بصری اور کسی کو مولائے روم سے دلچسپی ہو سکتی ہے اور کسی کو امام سلطان محمد شاہؑ پر لکھنے کا شوق ہو سکتا ہے اور کسی کو فرمان پر کام کرنے کا [شوق] ہو سکتا ہے۔ اِس طرح آپ سوچیں کوئی مضمون لیں ایک چھوٹی سی کتاب لکھیں اور لکھنے کے لئے کوشش کریں، ایک سال دو سال تک لکھیں، آپ اسکالر بن سکتے ہیں، ہم وہی

ہیں جس نے کے اسکالروں کو ٹریننگ دینے میں شرکت کی۔تو آپ ماشاء اللہ اِس قدر تعلیم یافتہ ہیں اور جانتے ہیں کوئی مشکل نہیں ہے، کوئی مشکل نہیں ہے، آپ مضمون لکھ سکتے ہیں اور کتاب بنا سکتے ہیں، یہ میری پیشکش ہے۔آپ کوشش کریں، اِس کے لئے آپ سوچ کر بتائیں، انفرادی طور پر مشورہ لیں، ایک ایک شخصیت پر، اس میں آپ پہلے یہ سوچیں کہ اِس پر مواد ملتا ہے، کتابیں ملتی ہیں یا نہیں، جس پر آپ لکھنا چاہتے ہیں۔قرآن سے حدیث سے یا کہ دیگر کتابوں سے آپ کو مواد ملے ایسا کام شروع کریں، کچھ کام کریں، مزا آئے گا، پھر آپ علمی بن جائیں گے، ایک دفعہ یعنی آپ کو مزا آئے گا، پھر یہ مزا کبھی نہیں جائے گا اور یہ آپ کو مجبور کرے گا کہ آپ یہ کام کریں، اِس کو کہتے ہیں Practical Knowledge یہ میرا مشورہ ہے اِس کے لئے آپ سوچیں۔

دیگر خدمات کے ساتھ ساتھ دعاؤں سے اور نیک سفارشات سے بھی نوازا، مشرق سے لے کر مغرب تک کتنے ایسے عزیز ہیں جن کی توقع ہے کہ میں کبھی کبھار اُن کے حق میں دُعا کیا کروں، بارِ خدایا! میں کیسے الفاظ میں اُن کے لئے دُعا کروں اور کس قسم کی دُعا کروں کہ اُن کے حق میں یہ دُعا مفید ہو جائے اور اُن کے احسانات کے عوض میں اس دُعا سے کوئی فائدہ ملے، میں ایسی دُعا کہاں سے لاؤں، خداوند! کتنے ہیں اِس وقت دُنیائے اسماعیلیت میں جو احترام کرتے ہیں، جو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں، جن کے عظیم احسانات ہیں، اِس گردن پر کہ یہ گردن بارِ احسان سے جھک رہی ہے اور زمین سے ہموار ہوگئی ہے، کس قدر عظیم احسانات ہیں، میں اِس بارِ گران کو اٹھا نہیں سکتا ہوں، خداوند! تیری دستگیری کی ضرورت ہے، میں کن الفاظ میں دُعا گزاروں! میرا دل چاہتا ہے کہ ایسی کوئی عاجزانہ دعا کروں کہ جس سے میرے عزیزوں کو فائدہ ملے، اُن کو سکون حاصل ہو، اُن کی نیک مُرادوں کی تکمیل میں مدد ملے، ایسی دُعا میں کس طرح کرسکتا ہوں، خداوند! کتنے ایسے عزیز ہیں، جن کا حق ہے کہ میں ایسی مقدّس مجلس کے آخر میں اُن سب کے لئے دُعائے نیک یاد کروں اور اُن کو نیک دعاؤں سے یاد کروں لیکن خداوند! میں یہ فریضہ انجام نہیں دے سکتا ہوں، اِس کے لئے تیری مدد کی ضرورت ہے، خداوند! تیرا کتنا احسان ہے، تیری کتنی رحمت ہے، تیرا کتنا بڑا کرم ہے کہ تو نے عالمِ اسماعیلیت میں اِن عزیزوں کو خاص علم سے نوازا ہے اور اِن کو وہ بصیرت عنایت کی ہے، جس سے کہ وہ اپنے علمی فائدے کو سمجھتے ہیں، جس سے کہ وہ آگے بڑھتے ہیں اور انہوں نے محنت کی ہے، ریاضت کی ہے۔

خداوندا! خداوندا! انہوں نے طرح طرح کی مشقتیں اُٹھائی ہیں، اِس مجلس سے وابستہ ہونے کے سلسلے میں بہت سی تکالیف برداشت کی ہیں اور اِن کو اپنے ہی لوگوں نے کیا نہ کہا، کیا نہیں ستایا لیکن خداوند! اِس کے لئے اُن کو کچھ نہیں کرنا، اُن کو نیک توفیق عنایت کرنا اور اِن کے دل میں نیک توفیق ڈالنا، اِن مشقتوں کے عوض میں اِن کو آگے بڑھانا، اِن کو ترقّی دینا، اِن کو علم کی کامیابی عنایت کرنا، اِن کو رُوحانی ترقّی عنایت کرنا، اِن کو رُوحانیت کی دولت سے مالامال کرنا، اِن کو

معرفت کی دولت سے مالامال کرنا، خداوندا! خداوندا! اِن کو صداقت دینا، اِن کو حقیقت کے خزانوں سے مالامال کرنا، اِن کے دل کے اندر جتنے بھی نیک مقاصد ہیں اُن کی تکمیل فرمانا، اِن کے دل میں نرمی پیدا کرنا کہ اُس میں ہمیشہ شفقت ہو کہ اُس میں ہمیشہ مہربانی ہو کہ اُس میں ہمیشہ اپنے دین بھائیوں اور دین بہنوں کے لئے حُرمت ہو، عزت ہو اور ہمدردی ہو، ایسی نیک صفات، اِن کے دل میں رکھنا اور خداوند! جو کمزوریاں ہیں، جو خامیاں ہیں، اُن کو دُور کرنا اور ہر طرح کی خطاؤں کو بخش دینا، لغزشوں کے لئے معاف کرنا، اے خداوند! اے خداوند! اِن مشقتوں کا کوئی معاوضہ، کوئی انعام تو دے! کہ اِس زندگی میں بھروسہ ہو، تسلی ہو، یقین ہو کہ تُو نے اِن کی دُعا سن لی کہ تُو نے اِن کی محنت کو مشقّت کو قبول کیا، ایسی کوئی علامت ہو، ایسا کوئی اشارہ ہو، ایسی کوئی کرامت ہو۔ یا اکرم الاکرمین! یا ارحم الرّاحمین! بحضورِ پُرنورِ خود قبول فرمایا نورمولانا شاہ کریم الحسینی حاضر امام!!۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: کتابِ سماوی، پیغمبروں کے درجات، وحدتِ کثرت نُما

کیسٹ نمبر: ۱۸۔اے　　　　تاریخ: ۱۹۷۸ء، کراچی

Click here for Audio

میں اپنے عزیزوں کو آسمانی کتاب کے بارے میں کچھ بنیادی حقیقتیں بتلانا چاہتا ہوں اور میں نے آسمانی کتاب واحد کے صیغے میں کہا اور یہ نہیں کہا کہ آسمانی کتابیں، اِس کے کہنے کے معنی یہ ہیں کہ اصل میں آسمانی کتابیں ایک ہی کتاب کی حیثیت سے ہیں وہ الگ الگ نہیں ہیں یعنی رُوحانیت کے سرچشمے میں آسمانی کتابیں یا کہ سماوی کتابیں ایک ہی کتاب کی حیثیت سے ہیں۔ اِس لئے قرآن میں ''الکتاب'' (۳: ۱۸۴) کہا گیا ہے، الکتاب سے مُراد رُوحانیت کی کتاب ہے جہاں پر ظاہر کی تمام آسمانی کتابیں ایک ہو جاتی ہیں۔ تو یہی وجہ تھی کہ میں نے شروع ہی میں بجائے جمع کے واحد کے صیغے میں آسمانی کتاب کہا۔

اِس آسمانی کتاب کو سماوی کتاب بھی کہا جاتا ہے، تو آسمانی کتاب رُوحانیت کے مقام پر ایک ہی ہے اور اُس کی ظاہری شکلیں مختلف ہیں، ظاہری شکلوں سے مُراد صُحفِ ابراہیم، توریتِ موسیٰؑ، زبورِ داوٗدؑ، انجیلِ عیسیٰؑ اور قرآن محمّدؐ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہیں۔ ویسے تو آسمانی کتابیں اِن کتابوں کے علاوہ بھی ہیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے لیکن وہ کتابیں یا تو زمانے کی مدّت کے لحاظ سے دُنیا سے ناپید ہوئی ہیں یا لوگوں نے اُن کو ریکارڈ نہیں کیا ہے۔ تو بہر حال میں اِس کا بھی ذکر کرونگا کہ آسمانی کتاب کے لحاظ سے سارے انبیاء کیسے ہیں؟ آیا اُن میں سے ہر ایک پر کتاب نازل ہوتی ہے یا بعض پیغمبروں پر کتاب نازل ہوئی ہے، وغیرہ۔ تو میں اِس کی بھی ضرور وضاحت کروں گا اور یہاں اِس سلسلے میں سب سے پہلے یہ کہنا ہے کہ آسمانی کتاب یا کہ سماوی کتاب کن معنوں میں کہا جاتا ہے۔ آیا واقعتہً یہ کتاب جو اللہ تعالیٰ اپنے کسی نبی پر اپنے کسی رسول پر نازل فرماتا ہے آسمان سے نازل کرتا ہے یا اِس کے پس منظر میں بھی کچھ حکمت ہے، وغیرہ۔ تو غرض یوں ہے کہ آسمانی کتاب کہنے کا مطلب ہے کہ یہ رُوحانیت کی بلندی سے نازل ہوتی ہے جسمانیت کی پستی پر یا یوں کہنا چاہیئے کہ عالمِ رُوحانیت سے عالمِ جسمانیت میں اِس کا ظُہور ہوتا ہے اور اِس معنی میں اِس کی یوں مثال دی گئی ہے جیسے یہ آسمان سے [یعنی] اِس جسمانی آسمان سے نازل ہوگئی ہے۔ تو اِس آسمانی کتاب میں بھی یعنی اِس لفظ میں بھی تاویل ہے اور اِسی طرح نازل ہونے میں بھی تاویل ہے۔ نازل ہو جانا یا کہ نزول کرنا جو استعمال ہوتا ہے اِس کی بھی یہی تاویل ہے کہ کسی چیز کے بلندی سے پستی پر آنے کو یا کہ

کسی چیز کے اُوپر سے نیچے آنے کو نازل ہو جانا کہتے ہیں تو نزول بھی یہی معنی رکھتا ہے اور اِس کا بھی یہی مطلب ہے کہ آسمانی کتاب یا کہ آسمانی کتاب کی آیتیں رُوحانیت کی بلندی سے جسمانیت کی پستی پر اُترتی ہیں یا نازل ہو جاتی ہیں، اِس معنی میں کہا جاتا ہے کہ کوئی آیت نازل ہوئی یا کہ کتاب نازل ہوئی جیسے قرآن نازل ہوا وغیرہ، تو اِس میں آسمانی کتاب اور نزول کی وضاحت ہوئی۔

اب سوال یہ ہے کہ اِس آسمانی کتاب کے ایک ہونے کے ساتھ ساتھ کیا یہ ایک واحد رُوحانی کتاب سب انبیاء کے درمیان مشترک ہے؟ یا کہ کچھ انبیاء یعنی کچھ پیغمبر اِس آسمانی کتاب سے مستثنیٰ ہیں، آیا اُن [میں سے] بعض پر آسمانی کتاب نازل ہوتی ہے اور بعض اِس سے الگ رہتے ہیں؟ اِس سوال کا جواب یوں ہے کہ ہر حالت میں جس طرح سب آسمانی کتابیں ایک ہیں اِسی طرح تمام انبیاء بھی ایک ہیں، اِس مقصد میں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب نازل کی ہے جس کی ظاہر میں بہت سی شکلیں ہیں، تو اِس مطلب میں اور اِس مقصد میں سب انبیاء ایک ہیں۔ یعنی بظاہر یہ کتاب جو آسمان سے اُتری ہے یعنی جو تاویل کے لحاظ سے رُوحانیت کی بلندی سے نازل ہوئی ہے یہ کتاب تمام پیغمبروں کے درمیان مشترک ہے بلکہ سارے اماموں کے درمیان بھی تاویل کے لحاظ سے یہ کتاب مشترک ہے، جو آسمانی کتاب ہے، جو سماوی کتاب ہے، اور اس سلسلے میں قرآن کے اندر بہت سی آیتیں ہیں جن کے فلسفے سے یا جن کی حکمت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ واقعتہً آسمانی کتاب ایک ہے اور جس طرح آسمانی کتاب ایک ہے اسی طرح سب انبیاء اس آسمانی کتاب پر ایک ہیں اور سب کے سب انبیاء و ائمہ اِسی ایک کتاب کی تنزیل و تاویل سے وابستہ ہیں اور اِس لئے نہ صرف اللہ کی سب کتابیں ایک ہیں بلکہ اللہ کے سب پیغمبر بھی اِس مقصد میں ایک ہیں، ہر چند کہ ظاہر میں خدا کی آسمانی کتاب کی مختلف شکلیں ہیں اور اِس کی یہ مختلف شکلیں اِس لئے ہیں کہ مختلف ادوار میں یا مختلف زمانوں میں اللہ تعالیٰ نے دُنیا والوں کی ہدایت کے لئے جو انبیاء بھیجے اور اُن میں سے ہر نبی جس قوم میں آیا اور اُس قوم کی جو بھی زبان تھی اللہ تعالیٰ نے اُس زبان میں اپنی کتاب کی ایک صورت نازل کر دی۔ یعنی خداوندِ عالم نے ہر نبی کو اُس کی قوم کی زبان میں جس طرح بھیجا اُسی طرح اُس نے رُوحانیت کی کتاب کو اُسی زبان کا لباس پہنایا، اُسی زبان میں جو اس قوم کی تھی اللہ نے رُوحانیت کی کتاب کو ظاہر کیا اور یہی سبب ہے جو قرآن کی ایک آیت میں فرمایا گیا ہے: وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ (۲۶:۱۹۶) اور قرآن اگلی اُمتوں کی آسمانی کتابوں میں بھی ہے۔ اِس ارشاد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف آسمانی کتابیں قرآن کے ساتھ ایک ہیں بلکہ مختلف آسمانی کتابیں اِسی ایک قرآن کی مختلف شکلیں ہیں۔ اِس ارشاد میں بہت بڑی حکمت ہے اور سوچنے کی بات ہے جو فرمایا گیا کہ قرآن اگلی اُمتوں کی آسمانی کتابوں میں بھی ہے، اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگلی اُمتوں کی آسمانی کتابوں میں قرآن عربی زبان میں تھا، عربی زبان میں اُس وقت نہیں تھا، بلکہ اگلی اُمتوں کی آسمانی کتابوں کی جو زبانیں

تھیں ماضی میں انہی زبانوں میں قرآن تھا، تو آنے والے زمانے میں بھی قرآن کی کوئی اور شکل ہوسکتی ہے، اِس کی کوئی اور زبان ہوسکتی ہے، اِس کا کوئی اور ترجمہ ہوسکتا ہے۔ تو یہی سبب ہے جو اسماعیلی مانتے ہیں کہ امامؑ جو کچھ فرماتا ہے وہ قرآن کا مغز ہے وہ قرآن کی حکمت ہے۔

جس طرح کہ ابھی ابھی یہ بات بتائی گئی کہ قرآن اگلی کتابوں میں بھی تھا تو پچھلی کتابوں میں بھی ہونا چاہئے یعنی قرآن کے بعد اور کوئی کتاب نہیں ہے، قرآن کے بعد اگر کوئی کتاب ہے تو وہ امامؑ ہے، تو اِس قرآن کو مستقبل میں بھی ہونا چاہئے، تاکہ اِس کا وجود، اِس کی حیثیت، اِس کی حکمت اور وہ ہدایت جو زمانے کے موافق ہوا کرتی ہے جاری اور باقی رہے اور ایسا ہی ہے کہ ہادیٔ برحق امامِ زمان کی ہدایتوں میں وہی قرآن ہے جو کبھی ماضی میں تھا اور دُوسری طرف سے یہ کہنا ہے کہ آسمانی کتاب جہاں رُوحانیت میں ایک ہی شکل سے ہے اور جہاں پر یہ ایک رُوح کی حیثیت سے ہے، جہاں پر یہ ایک نور ہے تو وہاں پر آسمانی کتاب امامؑ سے مل کر ہے، وہاں پر آسمانی کتاب امامؑ کے ساتھ ایک ہے۔ قرآن میں ہے کہ قرآن ایک رُوح ہے (۴۲:۵۲)۔ لیکن جاننے والا جانتا ہے کہ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن کا ظاہر رُوح ہے۔ قرآن کا ظاہر رُوح نہیں ہے، رُوح سے مُراد بولنے والی شئی ہے، رُوح سے مراد قوتِ گویائی ہے، رُوح سے مراد عقل و دانش ہے، رُوح سے مُراد علم و حکمت ہے، رُوح سے مراد نور ہے۔ لہٰذا قرآن مقامِ رُوحانیت پر رُوح ہے اور جہاں یہ رُوح ہے وہاں پر نور ہے کیونکہ رُوح اور نور دونوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ اِس لئے کہ کوئی بڑی رُوح نور کے بغیر نہیں ہے، جو بھی عظیم رُوح ہو وہ نور ہے اور جو نور ہے وہ رُوح ہے۔ لہٰذا مقامِ رُوحانیت پر امامؑ اور آسمانی کتاب ایک ہے، اِس لئے اسماعیلیوں کی تاویلات میں امام کو کتاب کہا گیا ہے، قرآن کی تاویل کے لحاظ سے، قرآن کی حکمت کے اعتبار سے، امام کو ''الکتاب'' (۳:۱۸۴) کہا گیا ہے۔

یہاں پر ایک مثال میں آپ کو پیش کروں گا تاکہ یہ مطلب اچھی طرح سے آپ کے ذہن نشین ہو جائے اور وہ مثال یہ ہے کہ آپ کو تورات، انجیل وغیرہ کے بارے میں قرآن کے اندر دو باتیں ملیں گی یعنی بعض آیتوں میں یہ بتلایا جائے گا کہ اُن کتابوں کی کوئی اب حیثیت نہیں رہی ہے، اُس میں لوگوں نے مداخلت کی ہے، دست اندازی کی ہے اور اُس میں بہت کچھ تبدیلیاں کی ہیں، تو آپ کو قرآن میں یہ اعتراض ملے گا اور اِس کے برعکس بعض آیتوں میں آپ کو اُن سابقہ آسمانی کتابوں کے بارے میں بہت سی تعریفیں بھی ملیں گی۔ آیا ممکن ہے کہ خدا کے کلام میں اور خدا کے کلام کے بارے میں تضاد ہوسکتا ہے یا اِس میں کوئی وجہ ہے، کوئی حکمت ہے، جس کو سمجھنا چاہئے، تو تضاد نہیں ہے اور اگر ہے تو ظاہر میں ہے لیکن حقیقت میں اِن دو قسم کی آیتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ اِن دو قسم کی آیتوں کا مقام الگ الگ ہے وہ یہ کہ جہاں پر فرمایا گیا ہے کہ تورات اور انجیل میں تبدیلیاں اور ترمیمات کی گئی ہیں تو یہ بات صحیح ہے اور اِن ارشادات کا اطلاق

تورات اور انجیل کے ظاہر پر ہوتا ہے اور واقعتہً تورات، انجیل وغیرہ جو ظاہری کتابیں ہیں اُن کی اصلی حیثیت نہیں رہی ہے اور اُن کتابوں کو مسخ کیا گیا ہے، بہت سی ترمیمات اور بہت سے اضافے اپنی طرف سے کئے گئے ہیں۔

لہٰذا قرآن کا اعتراض بجا ہے، صحیح ہے اور جہاں پر اِن آسمانی کتابوں کی تعریف کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ اُن کتابوں میں نور ہے، ہدایت ہے اور اُس کے مطابق اگلے زمانے کے رہنما ہدایت کرلیا کرتے تھے تو اِس تعریف کے یہ معنی ہیں کہ اِس تعریف کا اطلاق رُوحانیت کے مقام پر ہوتا ہے جہاں پر کہ آسمانی کتابیں اصلی صورت میں ایک ہیں، رُوح کی حیثیت میں ہیں اور نور کی حیثیت میں ہیں، تو جہاں پر آسمانی کتابیں رُوحانی حیثیت میں ہیں، باطنی حیثیت میں ہیں اور ایک زندہ نور کے طور پر ہیں تو وہاں پر [مُراد] امامؑ ہے۔ گویا کہ اِس تعریف کا اطلاق امامؑ پر ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: موسیٰؑ کی تورات ایسی تھی کہ اُس میں ہدایت تھی اور اُس میں نور تھا (۵:۴۴)۔ تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰؑ کے زمانے میں جو رُوحانی کتاب تھی وہ رُوحانیت میں مولانا ہارونؑ کے نور کے عنوان سے تھی تو اِس معنی میں امام کو کتاب [یعنی] کتابِ ناطق کہا گیا ہے اور یہی مثال انجیل کی بھی ہے (۵:۴۶)۔ کہ انجیل جہاں پر رُوحانیت میں نور کی حیثیت سے تھی۔ وہاں اُس زمانے کے امام کا نور تھا اور نور چونکہ دو نہیں ہوتے بلکہ نور ایک ہی ہوتا ہے اور اِس لئے امام کی آسمانی کتاب کی رُوح سے وحدت ہے یا کہ کتاب کی تاویل امام ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ کتاب کی رُوح اور امام کا نور ایک ہی حقیقت کے یا کہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

اب وہ بات کہ کس طرح ہم مانیں کہ سب پیغمبروں کے درمیان آسمانی کتاب یا کہ امام کا نور مشترک ہے تو اِس کے سلسلے میں بہت سی آیات ہیں اور اُن میں سے ایک آیت کی طرف میں آپ کو اشارہ کرتا ہوں جو ایک ضروری آیت ہے کہ: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲:۲۸۵) کا مطلب ہے کہ ہم پیغمبروں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی ہم جدائی نہیں ڈالتے ہیں یعنی ہم پیغمبروں کو الگ الگ نہیں مانتے ہیں، اُن کی حیثیتوں کو ایک قرار دیتے ہیں، اُن کی رُوحانیت کو ایک قرار دیتے ہیں، اُن کے مقصد کو ایک قرار دیتے ہیں، اُن کے دین کو ایک ہی سمجھتے ہیں، اُن کی دعوتِ حقّہ کو ایک ہی تسلیم کرتے ہیں۔

یہاں پر ایک اور نکتہ بیان کرنے کے قابل ہے وہ یہ کہ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کی رُوحانیت منفرد اور جداگانہ قسم کی تھی حالانکہ یہ بات نہیں ہے، اور اِس سلسلے میں عوام یہ بھی کہتے ہیں کہ طوفان صرف نوح کے زمانے میں برپا ہوا تھا اور ملائکہ نے صرف آدم کو سجدہ کیا تھا، آگ میں صرف ابراہیمؑ کو ڈالا گیا تھا اور لاٹھی صرف موسیٰؑ کی تھی اور موسیٰؑ ہی صرف خدا سے کلام کرتا تھا، صرف عیسیٰؑ ہی مُردوں کو جِلاتا تھا یعنی زندہ کرتا تھا اور صرف آنحضرتؐ ہی معراج [پر] گئے تھے، یہ لوگ اِن انبیاء کے واقعات کو اِس طرح سے بیان کرتے ہیں اور حالانکہ بات کچھ اور ہے وہ یہ کہ رُوحانیت سب پیغمبروں میں مشترک ہے اور رُوحانیت ایک ہی ہے، رُوحانیت کے معجزات ایک جیسے ہیں، لیکن عنوانات الگ

الگ دیئے ہوئے ہیں، الفاظ جُدا جُدا ہیں، جبکہ سجودِ ملائکہ ایک رُوحانی واقعہ ہے۔ انبیاء و ائمہ تو درکنار ایک حقیقی مومن بھی اگر معرفت کے سلسلے میں یعنی خدا کی پہچان کے رستے پر اُس مقام تک پہنچتا ہے تو اُس کو بھی فرشتے سجدہ کرتے ہیں۔ اسماعیلیوں سے گزر کر صوفیوں نے بھی تسلیم کیا تصوّف کی بہت سی کتابوں میں یہ ذکر آتا ہے کہ تم اُس مقام تک جاؤ وہاں تک پہنچو جہاں کہ فرشتے عارف کو سجدہ کرتے ہیں۔ چونکہ فرشتوں سے مُراد انسان کی اپنی قوتیں ہیں جو لاتعداد قوتیں ہیں، چونکہ فرشتے دو قسم کے ہیں، کسی نے پوچھا بھی نہیں کہ جن فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا وہ جلالی تھے یا جمالی یعنی عظیم قسم کے فرشتے تھے یا چھوٹے چھوٹے فرشتے؟ اگر فرض کر لیا جائے کہ عظیم فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا اور آدمؑ نے اُن عظیم فرشتوں کو تعلیم دی اور آدم کے وجود میں آنے تک وہ سب فرشتے لاعلم تھے اور کچھ بھی نہیں جانتے تھے تو اِس کا نتیجہ یوں نکلے گا کہ قرآن میں یوں کہا گیا ہے کہ: آدمؑ نے ملائکہ کو تعلیم دی اور اسماء کی تعلیم دی (۲:۳۳)۔ اسماء کی تعلیم کی وضاحت کچھ زیادہ ہے، خواہ وہ اسماء دُنیا کی چیزوں کے نام ہوں یا خدا کے نام ہوں تو اگر اِس قصّہ کو ہم اِس طرح سے مانیں تو لازم آتا ہے کہ اُس وقت تک عقلِ کُل، نفسِ کُل، جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل اور حملۃُ العرش یعنی عرش کے اُٹھانے والے [کیا] یہ سب عظیم اور اِن جیسے بہت سارے فرشتے لاعلم تھے کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے، کچھ بھی نہیں جانتے تھے؟ تو یہ بات ممکن نہیں ہے۔ آدمؑ نے جن ملائکہ کو رُوحانی تعلیم دی وہ ایک تاویل کے لحاظ سے اُس زمانے کے مومنین تھے یعنی اپنے زمانے کے مومنین کی رُوحوں کو اُس نے تعلیم دی، وہی مومنین اُس زمانے کے فرشتے تھے۔ یہ مومنین آدمؑ کی اپنی قوتوں کی حیثیت سے تھے۔ جس طرح کہ میں نے ابھی ابھی کہا کہ فرشتے دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک قسم میں عظیم فرشتے آتے ہیں اور دُوسری قسم میں چھوٹے چھوٹے فرشتے تو عظیم فرشتوں کو جلالی فرشتے کہا جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے فرشتوں کو جمالی فرشتے کہا جاتا ہے، تو آدمؑ نے جن فرشتوں کو تعلیم دی وہ جمالی فرشتے تھے، جلالی نہیں تھے، تو جلالی فرشتے انبیاء اور ائمہ کی شخصیتیں اور پیر، بزرگ، عاشق، عارف آگے چل کر جلالی فرشتے بن جاتے ہیں۔

<u>جو معرفت کو پا چکے ہیں وہی جلالی فرشتے ہیں اور زمانے کے مومنین جمالی فرشتے ہیں اِن کو تعلیم کی ضرورت ہے</u>

اور یہ تاویل اِس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم اسماعیلی کائنات کا آغاز اُس وقت سے نہیں کرتے ہیں جبکہ آدم کا ظہور ہوا۔ ہم تو مانتے ہیں کہ یہ دُنیا و کائنات، خدا کی بادشاہی بہت پہلے سے ہے بلکہ ہمیشہ سے ہے اور پیدائش کا سلسلہ بھی ایک دائرے کی طرح ہے۔ اِس لئے یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ علم اور معلم، تعلیم اور شاگردی کا آغاز آدم سے ہوا اور اِس سے پہلے کچھ بھی تعلیم نہ ہو، یہ بات دُرست نہیں ہے اور اِس سے معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو جن فرشتوں نے سجدہ کیا تھا انہی فرشتوں نے دُوسرے تمام انبیاء کو بھی سجدہ کیا، اور جو طوفان روحانی طور پر نوح کے زمانے میں برپا ہوا تھا وہ ہر زمانے میں ہے اور ابراہیم کو جس آگ میں ڈالا گیا تھا وہی آگ فتنہ و فساد اور شرّ اور اذیّت کی آگ ہے [جو] ہر زمانے میں ہے، ہر عارف کو ہر عاشق کو

اور اِس سے پہلے ہر امام کو ہر پیغمبر کو اسی آزمائش و امتحان کی آگ میں ڈالا جاتا ہے، مُراد یہ ہے کہ رُوحانیت کے تجربات میں ایسی چیزیں آتی ہیں اور ابراہیم خود امام تھے اور جو رُوحانیت کی چیز ایک امام پر گزرتی ہے تو دُوسرے امام پر بھی وہی چیز گزرتی ہے اور دُنیا زمانے میں مخالفین کا جو شرّ و فساد ہے جو بُرائی ہے وہ نہ صرف امام کے سامنے آگ بن کر پیش ہوتی ہے بلکہ ہر عارف کے سامنے بھی آگ بن کر آتی ہے لیکن خداوندِ عالم اپنی رحمت سے اُس کو گلستان بناتا ہے، گلشن بناتا ہے جس طرح کہ نمرود کی آگ کو خداوندِ عالم نے ابراہیمؑ کے لئے رُوحانیت کا گلشن بنایا تھا۔

اِسی طرح عصائے موسیٰ یعنی موسیٰؑ کی لاٹھی نہ صرف موسیٰؑ ہی کی تھی بلکہ اِس سے مراد اسمِ اعظم ہے جو تمام پیغمبروں اور اماموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ سلیمان کی انگوٹھی نہ صرف سلیمان کے پاس تھی بلکہ ہر پیغمبر اور ہر امام کے پاس ہے اور سلیمان کی انگوٹھی سے مُراد اسمِ اعظم ہے۔ اِسی طرح نہ صرف عیسیٰؑ ہی مُردوں کو زندہ کر دیتا تھا بلکہ ہر پیغمبر نے اور ہر امام نے یہ معجزہ کیا بلکہ پیروں نے بھی یہ کام کیا۔ میں نے کبھی تشریح کی تھی کہ مُردے کو زندہ کرنا کس طرح سے ہے، ایک دُور کے شخص کو جس کو معرفت نہ ہو ایمان کی دولت سے مالا مال کرنا اور اُس کے مُردہ دل کو معرفت کے آبِ حیات سے زندہ کر دینا اور نورِ ایمان سے اُس کو منوّر کرنا یہ مُردے کو زندہ کرنے کی طرح ہے اور اِسی طرح عیسیٰؑ کے دُوسرے معجزات کی بھی یہی تاویل ہے، تاویل میں ہر پیغمبر اور ہر امام عیسیٰ کے معجزات کرتا ہے۔

اب معراج کی بات آتی ہے تو معراج بھی آنحضرتؐ کے لئے مخصوص نہیں تھی، معراج رُوحانیت کو کہتے ہیں، رُوحانیت کی چوٹی کو اور رُوحانیت کی ترقّی کا نام معراج ہے، تو یہ معراج انبیاء و ائمہ کے بعد حقیقی مومنین پر بھی گزرتی ہے اور امام سلطان محمد شاہؑ نے اپنی کتاب آپ بیتی کے اُس باب میں جس کا عنوان ہے ''اسلام میرے مورثوں کا مذہب'' اُس میں امام نے کچھ رُوحوں کو معراجی درجے کی رُوحیں قرار دیا ہے (اسلام میرے مورثوں کا مذہب۔ ص: ۱۳)۔ اِس سے ظاہر ہے کہ پیغمبروں اور اماموں کے علاوہ حقیقی مومنوں کو بھی معراج کا درجہ حاصل ہوتا ہے، معراج رُوحانیت ہے اور اسماعیلوں کا تصوّر کچھ ایسا ہے، تو اِسی میں اُس آیت کی تشریح آ گئی جو میں نے کہا تھا کہ: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲:۲۸۵) ہم ایک پیغمبر کو دُوسرے سے الگ نہیں کرتے ہیں، یہ نہیں کہتے ہیں کہ اِس کی رُوحانی کتاب نہیں تھی، اس پر آسمانی کتاب نازل نہیں ہوئی تھی، نہیں کہتے ہیں کہ اِس کی رُوحانیت نہیں تھی، اِس کو معراج نہیں ہوئی تھی اور یہ عیسیٰؑ کی طرح نہیں تھا اور اِس نے خدا سے کلام نہیں کیا تھا یہ بات نہیں ہے خدا سے کلام تو سب پیغمبر کرتے ہیں۔ ہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیا وجہ ہے کہ مختلف پیغمبروں کو مختلف عنوانات سے پیش کیا گیا ہے؟ جس سے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ بس یہ خاصیت اِسی پیغمبر کی تھی اور یہ معجزہ فلان پیغمبر کا تھا تو خدا نے ایک ہی طرح کی رُوحانیت کو مختلف عنوانات میں تقسیم کر کے اُن مختلف عنوانات میں جُدا جُدا پیغمبروں کا نام اِس لئے لیا تا کہ ایک طرف سے اِس میں آزمائش ہو کہ دانشمند کیا سمجھتا ہے اور دُوسرے لوگ کیا سمجھتے

ہیں اور دُوسری طرف سے اِس میں یہ مقصد تھا کہ رُوحانی معجزات کے مختلف گوشوں کا الگ الگ ذکر کیا جائے اور ہر پیغمبر کو رُوحانیت کی کسی خاص بات کے ساتھ پیش کیا جائے تا کہ اُمتوں کو یہ فخر ہو کہ اُن کے پیغمبر میں یہ خاصیت تھی یہ معجزہ تھا۔

اِسی کے ساتھ معراج سے متعلّق ایک اور سوال کو حل کر کے جائیں وہ یہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ معراج ہوئی تھی، بعض کہتے ہیں کہ کئی دفعہ معراج ہوئی تھی۔ ہم اِس کے قائل ہیں کہ معراج کئی دفعہ ہو سکتی ہے نہ کہ ایک دفعہ اور دُوسرا سوال اِس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ معراج جسمانی طور پر ہوئی تھی۔ ہم تو یہ کہتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ وہ رُوحانی طور پر ہوئی تھی تو میں نے یہاں تک جو کچھ باتیں کی وہ باتیں کچھ ایسی بھی ہیں جن کا ہماری کتابوں میں ذکر ہو چکا ہے، خصوصاً سوسوال میں ایسی بہت سی باتیں آئی ہیں معراج کا بھی اِس میں ذکر آیا ہے اور معراج پر ایک الگ آرٹیکل بھی آچکا ہے۔ بہر حال آسمانی کتاب کے سلسلے میں کچھ (General Knowledge) دینا تھا اور جس میں اہم باتیں بتلائیں گئیں۔ اُمید ہے کہ آپ اِن باتوں کو ذہن میں رکھیں گے اور اِس سلسلے میں کوئی سوال پیدا ہوا ہو تو اچھی بات ہے کہ وہ آپ اب یا بعد میں جب بھی چاہیں پوچھیں تا کہ ہمارا جو کورس ہے وہ آگے بڑھے۔ اپنے عزیزوں کو علم دینے سے متعلّق جو منصوبہ ہے وہ ہم چاہتے ہیں کہ اِس طرح (General Knowledge) دیں کہ آپ پھر اسماعیلی کتابوں میں جا سکیں اور قرآن کے مقاصد کو سمجھ سکیں اور آسانی سے تاویل کے اصولوں کو پا سکیں۔ تو اِس کے لئے یہ باتیں بہت ہی مفید اور مُمّد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں اور اِسی کے ساتھ میرے خیال میں مَیں اِس گفتگو کو ختم کرتا ہوں اور کسی سوال کے لئے انتظار کرتا ہوں۔

سوال: پیغمبروں کے درجات کسی خاص درجے کے بعد حاصل ہوتے ہیں یا درجہ وار ہیں؟

جواب: یقیناً ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ درجہ وار بھی ہیں اور اُن درجات کے ہونے میں مصلحت اور حکمت بھی ہے اور ایک طرح سے دیکھا جائے تو درجہ وار نہیں بھی ہیں لیکن بظاہر درجہ وار ہیں ہم اِس کو ترتیب کے لحاظ سے مانیں گے۔ جیسے [کچھ] عظیم پیغمبر ہیں، کچھ پیغمبر ایسے ہیں جن پر کتابیں نازل ہو چکی ہیں، کچھ پیغمبر ایسے ہیں جو اگلے پیغمبروں کے جانشینوں کی حیثیت سے، اُن کے وارثوں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں لیکن وابستگی میں، مقصد میں اور رُوحانیت میں وہ سب ایک ہیں۔

سوال: سر! آپ نے یہ کہا کہ قرآن کی رُوح اور نورانیت جو ہے وہ امام کا نور ہے، جیسے آپ نے فرمایا کہ تورات کا جو نور ہے وہ ہارون کا نور ہے، تو اُس کو موسیٰؑ کا نور بھی کہہ سکتے ہیں اور کیا قرآن امام اور نبی دونوں کا نور ہے؟

جواب: جی ہاں، وہ درست ہے۔ چونکہ پیغمبر اور امام ایک ہوا کرتے ہیں، اُن کے آپس میں وحدت ہوتی ہے، یگانگت

ہوتی ہے،(Unity) ہوتی ہے اور وہ نور میں ایک ہوتے ہیں، اِسی طرح اُن کی کتاب اُن کی رُوحانیت [ایک] ہے اور صرف اِس میں اتنی سی بات ہے کہ جس طرح دُنیا میں پانی ہے تو پانی کے دو حصّے ہیں۔ ایک حصّہ مرکز کی حیثیت سے سمندر یا بحرِ محیط کہلاتا ہے اور پانی کا جو دُوسرا حصّہ ہے وہ شاخوں میں پھیلا ہوا ہے تو اب یہ پانی کے دونوں حصّے ایک دُوسرے کو مدد کر رہے ہیں، جو سمندر ہے وہ بادلوں کو (Supply) کرتا ہے اور بادل بارش برساتے ہیں اور بارش سے ندّیاں پھر دریا بنتے ہیں اور پھر اِس سے سمندر کو تقویت ملتی ہے، تو یہ ایک چکّر سا ہے، دائرہ سا ہے۔ اسی طرح ایک ہونے کے باوجود یہ کہہ سکتے ہیں کہ امام سے پیغمبر کو اور پیغمبر سے امام کو رستہ ہے، کبھی آپ نے سوچا ہوگا کہ سلسلۂ نورِ امامت میں کچھ دائرے ہیں کچھ نقشے ہیں، اُن میں میں نے اِس بات کی نشاندہی کی ہے اور اِس کا ایک نقشہ، اِس کا ایک تصوّر وہاں پیش کیا ہے اور جس طرح پانی کی مثال میں نے دی اور دُوسری ایک مثال یہ ہے کہ درخت سے پھل بنتا ہے پھر پھل کی گٹھلی سے، مغز سے درخت بنتا ہے اور اِس درمیان میں ایک دائرہ ہے ایک (Circle) ہے درخت اور پھل کے درمیان، وہ اِس طرح سے کہ ہم نہیں کہہ سکتے ہیں کہ پھل پہلے ہے یا درخت پہلے ہے، چونکہ یہ گول گول چیز ہے کہ پھل سے درخت ہے اور درخت سے پھل ہے تو اِس کا کوئی آغاز نہیں ہے، یہ دائرہ ہے اور دائرے کی کوئی حد نہیں ہے، دائرے کی کوئی (Begining) نہیں ہے۔ اسی طرح پیغمبر سے امام کو نور ملتا ہے اور امام سے پیغمبر کو نور ملتا ہے۔ اگر غور نہیں کیا جائے تو اِس سے عجیب بات ہوگی۔

ایک حدیث میں آپ کو بیان کروں پیغمبر نے فرمایا ہے کہ: اِنَّ عَلِیّاً مِنّی وَ اَنَا مِنہُ علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں، کسی سادہ انسان کو ظاہری طور پر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ دو شخص ایک دُوسرے کے باپ بیٹے کس طرح ہو سکتے ہیں یعنی میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُس کا باپ ہو اور وہ اِس کا باپ ہو، اِس طرح سے کہ یہ اُس سے پیدا ہوا ہو اور وہ اِس سے پیدا ہوا ہو، یہ تو نہیں ہو سکتا۔ ایک، ایک سے پیدا ہوتا ہے تو یہ ایک دُوسرے سے پیدا نہیں ہو سکتے ہیں لیکن یہ جو حدیث ہے یہ ایسی ہے جیسے وہ ایک دُوسرے سے پیدا ہوئے ہوں لیکن اِس کی تاویل ہے۔ اور وہ تاویل یہ ہے کہ علیؑ کی ظاہری حیثیت، علمیّت، مرتبہ اور وصی ہونا اور وزیر ہونا، جانشین ہونا یہ سب کچھ آنحضرتؐ سے تھا، اِس معنی میں پیغمبرؐ نے کہا کہ علیؑ مجھ سے ہے اور صحیح فرمایا پھر فرمایا کہ میں علیؑ سے ہوں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبرؐ کی نورانی حیثیت اور اُن کا نور علیؑ اور ائمہؑ اولادِ علی سے دنیا میں زندہ اور قائم ہے۔ تو دونوں باتیں صحیح ہیں، اگر ہم اِس (Circle) کے نصف کو الگ اور نصف کو الگ مانتے ہیں تو یہ دو چیزیں ہیں۔ جس طرح کہ ہم سورج کے اگلے منظر کو دیکھتے ہیں اور پچھلے منظر کو نہیں دیکھتے ہیں حالانکہ وہ نور ہے، لیکن نور، نور کو چُھپاتا ہے اِس واسطے ہم سورج کے پس منظر کو نہیں دیکھتے ہیں، پیش منظر کو دیکھتے ہیں اور جب ہم سورج کے پس منظر کو بھی دیکھیں گے تو کہیں گے کہ سورج کے پیچھے بھی نور ہے اور سورج گول ہے۔ اِسی طرح اگر ہم پورے (Circle) کو پا سکتے ہیں تو کہیں گے کہ کوئی ابتدا نہیں ہے اور اگر پورے (Circle) کو نہیں پا سکتے ہیں تو کم سے کم

کہیں سے اپنے لئے آغاز فرضی طور پر بھی مقرر کریں گے، حدِ آغاز مقرر کریں گے، (Starting Point) رکھیں گے، کہیں گے کہ ہم نے یہاں سے شروع کیا۔ دُنیا میں جب مشرق اور مغرب کی کوئی حد نہیں ہے تو کیا دلیل ہے اور کیا ثبوت ہے کہ جن ملکوں کو (Western Countries) کہا جاتا ہے وہ حقیقت میں (Western) ہیں؟ اور جو ممالک مشرقی ہیں اور وہ حقیقتاً مشرقی ہیں اِس کا کیا ثبوت ہے؟ سورج کو دکھا کر کوئی ثابت کرے کہ یہ مشرق ہے اور یہ مغرب ہے، کسی لکیر سے کسی پوائنٹ سے کسی منزل سے یہ تو تعیّن کی بات ہے، لوگوں نے خود ہی تعیّن کیا ہے، اِس کو کہتے ہیں تعیّن کرنا۔ سال بارہ مہینے کا ہے، لیکن لوگ چاہتے تو چودہ مہینے کا سال قرار دے سکتے ہیں، اِس کو چودہ حصّوں پر تقسیم کر سکتے ہیں، ہفتہ سات دن کا ہے، لوگ اگر چاہتے تو دس دن کا قرار دیتے لیکن یہ تعیّن ہے۔

مطلب یہ ہے کہ امام اور پیغمبر دائرے کی طرح سے ہیں اگر پورے دائرے کو ماننا ہے تو وہ ایک ہے، اگر نصف نصف دائرے کو ماننا ہے تو دونوں الگ الگ ہیں، ہم اپنی رسائی کے مطابق بات کر سکتے ہیں یا سننے والوں کی حیثیت کے مطابق بات کر سکتے ہیں۔ بچوں کو تعلیم کس طرح دی جاتی ہے اُن کے فہم و فراست کے مطابق، جس طرح قرآن میں مختلف سطحوں کی تعلیمات ہیں، وہاں پر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمات بھی ہیں اور کم سے کم تعلیمات بھی ہیں اور درمیانی قسم کی تعلیمات بھی ہیں۔ قرآن میں اور اسی طرح امامؑ کے فرامین میں بھی تعلیمات کی بہت بہت سی منزلیں ہیں۔ آپ کو بعض دفعہ تضاد معلوم ہوگا، مجھے معلوم ہے کہ جب میں اپنے عزیزوں کے ساتھ شروع شروع میں باتیں کرتا تھا تو کچھ نئے عزیز یہ محسوس کرتے تھے کہ میں جو بات کرتا ہوں وہ بات کسی پیر کے ارشاد سے یا فرمان سے الگ اور اُس سے مختلف بات ہے تو اِس واسطے وہ اپنے سوال کو سامنے لاتے تھے، تو میں اُن کو بتلاتا تھا کہ یعنی پیر کا فرمانا اور امام کا ارشاد صحیح ہے اور جو کچھ میں کہتا ہوں وہ بھی صحیح ہے لیکن میری بات امامؑ کے فلاں فرمان کے مطابق اور پیر کے فلاں ارشاد کے مطابق ہے تو اِس سے مراد یہ ہے کہ تعلیمات الگ الگ درجوں کی ہوتی ہیں۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ جو بات بتائی جاتی ہے وہ نئی ہے، انوکھی ہے، نرالی ہے اور دینی تعلیمات کے خلاف ہے تو یہ کسی کی کمزوری ہو جائے گی۔ میں ایک مثال بیان کرتا ہوں، اِس سوال سے براہِ راست اِس کا تعلق نہیں ہے کیونکہ میں نے بہت دُور تک وضاحت کی، بہت دُور چلا گیا اِس واسطے۔ بہرحال ہماری عادت یہ ہے کہ بعض دفعہ کسی بھی سوال کو ایک طرح سے حل کرنے کے باوجود ہم پھر اُسی میں رہتے ہیں، نامعلوم کیوں ایسا ہے۔

تو بہرحال یہ سوال تو میرے خیال میں حل ہو گیا کہ درخت سے پھل ہے، پھل سے درخت ہے، بلکہ کثرت سے وحدت ہے اور وحدت سے کثرت ہے یہ بات کسی کو نہیں بتلانا کہ کثرت سے وحدت ہے اور وحدت سے کثرت ہے، مگر خاص کسی عزیز کو بتائیں تو کوئی بات نہیں ہے، کیونکہ کثرت سے میری مراد یہ لوگ یہ انسان ہیں جو کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں، اِن کے اندر ایک (Unity) ہے اور یہ جو کثرت ہمارے سامنے ہے یہ وحدتِ کثرت نما ہے، میں نے کبھی یہ بات بھی

بتلائی تھی، وحدتِ کثرت نما کا مطلب ہے ایسی وحدت جو کہ ظاہر میں کثرت نظر آتی ہے، اِسی لئے رسول اللہؐ نے فرمایا کہ دین کی بنیاد مخلوق کی طرح رکھی گئی ہے اور مخلوق میں دین کی مثال ہے اور دین میں توحید کی مثال ہے، وہ حدیث یہ ہے: اِنَّ اللہ اَسَّسَ دِینَہٗ عَلٰی اَمثَالِ خَلقِہٖ لِیُستَدلَّ بِخَلقِہٖ عَلٰی دِینِہٖ وَ بِدِینِہٖ علیٰ وَ حدَانِیَّتِہٖ ہم اِس سے کس طرح خدا کی یکتائی اور وحدانیت کی مثال لیں گے، اتنی ساری خلقت سے ہم کو توحید کی کیا مثال مل سکتی ہے؟ اِس کی مثال اِس طرح سے ہم کو مل سکتی ہے کہ جس طرح لوگ اپنی رُوح میں ایک ہیں، مقصد میں ایک ہیں، خدا کی خدائی میں ایک ہیں، دین میں ایک ہیں اور قیامت میں، حشر میں، نشر میں، پیدا ہو جانے میں اور پھر مر جانے میں ایسی بہت سی چیزوں میں ایک ہیں، اِسی طرح دین بھی ایک ہے اور جس طرح دین ایک ہے خدا کی وحدت مونو ریلزم ایک ہے، اِس حدیث میں بھی مونو ریلزم کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح بہت ساری رُوحیں ایک ہی حقیقت میں پروئی ہوئی ہیں، اِس طرح دُنیا اور خلقت بھی، قانون، دین، انسانیت اور اخلاق کی (Unity) میں ایک ہیں اور دین بھی خود ایک ہے، حدود بھی ایک ہیں، پھر خدا خود ایک ہے، تو ہر جگہ پر ایک، ایک، ایک نظر آئے گا۔

حکماء نے ایک سوال کیا ہے، انہوں نے کہا یہ کیسے ہوا کہ خدا جو یکتا تھا واحد تھا اور اُس کی ذات یگانہ تھی تو اُس نے اتنی ساری خلقت کیسے پیدا کر دی؟ حالانکہ قانون یہ ہونا چاہئے کہ گندم سے گندم اُگے اور جَو سے جَو تو پھر وحدت سے یہ کثرت کس طرح پیدا ہوئی؟ اِس طرح وہ سوال کرتے ہیں اور اِس سوال کے سلسلے میں انہوں نے عربی میں ایک بات کہی ہے یا اُن کا ایک قول ہے، وہ قول یہ ہے: لاتلد الوحدۃ اِلّا الوحدۃ، وحدت وحدت کے سوا اور کوئی چیز جنم نہیں دیتی ہے، بہت اچھی بات ہے، وحدت، وحدت کے سوا اور کوئی چیز جنم نہیں دیتی ہے۔ تو وحدت نے کثرت [کو] کس طرح جنم دیا؟ اِس لئے میں نے کہا کہ وحدت نے وحدت کو جنم دیا ہے اور یہ وحدت جو ہم کو نظر آتی ہے وحدت ہی ہے اور یہ جو کثرت ہے وہ حقیقت میں کثرت نہیں ہے۔ تو اِس کے دو نام ہیں، وحدتِ کثرت نما، یہ نمائش میں، دکھاوے میں کثرت لگتی ہے، کثرت نظر آتی ہے لیکن اندر اندر سے یہ وحدت ہے، اِس لئے حکماء کا کہنا صحیح ہے: لاتلد الوحدۃ اِلّا الوحدۃ توحید صرف توحید ہی کو جنم دے سکتی ہے اور قانون نہیں ہے کہ توحید جو ہے، وحدت جو ہے کثرت کو جنم دے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان
دینِ اسلام کا ادیان پر غالب آجانا، حضرت آدمؑ کی شریعت

کیسٹ نمبر: ۱۸۔ بی تاریخ: ۱۹۷۸، کراچی

Click here for Audio

اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ: اَلانسانُ سِرّی وَ اَنا سِرُّہٗ انسان میرا بھید ہے اور میں اُس کا بھید ہوں، اِس بھید کے اندر وہی باتیں ہیں جس کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں یعنی اس بھید میں مونو ریلزم ہے۔ تو اِس میں وہی بھید ہے کہ خلقت جو ہے وہ وحدتِ کثرت نما ہے، اور وحدت نے وحدت ہی کو جنم دیا ہے، یہ کبھی نہیں ہوسکتا ہے کہ وحدت کثرت کو جنم دے اور آگے چل کر کہیں گے کہ جنم ہی نہیں دیا ہے یہ آخر میں کہیں گے۔ اس میں مَیں نے گویا کل کے سبق کی طرف صرف اشارہ کیا کہ آگے چل کر آخر میں کہیں گے کہ جنم کہاں دیا ہے؟ جنم بھی خود ناممکن ہے۔ جب توحید ہے اور وہ سب کچھ ہے تو دُوسرے کے پیدا ہونے کی کیا ضرورت ہے، اُس میں وہ بھی ہے ہم بھی ہیں، اُس میں تو بھی ہے، تم بھی ہے، میں بھی ہوں، ہم بھی ہیں سب کچھ ہے، تو پھر دُوسرے اور تیسرے کے پیدا ہونے کی کیا ضرورت یہ مونو ریلزم ہے، اور اِس کو اعتبارات، ظہورات اور نظر فریبی کہتے ہیں، دُنیا میں آپ کو بہت سی چیزیں ملیں گی جس میں نظر فریبی کی مثالیں ملتی ہیں۔ نظر فریبی کا کیا مطلب؟ نظر کو دھوکا ہو رہا ہے، کسی چیز کو ہم جس طرح سے سمجھ رہے ہیں وہ چیز ایسی نہیں ہے، اِس کی چند مثالیں میں پیش کروں، آسمان پر جو سورج نظر آرہا ہے وہ ایک بٹن کی طرح چھوٹا سا نظر آرہا ہے یا ایک چھوٹی سی گولی یا نور کی ایک گولی کی طرح نظر آرہا ہے۔

حالانکہ یہ بات نہیں ہے، یہ نظر فریبی ہے، ہم سورج کے قریب جا کر دیکھیں تو پتا چلے گا کہ وہ کتنی عظیم دُنیا ہے اور کتنی روشنی کی موجیں اُٹھتی ہیں اور کتنے دھماکے ہوتے ہیں، سورج کو ذرا سمجھیں تو پتا چلے گا اور یہ جو نیلا نیلا آسمان نظر آرہا ہے یہ بھی نظر فریبی ہے، اِس میں نیلا پن کی کوئی بات نہیں ہے، یہ حدِ نظر ہے، ہماری نظر جو ہے، اِس طرح سے پہنچتی ہے ایک جگہ پر جا کر تھک جاتی ہے تو کچھ بھی نہیں دیکھتی ہے۔ نئے چاند میں آپ سوچیں کہ جب ایک دو دن کا ہوتا ہے تو سائڈ میں نیلا نیلا آسمان ہے، حالانکہ سائڈ میں نیلا نیلا آسمان نہیں ہے وہاں پر تو چاند کی باڈی ہونی چاہئے اور چاند کی زمین ہونی چاہئے لیکن ہم دو لاکھ چالیس ہزار (Mile) کی مسافت کو طے کر کے کس طرح چاند کی زمین کو دیکھ سکتے ہیں، نور کو دیکھتے ہیں وہ تو ہمارے استقبال کو آتا ہے، روشنی ہمارے سامنے آتی ہے خود ہماری آنکھوں کو چُھوتی ہے اِس لئے ہم اُس کو پاتے ہیں۔

اُس کی کرنیں ہماری طرف برستی ہیں، تیر کی طرح روشنی آتی ہے،نہیں تو ہماری نگاہ کا جو تیر ہے وہ بہت تھوڑی مسافت تک جاتا ہے، ہماری نظر کی جو کرنیں جاتی ہیں، ہماری نظر کا جو تیر ہے وہ بہت دُور تک نہیں جا سکتا ہے۔ اِس لئے ہم چاند کی زمین کو نہیں دیکھ سکتے ہیں، جب نہیں دیکھ سکتے ہیں تو وہاں پر نیلا نیلا آسمان نظر آتا ہے اور نظر فریبی کی بات کرتا ہوں، بعض دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ آسمان جو ہے وہ ہمارے سامنے زمین کے کناروں پر لگا ہوا ہے، یہ بھی نظر فریبی ہے اور بعض دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب سورج ڈوبتا ہے تو وہ لال لال ہو جاتا ہے، یہ بھی نظر فریبی ہے وہ لال لال نہیں ہوتا ہے، یہ نگاہ کی نارسائی کی بات ہے یا زمین کے دُور جانے کی بات ہے اور ہم پہاڑی علاقوں میں جب جاتے ہیں تو وہاں ہم کو لگتا ہے کہ آسمان جو ہے پہاڑ کی چوٹیوں کے اوپر رکھا ہوا ہے اور اگر اُن چوٹیوں پر جائیں تو آسمان اتنا ہی بلند ہو گا جتنا کہ آبادی سے اور نشیبی علاقوں سے نظر آتا ہے یہ نظر فریبی کی بات ہے۔

جب سورج نکلتا ہے تو ہم کو لگتا ہے کہ زمین کے نیچے سے سورج نکلا، زمین کے نیچے سے ٹھیک ہے، ایک لحاظ سے لیکن یہ بات نہیں ہے وہ تو زمین سے بہت بلند ہے۔ جب ہم یہاں سے آنکھ اُٹھا کے ستاروں کی طرف دیکھتے ہیں تو وہ ہمارے سَر کی طرف، بلندی کی طرف نظر آتے ہیں اور جب ہم چاند پر جا کر دیکھیں گے تو یہ زمین ہمارے سَر پر ہو گی۔ یہ سب نظر فریبی کی باتیں ہیں اور کُلی طور پر جو حقیقت ہے وہ اِس سے مختلف ہے، اِسی طرح دین میں، نظریات میں اور عقائد میں ہر مقامات پر کچھ باتیں ایسی ہیں کہ ہم نے اُن کو جس طرح سے سمجھا ہے وہ ایسی نہیں ہیں، آگے چل کر اُس میں تبدیلی آنے کی ہے۔ تو اِسی طرح ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ عرب والوں کا یا دُنیا والوں کا جس طرح سے محاورہ رہا ہے اور جیسی اُن کی زبان چلی ہے اُس کے مطابق قرآن میں کچھ باتیں ہیں، قرآن میں سورج کے گردش کرنے کے بات ہے، چاند کے گردش کرنے کی بات ہے لیکن علم نے بتایا کہ سورج گردش نہیں کر رہا ہے وہ تو ساکن ہے اور بیشک چاند گردش کر رہا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے اُس زبان کو اختیار کیا جو عربوں کے درمیان رائج تھی لیکن اِس بات کا جاننا علم پر چھوڑ دیا اور خداوندِ تعالیٰ کو اِس چیز کی پرواہ نہیں تھی کہ لوگ آگے چل کر کیا سمجھیں گے، چونکہ خداوندِ عالم تو علم اور حکمت کا مالک ہے تو جاننے والوں نے جان لیا کہ جو زبان مرتّب ہو چکی تھی، جو زبان بنی ہوئی تھی، اُسی [زبان] میں آسمانی کتاب کو نازل ہونا تھا اور اُسی کو استعمال کرنا تھا اور بہشت سے، آسمان سے کسی اور زبان کو لیکر آسمانی کتاب کو نازل نہیں ہونا تھا۔

بہرحال اِن باتوں سے پتا چلتا ہے کہ علم کی کیا اہمیت ہے، حالانکہ کہ خدا کی توحید یا خدا کا جو مسئلہ ہے وہ بہت ضروری بھی ہے اور اہم بھی ہے اور سب دُنیا والے خدا کے مسئلے کو سمجھنے کے لئے لگے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی جو اصل بات ہے وہ اُس سے الگ ہے اور اصل بات کا انکشاف کس طرح سے ہو؟ ہم سوالات اور طرح طرح کے اعتراضات کر کے اُس حقیقت سے حجاب کو اُٹھانے کے لئے کوشش کرتے ہیں اور کسی اعتراض کے بغیر، تنقید کے بغیر لوگوں کا جو عقیدہ ہے

ہمارے سامنے سے ہٹ نہیں سکتا ہے یعنی منطقی دلائل سے اور عقل کی روشنی میں لوگوں کے نظریات کو ہٹا کر ہمیں جو اصلیت وحقیقت ہے اُس کی طرف آگے بڑھنا ہے، تو یہ سب باتیں ہیں جو ضروری ہیں اور ان شاء اللہ آپ کی جو تعلیمات ہیں وہ بہت ہی بنیادی قسم کی ہیں اور بہت انقلابی ہیں اور رفتہ رفتہ اُسی مونو ریلزم کی طرف ہم کو شان رہیں گے اور زمانہ بھی اِسی قسم کا آرہا ہے اور مونو ریلزم سے قریب ایک اصطلاح میں آپ کو بتلاؤں کہ آجکل جو کچھ ہو رہا ہے وہ بنی نوعِ انسان کے مفاد کے مطابق ہو رہا ہے یعنی دنیا کے بہت سے دانشمند یہ کوشش رہے ہیں کہ محدود کام نہ کیا جائے بلکہ ایسا کام ہو کہ وہ ہمہ رس ہو اور دُوسرے لفظ میں اِس مطلب کو یوں ادا کریں کہ انٹرنیشنل کوششیں ہو رہی ہیں یعنی دُنیا چاہتی ہے کہ [وہ] ایک ہو جائے اور آخر دنیا ایک ہو کر رہے گی۔

اُس وقت مذاہب سب ختم ہو جائیں گے مگر ایک مذہب زندہ رہے گا اور وہ بھی کچھ اپنے (Shape) کو بدل کر وہ اسماعیلی مذہب ہو گا۔ میں نے کئی دفعہ آپ سے کہا ہے آپ اِس بات کے گواہ ہیں اور میں نے مثال بھی دی ہے، حدیث بھی بتائی ہے وہ حدیث یہ ہے کہ: ''اِنَّ الْاِسْلَامَ بَدَءَ غَرِیْباً وَسَیَعُوْدُ غَرِیْباً (جامعِ ترمذی، جلدِ دوم باب: ۱۳۷۵) اسلام ایک انوکھے انداز سے ایک غریب مسافر کی طرح سے ظاہر ہوا تھا اور آگے چل کر آخر میں بھی یہ جو مذہب غریب ہو گا'' غریب سے مُراد انوکھا، اجنبی، نرالا۔ جس طرح کہتے ہیں عجیب وغریب، غریب کے دو معنی ہیں ایک تو غریب، بیچارہ، مفلس وغیرہ اور ایک غریب [کے معنی] ایسا کوئی شخص یا ایسی کوئی چیز جس کو لوگ نہیں سمجھ پا رہے ہیں، نہیں پہچان رہے ہیں، تو اسلام جب ظاہر ہوا، اسلام کا جب ظہور ہوا تو وہ غریب تھا کہ اُس کو کوئی نہیں پہچان رہا تھا، رسولؐ پکار پکار کر دعوت کر رہے تھے کہ میں خدا کا نبی ہوں، رسول ہوں اور میں اسلام دین کو لے کر آیا ہوں اور مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ تو اسلام کو کس نے پہچانا؟ اور اسلام سے رُوح شناس کرانے کے لئے پیغمبر نے کتنی کوششیں کیں اور کتنی کامیابی ہوئی؟ کتنے لوگ آگئے؟ بہت تھوڑے۔ اِس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اسلام شروع میں غریب تھا، انوکھا اور اب بھی اگر مانا جائے کہ اسماعیلی مذہب ہی اسلام ہے تو اِس کو کون پہچان رہا ہے، یہ غریب ہے، یعنی انوکھا ہے، نرالا ہے یہ ہیں میرے دوست کے اُس مصرے کے معنی کہ ''سلمان غریبم قلبِ تُو اللہُ مولانا علی'' یہ سلمان شروع میں بھی غریب تھے، سلمان فارسی کو کون جان رہے تھے، میرے علی کو کون جان رہے تھے اور اب جو علی تھے سلمان تھے اُس کو کون پہچان رہے تھے اور علی ہی اسلام تھے۔ اسلام مجسم ہوتا ہے اور شروع میں بھی اسلام مجسم تھا تو پیغمبرؐ اور علی ہی شروع میں پیکرِ اسلام تھے، تو اُن کو کون پہچانتے تھے بہت تھوڑے لوگ اور اب بھی سلطان کو اور میرے سلمان کو کریم کو کون پہچانتے ہیں؟ جو اسلامِ مجسم ہیں یہ انوکھے ہیں اور نرالے ہیں، اُن کو کوئی نہیں پہچانتا، یہی وجہ ہے جو رسولؐ نے فرمایا تھا کہ ''اسلام شروع میں غریب تھا اور آگے چل کر بھی غریب ہو جائے گا''۔

اب رفتہ رفتہ اسماعیلی مذہب اسلام میں سے، اسلام کے باطن میں سے اُبھرا اور کچھ آگے چل کر اِس میں اور جدّت آئے گی، اِس میں نیا پن آئے گا، یہ نرالا ہو جائے گا تو اُس وقت یہی رہے گا اور اِس کی حیثیت انٹرنیشنل ہو جائے گی اور وہ زمانہ امامؑ کے رُوحانی ظہور کا زمانہ کہلائے گا اور وہ زمانہ اسلام کے غالب ہونے کا زمانہ ہوگا۔ جس کے لئے قرآن نے وعدہ کیا ہے کہ اسلام دین اِس لئے بھیجا گیا ہے اور رسولؐ اِس لئے ہدایت لے کر آیا ہے کہ اسلام دُنیا کے تمام ادیان پر غالب آئے گا، تو اُس میں سائنس کام کرے گی، علم کام کرے گا اور دُنیا کی ساری کوششیں بارآور ثابت ہو جائیں گی اور خلاصے کے طور پر نتیجے کے طور پر خدا کا جو مقصد ہے وہ پورا ہو جائے گا، سب انسانیت مل جائے گی۔ قرآن میں ہے کہ: طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُون (۳:۸۳)۔ خوشی سے یا مجبوری سے [سب] اُس کی طرف لوٹ جانے والے ہیں کوئی تو خوشی سے جائے گا کوئی مجبوری سے جائے گا، جائے گا تو ضرور لیکن جو خوشی سے جائے گا تو وہ راحت کے ساتھ جائے گا اور کامیابی کے ساتھ جائے گا اور اُمیدیں لے کر جائے گا اور جو مجبوری سے جائے گا بادلِ نخواستہ جائے گا، ایک وقت تک اُس کو اچھا نہیں لگے گا اور درمیان میں اُسے تکلیف ہوگی، تو وہ تکلیف جہنم ہے اور یہ اُمید بہشت ہے تو یہ ہے نظر فریبی کی وضاحت اور یہ ہیں خدا کے بھید اور یہ ہے مونو ریلزم اور یہ ہے اسلام دین کا دُوسرے ادیان پر غالب ہو جانا۔

آپ نے کسی (Student) کی طرف سے یہ سوال کیا کہ اگر یہ دُنیا اور اِس کی آبادی آدمؑ سے پہلے سے ہے تو آدمؑ کے زمانے میں اِس طرح کی شریعت کیوں تھی کہ جس میں لوگوں کے نہ ہونے کی مجبوری پر بھائی اپنی بہن سے شادی کرتا تھا وغیرہ، تو یہ آپ نے سوال کیا۔ اِس کا جواب اِس طرح سے ہے کہ میں اِس کے جواب دینے سے پہلے سوال کے اندر ایک سوال اُٹھاؤں گا وہ یہ کہ اگر مانا جائے کہ آدمؑ ایک اکیلے تھے اور اُس کے زمانے میں دُوسرے لوگ نہیں تھے تو آج ظاہر ہے کہ دُنیا کے اندر جو برِّ اعظم ہیں اور اُن تمام برِّ اعظموں میں برابر برابر کی آبادی ہے یعنی ہم نہیں کہہ سکتے ہیں کہ آدم کسی ایک برِ اعظم میں آیا اور انسانیت یہیں سے دُنیا کے مختلف برِّ اعظموں میں چلی گئی، ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں ۔ اِس لئے کہ کشتی کی جو بات ہے وہ کل کی بات ہے، جہاز جو بنا ہے، (Ship) وغیرہ وہ تو کل کی بات ہے اور (Aeroplane) وغیرہ بھی بہت آخر میں پیدا کئے گئے ہیں تو پھر اِن تمام برِّ اعظموں میں کس طرح سے انسانیت پھیلی جب کہ ہم یہ تسلیم نہ کریں کہ جو بھی آدمؑ دُنیا میں آئے نام کچھ بھی ہو وہ اِس سیّارۂ زمین کے مختلف برِّ اعظموں میں اُترے تو وہاں سے آبادی شروع ہوئی وغیرہ۔ اگر ہم یہ تصوّر نہ رکھیں تو پھر کس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہی آدمؑ سے اتنی دُنیا کے اندر آبادی پھیلی، اِس لئے کہ سمندر کی وجہ سے ایک برِّ اعظم سے دُوسرے برِّ اعظم میں جانا بہت مشکل بات تھی، ایک تو یہ دلیل اور یہ سوال ہے۔

دُوسری دلیل یہ ہے کہ جس آیت میں آدمؑ کے بہشت سے دُنیا میں آنے کا ذکر کیا گیا ہے، اس آیت میں ایک سے

زیادہ کے نازل ہونے کا قصّہ ہے وہ لفظ ہے اهْبِطوا مِنْهَا جَمِيعاً (۲:۳۸) تم اِس میں سے، جنّت میں سے، سب کے سب نیچے اُترو۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر آدمؑ کے زمانے میں دُوسرے لوگ نہیں ہوتے تو آدمؑ پیغمبر کس طرح کہلائے، نبی کیسے ہوئے۔ اپنی فیملی میں پیغمبر ہونے کا کوئی تصوّر ہی نہیں ہے کہ کوئی شخص صرف اپنی بیوی اور بچوں پر پیغمبر مقرر ہو جائے۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ آدم صفی ہے، برگزیدہ ہے، منتخب ہے اور ایک شخص منتخب نہیں کہلا سکتا جب تک کہ بہت سے لوگوں میں اُس کو چُنا نہیں جائے۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ ابلیس کے بارے میں کہا گیا کہ جب اُس نے سجدہ نہیں کیا تو خدا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ (۲:۳۴)۔ اور ابلیس جو ہے وہ کافروں میں سے تھا تو اگر مانا جائے کہ اُس وقت صرف آدمؑ تھے اور ابلیس تھا اور ملائکہ تھے تو پھر کافر کہاں تھے؟ جس کی وجہ سے کہا گیا کہ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ (۲:۳۴) وہ کافروں میں سے تھا یا وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ کوئی تصوّر جب وجود میں نہیں آتا ہے تو کس طرح قابلِ ذکر ہو سکتا ہے اِس کے علاوہ بھی بہت سی دلیلیں ہیں۔

بہر حال اب رہا آپ کا سوال کہ اُس وقت اگر لوگوں کی کثرت ہوتی تو بھائی اپنی بہن سے شادی نہیں کرتا۔ تو یہ قصّہ براہِ راست قرآن میں نہیں ہے یہ روایت اور کہانی کے طور پر ہے اس لئے یہ قصّہ کسی قدر کمزور ہے اور اگر ہم اِس کو مان بھی لیں تو اِس کی وجہ شریعت ہو سکتی ہے کہ آج جو چیز ہمیں حرام کر دی گئی ہے اُس کے متعلّق ہمارا عقیدہ اتنا مضبوط ہو چکا ہے کہ اگر یہ حرام چیز کسی زمانے میں دُوسرے لوگوں کے لئے حلال ہوتی یا کبھی حلال ہوئی ہو تو ہم اُس کو باور ہی نہیں کرتے ہیں۔ یہ ہمارے عقیدے کی پختگی کی وجہ سے ہے، تو مثلاً آج جو گدھا حرام ہے یعنی اُس کا گوشت کھانا حرام ہے یہی گدھا جنگِ خیبر سے پہلے حلال تھا۔ ہم کو تعجّب ہوتا ہے کہ کبھی گدھا حلال بھی ہو سکتا ہے تو یہ بات بھی ایسی ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ بات صرف کہانی ہو کہ بھائی بہن سے شادی کرتا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو، لوگوں کی کثرت کے باوجود ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی مصلحت کی بِنا پر قریب سے شادی جائز ہو۔

بہر حال جب یہ قرآنی دلیل نہیں ہے اور عقلی طور پر بھی اِس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو کہ کسی بھی شریعت میں نہ ہو، تو شریعت ہمیشہ تبدیل ہوتی آئی ہے اور ہاں ایک نکتہ یہ بھی ہے جو کہا جاتا ہے کہ شادی کے معاملے میں آدمؑ کے دو بیٹوں کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ یہ بات صحیح نہیں ہے، جھگڑے کی وجہ کچھ اور تھی، حضرت آدمؑ نے ہابیلؑ کو اپنا جانشین قرار دیا تھا، امامت کے لئے اُس کو منتخب کیا تھا اور امامت اس کو مل بھی چکی تھی۔ جب قابیل کو پتا چلا کہ ہابیلؑ کو امام بنایا گیا ہے تو قابیل نے قصد کیا اور اُس کو قتل کیا۔ جب ہابیلؑ اِس طرح سے شہید ہو گئے جو اساس تھے یعنی پیغمبر کے جانشین تو بجائے اِس

کے کہ وہ امامت قابیل کو ملے تو وہ لَوٹ کر شیثؑ کو ملی اور مولانا شیثؑ مولانا ہابیلؑ کے جانشین ہوئے، اصل معاملہ یہ تھا، آج آپ معتبر اثنا عشری اور اسماعیلی کتب میں دیکھیں، تو پھر اِس سے بھی وہ قصّہ کمزور ہوگیا جو بیان کرتے ہیں کہ یہ اسرائیلیات میں سے ہے، آج کل اسرائیلیات کے اکثر عقائد مسلمانوں میں اِس لئے بدنام ہیں کہ وہ غلط ہیں اور بائبل جو حضرت عیسیٰ کے کتنے برس بعد لکھی گئی ہے اور روایت کے طور پر سوانحِ حیات کے طور پر قصّہ کے طور پر لکھی گئی ہے اور براہِ راست خدا کا خطاب نہیں ہے، جس طرح کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔

ایک زمانے میں بنگال سے ایک جوان مولوی آیا تھا اور اصل میں اُس نے ڈاڑھی اور مونچھیں سب منڈوائیں تھیں اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے شاید اپنے مذہب کے کچھ علماء سے کچھ سوالات کئے تھے تو اُن علماء نے اُس کو اُن سوالات کے سلسلے میں کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اِس نے اپنے مذہب سے بیزاری کی اور مذہب کو چھوڑا پھر عیسائی مذہب میں چلا گیا اور تلاش کرتے، کرتے، کرتے، کرتے اُس کے پاس کچھ سوالات تھے تو کوئی شخص اُس کے سوالات کے لئے تسلی بخش جوابات نہیں دے سکتا تھا اور آخرکار پوچھتے پوچھتے یہاں آیا کراچی میں۔ میرے دوستوں سے اُس کی ملاقات ہوئی ہوگی تو کسی دوست نے بتایا کہ یہاں پر بھی ایک شخص ہے جو عالم ہے کوئی شاہ وغیرہ معلوم نہیں کن الفاظ میں انہوں نے کہا، نامعلوم کس طرح سے اُس میں شوق پیدا ہوگیا وہ مجھ سے ملنے کے لئے تقاضا کرتا رہا اور پھر میرے ساتھ اُس کی ملاقات ہوئی اور ہماری ملاقات وہاں اسماعیلیہ ایسوسی ایشن کے لان میں ہوئی، اُس وقت میں اسماعیلیہ ایسوسی ایشن میں کام کرتا تھا، تو اس زمانے میں اپنے جانِ عزیز فقیر صاحب بھی کراچی میں رہتے تھے اور اُن سوالات میں سے جو اُس کے پاس تھے ایک سوال یہ تھا اور وہ آپ کا یہی سوال تھا کہ: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْن (۹:۱۵)۔ قرآن کو ہم ہی نے نازل کیا ہے اور اُس کے محافظ ونگہبان ہم ہی ہیں۔ اِس آیت کے معنی جس طرح سے عام طور پر یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت ونگہداشت کی ضمانت لی ہے، لہٰذا اِس میں نہ تو کوئی اختلاف آسکتا ہے اور نہ کبھی قرآن دُنیا سے اُٹھایا جاسکتا ہے، وغیرہ۔ خصوصاً قرآن کے اندر کسی قسم کے اختلاف اور کسی قسم کی تحریف، تبدیلی، ترمیم وغیرہ نہ آنے کے سلسلے میں اِس کو استعمال کرتے ہیں، ظاہری طور پر کچھ بھی ہو لیکن اِس آیت کے معنی کچھ اور ہیں تو جب اُس نے یہ روایت پیش کی تو میں نے ان کو بتایا اور پوچھا کہ گورنمنٹ اگر اپنے کسی ادارے سے یا کسی آفس سے ایک (Circular Issue) کرتی ہے تو اُس کا ریکارڈ اور اُس کی کاپی آفس میں ہوتی ہے یا نہیں؟ اُس نے کہا ہاں! کاپی ہوتی ہے، ریکارڈ ہوتا ہے، اچھا! اور میں نے کہا کہ آپ کچھ خط لکھتے ہیں یا کچھ کہتے ہیں تو اِس کا (Source) آپ کے ذہن میں، دل ودماغ میں ہوتا ہے یا نہیں؟ [کہا] بات تو ٹھیک ہے ہوتا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ کتاب یعنی قرآن لوحِ محفوظ سے نازل ہوئی ہے یا نہیں؟ اُس نے کہا ہاں! لوحِ محفوظ سے قرآن نازل ہوا ہے، میں نے کہا کہ لوحِ محفوظ پر اب بھی قرآن کا ریکارڈ باقی ہے یا سب

وہاں سے قرآن نازل ہوگیا؟ اُس نے کہا کہ لوحِ محفوظ میں اُس کا ریکارڈ باقی ہے، تو میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم نے قرآن کو، ذکر کو نازل کیا ہے، قرآن کا دوسرا نام ذکر بھی ہے تو ہم ہی اِس کے محافظ ہیں۔ اُس [یعنی خدا] کو کوئی پرواہ نہیں ہے کہ آسمانی کتاب پر اگر کوئی کیفیت گزرتی ہے، اگر اس میں کوئی تحریف ہوتی ہے، تو خدا کو کوئی پرواہ نہیں ہے، اِس کی مثال توریت ہے، اِس کی مثال انجیل ہے اور سابقہ کتب میں جو کچھ ہوا ہے۔

اگر قرآن کی حفاظت کی دلیل خدا کا محافظ ہونا ہے تو خدا پہلے بھی محافظ تھے، کیا خدا میں یہ صفت ابھی پیدا ہوئی ہے یا کہ [یہ] ہمیشہ سے ہے؟ اگر ہمیشہ سے ہے تو خدا کو چاہئے کہ اپنے محافظ ہونے کے ثبوت کو بھی قائم رکھیں، قرآن کے علاوہ انجیل، تورات تو پھر اس کی بھی حفاظت کریں۔ خدا محافظ تھا تو وہ لوگوں سے گلہ کیوں کرتا ہے کہ اہلِ کتاب نے اُس میں تبدیلیاں کی ہیں، اِس سے ظاہر ہے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ اپنے اوصاف بیان کرتا ہے، اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے پاس جو اُمُّ الکتاب ہے، جسے لوحِ محفوظ کہیں یا اُمُّ الکتاب کہیں یا رُوحانیت کہیں، تو اس میں جو قرآن کی حیثیت ہے وہ کبھی مٹنے والی نہیں ہے، وہ تو قائم ہی رہے گا۔ جس طرح دنیوی لحاظ سے کوئی گورنمنٹ اپنی آفس سے، ادارے سے کسی (Circular) کو، کسی (Letter) کو جاری کرتی ہے تو اُس کا ریکارڈ اس کے پاس ہونا چاہئے، تو یہی بات ہے۔ تو وہ سمجھ گیا اور اِس سے وہ بہت خوش ہوگیا اور اُس نے کہا کہ میں تسلیم کرتا ہوں آپ مجھے اسماعیلی بنائیں، وغیرہ وغیرہ۔

تو میں نے اُسے اسماعیلی بنانے کے لئے کوشش بھی کی لیکن اُوپر کی طرف سے منظوری نہیں ہو رہی تھی، کچھ عرصے کے بعد انقلاب آیا مثلاً ڈھاکہ وغیرہ کا سُکوت ہوگیا، پاکستان سے، ویسٹ پاکستان سے وہ الگ ہوگیا اور اُس مولوی کا پتہ نہیں چلا۔ تو یہی سوال وہاں پر بھی تھا اور باقی رہا قرآن میں سے کسی چیز کی کمی کی بات تو اصل میں [اس] بات کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں، ابھی بھی، مثلاً ترتیبِ نزول میں ردّ و بدل، علامتوں میں اضافے اور قرأت میں تبدیلی اور اِس قسم کی چھوٹی موٹی مثالیں اِس موجودہ وقت میں بھی مل سکتی ہیں۔ لیکن یہاں پر ایک بات ہے، ہمیں زیادہ اِس پر زور نہیں دینا چاہئے کیونکہ اِس میں ایک بات ہے، وہ یہ کہ اگر ثابت ہو جائے کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے یعنی اُس میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے، اُس حالت میں ہمارا نظریہ کیا ہوگا، ایک سوال یہ ہے اور اِس کے برعکس یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن بالکل ہمارے اِس الزام یا اِس تنقید کے برعکس قرآن بالکل صحیح ہے جس طرح کہ عوام کا کہنا ہے کہ اِس میں نہ کسی زبر کی کمی ہے نہ بیشی تو کیا اُس وقت ہم قرآنِ صامت کو لیں گے اور قرآنِ ناطق کو چھوڑیں گے یا ہر حالت میں ہم دونوں کو مان لیں گے ایک کو تو کتاب قرار دیں گے اور دُوسرے کو نور۔ ہمارے نظریے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، جب کسی بھی حالت میں ہمارے عقیدے میں تبدیلی نہیں آنی چاہئے تو اُس وقت میرے خیال میں یہ بحث بے سود ہے۔

نامعلوم میں آپ کو اچھی طرح سے وضاحت کر سکا یا نہیں، اِس لئے میں (Repeat) بھی کرتا ہوں کہ اگر معلوم ہو

جائے کہ قرآن میں کوئی کمی نہیں ہے تو کیا اِس وقت ہم قرآن کی طرف زیادہ توجہ دینگے اور امامؑ سے اپنی توجہ کو ہٹائیں گے۔ میں یہ سوال اُن لوگوں سے کرتا ہوں جو ہمیشہ اِس سوال پر زور لگانا چاہتے ہیں کہ قرآن میں کمی ہے اور بجائے چالیس پاروں کے اِس میں تیس پارے ہیں یا اُن اثنا عشری بھائیوں سے کہتا ہوں جن کا یہ عقیدہ ہے۔ میرے خیال میں یا تو یہ قرآن کی حقیقتوں کے جاننے سے گُریز کرنے کا ایک بہانہ ہے یا اِس کا مقصد یہ ہے کہ اگر معلوم ہو جائے کہ قرآن بالکل دُرست ہے اور بالکل اِس میں کوئی بھی فرق نہیں ہے تو اُس وقت ہم قرآن کے متعلّق جو عقیدہ رکھتے ہیں اُس میں اضافہ کریں گے، اُس پر زیادہ زور دیں گے۔ اِس میں کوئی بات نہیں ہے، لہٰذا اِس بحث سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا ہے بلکہ اِس میں تھوڑا سا نقصان ہے، بلکہ زیادہ نقصان ہے وہ یہ کہ اِس تعلیم نے بہت سے افراد کو سُست بنا دیا ہے، قرآن کی تعلیم سے بے نیاز کر دیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہئے، ہونا یہ چاہئے کہ ہم امامؑ کے ساتھ ساتھ قرآن کو بھی سمجھیں، اِس سے زیادہ فائدہ ہوگا، چونکہ ہمارے پاس دو چیزیں ہیں امام اور قرآن، امامؑ کے معجزات کا پتا اُس وقت چلے گا جب کہ ہم امامؑ کی روشنی میں قرآن کی حقیقتوں کو پائیں۔ کچھ تو ہونا چاہئے، آنحضرتؐ کی نشانیاں ہونی چاہیں، آسمانی کتاب سامنے ہونی چاہئے، مطلب یہ ہے کہ اگر آسمان سے ایک ایسی بے مثال کتاب حاصل کرنا آنحضرتؐ کا معجزہ ہے، تو اِس کتاب کی حکمتوں کو جاننا امام کا معجزہ ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام کا ایک بنیادی معجزہ قرآن پر قائم ہے۔ ہم اگر دُوسروں کو یہ جتلائیں کہ ہم اِس طرح سے قرآن جانتے ہیں، قرآن کے یہ یہ بھید ہم سمجھ سکتے ہیں تو یہ امام کا معجزہ ہے اور یہ امام کے معجزے کا ثبوت ہے، لہٰذا اِس نظریے سے ہمارا اپنا نقصان ہوگا کہ [اگر] ہم قرآن سے توجہ ہٹائیں۔ تو ویسے تو درست ہے کہ کچھ اِس میں کمی رہی ہے، یہاں تک کہ کچھ سنّی علماء کا بھی کہنا ہے کہ آیۂ رُجم یعنی سنگسار کرنے سے متعلّق جو آیت تھی وہ اس میں جمع نہیں ہوئی ہے، حالانکہ وہ آیت تھی۔ تو کتابِ وجہ دین میں ہے کہ امام محمد باقرؑ نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ الاَحَد پڑھا ہے (کتاب وجہ دین، ص: ۱۴۵) اور ہونا بھی ایسا چاہئے جو سورۂ اخلاص میں ہے، اور حالانکہ لکھا ہوا ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد (۱:۱۱۲) اور ایک الف لام کی اس میں کمی ہے۔

یعنی خود سنّی حضرات کے اندر سات قسم کی قرأت ہے۔ اُس میں سے کسی ایک پر زور دیتے ہیں اور ویسے بحث کرنے میں اُن سات کا ذکر کرتے ہیں، سات قسم کی قرأت کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ کو لیں، کچھ تو کہتے ہیں ضراط کچھ تو کہتے ہیں صراط، کچھ تو س سے پڑھتے ہیں، کچھ ص سے پڑھتے ہیں، کچھ ض سے پڑھتے ہیں اور اِسی طرح اس سورہ کے اندر کچھ مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْن کہتے ہیں، ان قاریوں میں سے، کچھ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْن کہتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ اِس سورۃ الفاتحہ میں جو کہ ایسی سورت ہے جو روزانہ پانچ مرتبہ پڑھی جاتی تھی رسول اللہؐ کے زمانے میں، اور رسول اللہؐ کے زمانے سے لے کر قرآن کے جمع کرنے کے زمانے تک کتنا وقت گزرا، بہت تھوڑا وقت گزرا تو ایسے بہت سے لوگ تھے جنہوں نے اپنے کانوں سے سُنا تھا کہ آنحضرتؐ کس طرح سے اس کی قرأت کرتے ہیں، ملک کہتے ہیں یا مالک کہتے ہیں، صراط

کہتے ہیں یا ضراط کہتے ہیں۔ اِس کی کیا وجہ ہے یہ اختلاف کہاں سے پیدا ہوگیا؟ جب سورۃ الفاتحہ جیسی مشہور سورہ میں یہ اختلاف پیدا ہوگیا تو ہوسکتا ہے کہ اِس کے علاوہ بھی ایسی بہت سی چیزیں ہوں۔

آپ نے قرآن پڑھا ہے، آپ نے دیکھا ہے کہ بعض دفعہ دو علامتیں ہیں، بعض دفعہ تین علامتیں ہیں، جو دو علامتیں ہیں اُس کی وجہ ہے کہ کچھ علماء نے علامتیں مقرّر کیں، تو کچھ زمانے کے بعد دُوسرے علماء نے وہاں انکشاف کرتے ہوئے دُوسری علامت لگائی اور تیسرے طبقے کے علماء نے ایک تیسری علامت لگائی، اُن سے یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ اگلی علامتوں کو مٹائیں، بلکہ اگلی علامتوں کے اُوپر اور اُس کے اُوپر تین دفعہ انہوں نے علامتیں لگائیں۔ اب کہتے ہیں کہ سب سے اوپر جو علامت ہے اس کا اتباع رکھا جائے، اُس کے مطابق پڑھا جائے، تو یہ علامت کے اوپر علامت اور علامت کے اوپر علامت، یہ بھی ایک اختلاف ہے اور سورتوں کی ترتیبِ نزول اب وہ آگے پیچھے ہے۔

تو اِن تمام باتوں سے پتا چلتا ہے کہ اِس میں کچھ باریکیاں ہیں لیکن اِس کے باوجود ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ ہم قرآن کو سمجھیں، جو کچھ بھی ہے اُس کو قرآن ہی مانیں، قرآن تسلیم کریں، نہیں تو لوگ سمجھیں گے کہ ہم قرآن سے انکار کررہے ہیں اور نہیں تو لوگ سمجھیں گے کہ ہم قرآن کے معاملے میں کمزور ہیں۔ حالانکہ قرآن اہلِ بیت کے گھر میں نازل ہوا اور اہلِ بیت کو ہم مان رہے ہیں اور ہمارے درمیان اہلِ بیت ہیں یعنی امام اور قرآن سے جو ہماری نسبت ہے وہ زیادہ ہے، اِس لئے ہم کو زیادہ سے زیادہ قرآن جاننا چاہئے، چونکہ امام معلمِ قرآن ہے، چونکہ امامؑ نورِ قرآن ہے، چونکہ امام قرآنِ ناطق ہے اِس لئے ہمیں قرآن کے بھید زیادہ سے زیادہ معلوم ہونے چاہئیں۔ قرآن کی کلیدیں ہمارے پاس ہیں، قرآن کے خزانوں کی کلیدیں، قرآن کی حکمت سے ہم زیادہ قریب ہیں، قرآن کی رُوحانیت کو ہم جانتے ہیں تو بہرحال ہمیں قرآن سمجھنا چاہئے، اُس کو پڑھنا چاہئے اور کبھی بھی اِس سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے، اُس سے ہماری کوشش کم نہ ہو، تو جماعتی طور پر اور ذاتی طور پر اِس میں زیادہ فوائد ہیں۔

<u>آپ کا سوال ہے کہ عبادت بندگی اور دیگر دینی معاملات میں جس طرح آج ہم اپنی بہنوں کے ساتھ مل کر اور جس طرح مرد عورت ایک ساتھ دین کے کام [کو] انجام دیتے ہیں اور عبادت بندگی میں بھی یکجا ہوجاتے ہیں تو اِس کے بارے میں آپ نے سوال کیا کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں کیا ایسا تھا؟</u>

تو دیکھئے! رسول اللہ کے زمانے میں، خواتین ہوتی تھیں، البتہ مسجد دو حصّوں میں کسی طرح سے (Divide) نہیں ہوتی تھی اور (Divide) اگر ہوتی تھی تو وہ اِس طرح سے ہوتی تھی کہ پچھلی صفیں اکثر عورتوں کے لئے رکھا کرتے تھے تو یہ بھی اِس طرح سے ایک (Division) تھی جس طرح سے آج ہم جماعت خانہ کے اندر ایک طرف بہنوں کو رکھتے ہیں اور ایک طرف خود بیٹھتے ہیں لیکن اُس زمانے میں، خواتین پیچھے بیٹھا کرتی تھیں اور مل کر عبادت بندگی کرتی تھیں۔ اِس کے

علاوہ جنگوں میں بھی تواریخ آپ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا، کہ خواتین مشکیزے اُٹھا اُٹھا کر زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں اور تیمارداری کرتی تھیں یعنی (Sister) اور (Nurse) وغیرہ کی خدمت انجام دیتی تھیں، لیکن بعد کے ایک زمانے میں عورتوں کو الگ کیا گیا یہ صورتِ حال ہے، لہٰذا یہ دُرست ہے کہ مرد کے دوش بدوش خواتین بھی کام کریں، خصوصاً دین کے معاملے میں، علم کے معاملے میں، جب آپ اُن حدیثوں کو لیں گے جو علم سے متعلّق ہیں تو آپ دیکھنے لگیں گے کہ مرد کے ساتھ ساتھ عورت پر بھی علم فرض کیا گیا ہے۔ طَلَبُ العِلمِ فَرِیضَۃٌ عَلیٰ کُلِ مُسلِمٍ وَمُسلِمَۃٍ اب اگر اِس ارشادِ نبوی کے مطابق عمل کیا گیا اور مرد کے ساتھ ساتھ عورت نے بھی علم کو حاصل کیا تو اِس علم سے آپ کیا مُراد لیں گے۔ علم سے مُراد قرآن، علم سے مُراد حدیث، جب عورت نے علم حاصل کیا تو پھر اِس میں کیا فرق و تمیز رہا، تو اب دونوں ہی علم کا کام انجام دیں گے اور دونوں ہی پڑھائیں گے، دونوں ہی سکھائیں گے، دونوں ہی واعظ کریں گے، دونوں ہی دین کو مضبوط کریں گے اور اِس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں، جس سے کہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں خواتین کو بھی بہت اعلیٰ مقام دیا گیا ہے اور اُن سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر کام کریں خصوصاً عبادت و بندگی میں۔

آج اگر مسلمان الگ الگ ہیں یا مسلمان دُوسری قوموں کے مقابلے میں کمزور ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اُس کی یہی وجہ ہے کہ دُوسرے لوگوں میں جہاں مرد عورت نے مل کر کام کیا، علم میں سائنس میں ترقی کی، اُس مقام پر مسلمان ہٹ کر بیٹھے اور اُن چیزوں سے الگ ہو گئے، کہنے لگے کہ یہ کام کرنے کے نہیں ہیں، حالانکہ قرآن میں علم کے لئے، ہنر کے لئے، اور سائنس کی ترقی کے لئے فرمایا گیا ہے، وہ آیت جس میں فرمایا گیا ہے کہ تم اپنے مضبوط گھوڑوں کو تیار رکھو تا کہ تمہارا دشمن مرغوب ہو جائے (۸:۶۰)۔ تو اِن گھوڑوں سے مراد یہی چیزیں ہیں، یہی اسلحۂ جنگ ہیں جن سے دُنیا کی بڑی بڑی قومیں لڑنے کو تیار ہیں اور جن کے بنانے سے اور جن کے رکھنے سے وہ طاقتور اور ترقی یافتہ قومیں کہلاتی ہیں، تو اگر خدا کے اِس ارشاد کے مطابق اس آیت سے یہ اسلحہ اور سامانِ جنگ مراد لیتے ہوئے اِن تمام چیزوں کو ہم بنا کر رکھتے تو اِس سے پہلے ہم کو سائنس کی تلاش ہوتی اور مرد عورت کو اُن لوگوں کے مقابلے میں بلکہ اُن سے بڑھ کر کام کرنا پڑتا جس طرح انہوں نے کیا۔ اِس سے لازم نہیں آتا ہے کہ عورتیں گھروں کی چار دیواریوں میں محدود بیٹھیں، اِس سے دُنیا والوں کے ساتھ کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں، کس طرح اِن آیات پر عمل کرتے ہوئے دُنیا والوں سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ تو ہوشمند کو دانا کو [سوچنا چاہیے] ظاہر ہے وہ جانتا ہے کہ ہمارا جو طریق ہے، جو ہمارا مذہب ہے وہ صحیح ہے وہ صراطِ مستقیم ہے، صراطِ مستقیم ترقّی کا مذہب ہے اور اگر صراطِ مستقیم جو ترقی کا مذہب ہے، اِس پہ سب مسلمان مل کر چلتے، خدا کی رسّی جو امامؑ ہے [اس کو] مضبوطی سے پکڑتے تو یہ کبھی بھی دُوسروں سے پیچھے نہیں رہتے اور اگر وہی رفتار باقّی اور جاری رہتی جو رسول اللہؐ کے زمانے میں ترقّی کی رفتار تھی تو اب تک دُنیا کی بڑی بڑی قومیں مسلمانوں سے بہت پیچھے رہ جاتیں اور مسلمان بہت آگے بڑھتے اور

مسلمان ایسی مضبوط قوم بنتے جوکہ پوری دُنیا کی حکومت کر سکتے یا نہیں تو کم سے کم امریکہ جیسی قوم، رشیا جیسی قوم، چائنا جیسی قوم، فرانس اور برطانیہ جیسی قوم [ہوتی] آج آپ دیکھیں! سوچیں! کن کی غلطی ہے، کیا سبب ہے؟ جس طرح سے اسلام کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور ایک فرقہ دُوسرے فرقے کے خون کا پیاسا ہے، تو یہ نظریات میں اختلاف اور رسول اللہؐ کی حقیقی اطاعت نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

Click here for Audio

عنوان: فرمان فہمی کی اہمیت

کیسٹ نمبر: ۱۹ تاریخ: ۱۹۷۸ء، کراچی

استادِ بزرگوار نے پیر شاہ کی تسبیح سے آغاز فرمایا۔

پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! (۲۰ مرتبہ تقریباً) ہم کو شاہ نے بہت کچھ دیا ہے اور پیر نے بہت کچھ دیا ہے!

پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! (۱۸ مرتبہ تقریباً) ہم شاہ اور پیر کے پرستار ہیں!

پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! (۱۲ مرتبہ تقریباً) ہم شاہ اور پیر کے پروانے ہیں!

پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! (۱۲ مرتبہ تقریباً) ہم اپنے شاہ اور پیر کے غلام ہیں!

پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! (۱۹ مرتبہ تقریباً) ہم اپنے شاہ اور پیر سے قربان جائیں!

پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! (۴۳ مرتبہ تقریباً) عاشقانہ انداز سے بولا کریں!

پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! پیر شاہ! (۵۰ مرتبہ تقریباً)

عزیزانِ من! اب دل میں یہ حرارت پیدا کرنے کے بعد علم کی کچھ باتیں بتلانے کے لئے کوشش کریں گے اور آج میری خواہش ہے کہ فرمانِ مقدّس کے سلسلے میں کچھ اہم باتیں بتا دی جائیں۔ فرمانِ مبارک کے سلسلے میں اہم باتیں اِس لئے بتانی ہیں کہ بعض دفعہ آپ نے دیکھا ہے کہ ہماری جماعتوں کو اِس سلسلے میں اُلجھن ہو جاتی ہے، جبکہ اُن کو پاک فرمان کے اندر کئی قسم کی باتیں ملتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہی ایک بات ہے اور جس بات کو وہ اپنے سامنے رکھتے ہیں اُس کے مقابلے میں دُوسری بات بھی ملتی ہے اور اُن دونوں باتوں کے درمیان اُن کے نزدیک کچھ تضاد کچھ اختلاف نظر آتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں فرمان میں نہ تو کوئی تضاد ہے اور نہ اختلاف۔ لیکن کیا وجہ ہے جو اُن کے نزدیک، اُن کے خیال کے مطابق ایک فرمان کا دُوسرے فرمان کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے، تو میں اِس سلسلے میں عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک یہ بات بہت ہی ضروری ہے اور میں نے سوچا ہے کہ یہ بات بہت ہی اہم ہے جو بتلا دی جائے اور بہت ہی اُصول کی بات ہے، وہ یہ کہ امامؑ کے فرامین شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت پر مشتمل ہوتے ہیں یا یوں کہنا چاہئے کہ امامؑ کے سامنے جتنے مُرید ہیں اور جتنے اسماعیلیوں کو ہدایت دینی چاہئے وہ ایک جیسے نہیں ہیں، علمی طور پر، ذہنی طور پر، ترقّی کے لحاظ سے، سمجھ کے لحاظ سے اُن کے مختلف طبقات ہیں لہٰذا

امامؑ اُن مختلف ذہنیتوں کے افراد کو مختلف درجات کی تعلیم دے دیا کرتا ہے۔ جس طرح کوئی اسکول ہے، کالج اور یونیورسٹی ہے تو سب (Students) ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں [اسی طرح] دین کی مثال بھی مکتب ہی کی طرح ہے۔ کچھ اُس میں بچے ہیں اور کچھ جوان ہیں اور کچھ بڑی عمر کے افراد بھی ہیں جو تجربہ کار ہیں، جو سمجھدار ہیں، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ سب کو ایک قسم کی تعلیم دے دی جائے، یہ ممکن نہیں ہے۔ اِس لئے امام زمان مختلف مواقع پر جماعتوں کو سامنے رکھتے ہوئے، وقت کے تقاضے کے مطابق اور جیسے جیسے مسائل سامنے آتے ہیں اُن کے مطابق فرامین فرماتے ہیں۔

امام کو اِس بات کی فکر نہیں ہے کہ کل اگر اُس نے کچھ فرمان فرمایا ہو اور آج اُس سے مختلف کوئی فرمان کیا گیا۔ تو اِس میں امامؑ کے لئے کوئی فکر کی بات نہیں ہے کیونکہ جو کل کا فرمان تھا اُس کا اپنا ایک مقام تھا اور جو آج کا فرمان ہے اِس کا اپنا ایک مقام ہے اور اگر اُس فرمان میں اور اِس فرمان میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے یا بظاہر تضاد نظر آتا ہے تو حقیقت میں وہ تضاد نہیں ہے بلکہ وہ جو کل کا فرمان تھا وہ کچھ لوگوں کے لئے تھا اور جو آج کا فرمان ہے یہ کچھ اور لوگوں کے لئے ہے یا یہ اختلاف و تفاوت وقت کے لحاظ سے ہے یا مکان کے لحاظ سے ہے۔ مکان سے مُراد کوئی ملک ہے، کوئی جگہ ہے، کوئی شہر ہے تو اُس میں اُس حالت کے مطابق امام کوئی بھی ارشاد کرتا ہے، لہٰذا جو بھی فرامین سے حیرت حاصل کرنا چاہتا ہو یا فرامین سمجھانا چاہتا ہو اُس کے سامنے یہ بات ہونی چاہئے۔

کچھ وقت پہلے کی بات ہے کہ یہاں کچھ لوگوں نے ہماری جماعت کے خلاف (Pamphlets) کتابچے وغیرہ شائع کئے تھے اور اُن کی کاپیاں میرے ریکارڈ میں اب بھی موجود ہیں، میرے آفس میں، میرے گھر میں موجود ہیں۔ آپ میں سے جو عزیزان چاہیں تو میں اُن کو یہ فرامین جو دُوسروں نے اپنے مقصد کے لئے استعمال کیے ہیں وہ موجود ہیں۔ اُن فرامین میں کچھ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ کے ارشادات ہیں اور کچھ حاضر امام کے ارشادات ہیں اور وہ ارشادات صحیح ہیں، ایسا نہیں کہ وہ فرامین نہیں ہیں، فرامین ہیں لیکن وہ ارشادات کچھ ایسے ہیں اور ایسے لگتے ہیں کہ کہیں کسی شہر میں کچھ اسماعیلی تھے جو شاید گیتی قسم کے تھے یا ابھی ابھی ہندو مذہب کو چھوڑ کے ست پنتھ کی طرف آرہے تھے تو اُن کے سلسلے میں امامؑ نے کچھ فرامین فرمائے ہیں، جو ابتدائی شریعت یا کہ ابتدائی اسلام سے متعلّق کچھ باتیں ہیں۔ وہ دُرست ہیں تو ہمارے معترضین نے اُن فرامین کو اُجاگر کرتے ہوئے اپنی دلیل پیش کی ہے کہ دیکھو! تمہارا امام ایسا فرماتا ہے شریعت سے متعلّق اور تم اِس پر عمل نہیں کرتے، حالانکہ وہ کچھ ایسے اسماعیلیوں کے لئے ہیں جو مسلم اکثریت کے درمیان رہتے تھے یا نئے آئے ہوئے تھے اور اسماعیلی مذہب ابھی ابھی اختیار کر رہے تھے تو کیا اُن کو اسلام کی بنیادی باتیں نہیں بتلانی چاہئیں، امام جانتا ہے کہ اگر ایسے لوگوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقف نہ کر دیا جائے تو اُن کے لئے ہوسکتا ہے کہ بہت سی اُلجھنیں پیدا ہو جائیں، ہوسکتا ہے کہ اُن کو کوئی تکلیف ہو۔

بہرحال ہمارا [بتانے کا] یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم بالکل شریعت سے الگ تھلگ ہیں، ہمارا مذہب ایک ایسا مذہب ہے اور ایسا کامیاب مذہب ہے کہ اِس کے اندر شریعت کا عنصر بھی ہے، طریقت کا بھی، حقیقت کا بھی اور معرفت کا بھی [عنصر ہے]۔ تو یہ ہمارے مذہب کی کامیابی اور اِس کی تکمیل کی علامت ہے کہ اِس میں اسلام کے رستے کی اِن چار منزلوں کے وہ سارے

احکامات موجود ہیں،لہٰذا امامؑ کے فرامین میں لازمی طور پر شریعت،طریقت،حقیقت اور معرفت کی باتیں ہوں گی۔

سننے والے کو، بتلانے والے کو، یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ بتائے جو سامنے بات آرہی ہے یا فرمان میں جو بات ہے وہ کس مقام کی بات ہے؟ کس درجے کی بات ہے؟ آیا شریعت کی بات ہے یا طریقت کی بات ہے یا حقیقت کی بات ہے یا معرفت کی بات ہے۔آپ کو علم ہے امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے صوفیوں کی بہت سی باتیں، بہت سی مثالیں پیش کی ہیں وہ بار بار مولائے رُوم کی مثال دے کے کچھ فرمان فرماتے ہیں،تو کیا مولائے رُوم کی مثال دے کر جب امام کوئی فرمان فرماتے ہیں کیا اِس میں طریقت کا عنصر نہیں ہے؟ کیا مولائے رُوم اہلِ طریقت میں سے نہیں تھا؟ کیا وہ ایک صوفی نہیں تھا؟ کیا آپ ایسی باتوں کو حقیقت کی باتیں قرار دیں گے یا معرفت کی باتیں قرار دیں گے۔امامؑ نے خود ہی فرمایا ہے کہ:''تصوف طریقت ہے اور اسماعیلی مذہب حقیقت ہے''(دارالسّلام۔ ۲۹۔۹۔۱۸۹۹)۔اس کے باوجود امامؑ نے صوفیوں کی بہت سی باتیں بتلائی ہیں، ہم کو صوفیوں کی باتیں چاہئیں ہم کو شریعت کی باتیں بھی چاہئیں۔ابھی ابھی میں نے کہا کہ ہمارا مذہب چاروں چیزوں کا ایک مجموعہ ہے اِس لئے ہمارا مذہب کامل اور مکمل ہے۔اسلام تنہا شریعت نہیں ہے جو لوگ خیال کرتے ہیں یا اسلام صرف طریقت نہیں ہے جو صوفیوں کا خیال ہے بلکہ اسلام چاروں عناصر کا مجموعہ ہے،اسلام میں شریعت ہے،طریقت ہے،حقیقت ہے اور معرفت ہے۔معرفت تو اِس سلسلے کی آخری منزل ہے،لہٰذا یہ اسماعیلی مذہب کی خوبی اور تعریف ہے کہ اِس کے اندر یہ گنجائش ہے کہ افراد جیسے بھی ہوں،اُن کے لئے اُن کی حیثیت کے مطابق،اُن کے مقام کے مطابق ایک تعلیم ان کو مہیا کر دی جائے۔یہ ممکن نہیں ہے کہ کم تعلیم والوں کو اعلیٰ حقیقت کی باتیں ایک دم سے بتلا دی جائیں،یہ ناممکن ہے،لہٰذا اِس مذہب میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو اُس کی حیثیت کے مطابق تعلیم دی جائے۔اِس لئے یہ ضروری ہے کہ فرامینِ اقدّس کو سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ فرامین کے ارشادات میں کس کس منزل کی باتیں ہیں تا کہ اپنی جماعتوں کو سمجھا سکیں اور فرق کر سکیں،نہیں تو سوال اُٹھے گا،کہا جائے گا کہ مشنری یا استاد یا گائیڈ کبھی تو وہ کہتا ہے اور کبھی تو یہ کہتا ہے،ہم کبھی وہ اور کبھی یہ نہیں کہتے ہیں،لیکن یہ دو باتیں اگر ہیں یا تین ہیں یا چار[باتیں]ہیں تو اِس لئے ہیں کہ تعلیمات الگ الگ درجے کی ہوتی ہیں۔

قرآن میں بھی یہی باتیں ہیں لیکن اِس کے باوجود کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ قرآن کے اندر تضاد ہے،قرآن کے اندر تضاد نہیں ہے،نہ اُس میں کوئی اختلاف ہے،بلکہ یہ الگ الگ تعلیمات کی باتیں ہیں اور یہ جاننا ضروری ہے۔اِس لئے جب کوئی الواعظ اِس اصول کو نہیں سمجھتا ہے تو جماعتوں کو اُلجھن ہوتی ہے،خواہ وہ سوال کریں یا نہ کریں لیکن اُن کے دلوں میں ایک طرح سے شکوک پیدا ہو جاتے ہیں،وہ کہتے ہیں کہ نامعلوم ایک مشنری آکر یہ کہتا ہے اور پھر دُوسرا آکر وہ کہتا ہے تو ہم کس پر چلیں۔اِن بیچاروں کو اِس قسم کی اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں اِس لئے(Students)کو اور جماعتوں کو تمہید کے طور پر یا کسی بھی موقع پر یہ سمجھا دینا چاہئے کہ امامؑ کی تعلیمات جو ہیں وہ مختلف(Stages)میں ہیں اور الگ الگ باتیں ہیں تا کہ جماعتوں کی رُوحانی اور دینی ترقّی ہو۔

بزرگانِ دین نے اِس سلسلے میں بہت سی مثالیں دی ہیں اور اُن میں سے ایک مثال یہ ہے کہ بچہ جو ابھی ابھی پیدا ہوتا ہے وہ اُن غذاؤں کو کھا نہیں سکتا ہے اور نہ اُن کو ہضم کر سکتا ہے جو ایک جوان آدمی کھاتا ہے۔لہٰذا یہ اُس کی ماں کا کام ہے کہ[وہ]

اُن سخت اور ثقیل غذاؤں کو کھائے اور اُن کو ہضم کر کے اُن غذاؤں کا دودھ بنائے اور نومولود بچے کے لئے دودھ ہی ایک ایسی غذا ہے کہ جس کو بچہ با آسانی ہضم کر سکتا ہے۔ اِسی طرح ایک فردِ اسماعیلی کو اسماعیلی ہونے کے باوجود آپ اگر معرفت کی اُونچی سے اُونچی باتیں بتلائیں گے تو وہ اُن کو نہ تو سمجھ سکے گا اور نہ ذہن نشین کر سکے گا اور نہ اُن سے فائدہ اُٹھا سکے گا، فائدہ اُٹھانے کا سوال ہی نہ رہا جبکہ وہ نہیں سمجھتا ہے۔

اِس لئے بزرگانِ دین نے فرمایا ہے کہ آپ لوگوں کی عقل کے موافق بات کیا کرو۔ سامنے جیسے [افراد] ہوتے ہیں اُن کی عقل کے مطابق بات کریں، اُن کو سمجھائیں اور اِس سلسلے میں سب سے بڑی اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ امامؑ کے جو مختلف ارشادات ہیں وہ اُن کو سمجھائیں۔ میں صرف زمانے کے امامؑ کے ارشادات کے سلسلے میں بات کرتا ہوں کہ ایک ہی امامؑ کے ارشادت کے اندر مختلف باتیں ہو سکتی ہیں مختلف مواقع کے لئے اور اب رہا سابق اماموں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے تو اُس کا ایک حصّہ حاضر امام کے ارشادات کے ساتھ توافُق نہیں کرے گا اور اُن کے اندر اختلاف ہو گا۔ وجہ اِس کی یہ ہے کہ اُس زمانے میں وہ [گزشتہ] فرامین بہت ہی موافق تھے لیکن زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے فرامین کی ضرورت پیش آئی، لہٰذا اسماعیلی مذہب میں ہمیشہ ہادیٔ زمان موجود ہوا کرتا ہے تا کہ وہ زمانے کے موافق فرامین فرمائے۔ اِس لئے یہ لازمی بات ہے کہ اگلے اماموں نے جو کچھ ارشادات کئے ہیں اُن میں سے سب نہیں بلکہ صرف ایک حصّے کا اختلاف ہو گا موجودہ وقت کے امام کے فرامین کے ساتھ، یہ ضروری نہیں ہے کہ مولانا علیؑ نے جو کچھ فرمایا ہے اُس میں سے ہر بات کا موجودہ وقت کے امام کے فرامین کے ساتھ اختلاف ہو ایسا نہیں ہے۔

بہت سے ارشادات ایسے ہیں جو اب بھی مستعمل ہیں کیونکہ وہ خالص علم کی بات ہے۔ ہاں! کچھ ایسی باتیں جن کا تعلّق وقت سے تھا، زمانے سے تھا اور جن باتوں کا تعلّق وقت سے زمانے سے نہ ہو وہ خالص دائمی علم کی باتیں ہوں، تو اُن میں اختلاف نہیں ہوتا ہے، اُن سے حاضر امام کے فرامین کا اختلاف نہیں ہوتا ہے، حاضر امام کے فرامین اُن فرامین سے مختلف نہیں ہوا کرتے ہیں کیونکہ وہ جنرل علم کی باتیں ہیں۔ مولانا علیؑ کا نام میں نے اِس لئے لیا کہ وہ اِس دور کے لحاظ سے پہلے امام ہیں جو رسولؐ کے بعد جانشین ہوئے اور علیؑ کے نام لینے سے مقصد یہ ہے تا کہ آپ کو معلوم ہو کہ علیؑ کے بہت سے ارشادات ہیں آج بھی اُن کی روشنی چاہیئے۔ تو مولانا علیؑ نے ایک فرمان فرمایا تھا: سَلُونِی! سَلُونِی! قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِی، مجھ سے پوچھا کرو، مجھ سے پوچھ لو اِس سے پیشتر کہ تم مجھ کو گُم کر دو گے، مجھ سے پوچھا کرو، اِس سے پیشتر کہ تم مجھ کو گُم کر دو گے اور دیکھیں کہ اسماعیلیوں کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ کسی بھی ارشاد کے فلسفے کو اُس کے مغز کو لیتے ہیں پھر اُس کا تجزیہ کرتے ہیں اور اُس کی تمام حکمتوں کو اُجاگر کرنے کے لئے کوشش کرتے ہیں، میں کچھ حکمتیں اِس فرمان سے اُجاگر کرتا ہوں جو مولانا علیؑ کا فرمان ہے۔

امام کا یہ فرمانا کہ ”تم پوچھو قبل اِس کے کہ تم مجھ کو گُم کر دو گے“، یہ بات صحیح ہے یہ خطاب سب مسلمین سے تھا کیونکہ بہت سے مسلمین امام کو گُم کر دینے والے تھے۔ یہ اُس وقت فرمایا گیا جبکہ بہت سارے لوگوں کا علیؑ پر اعتماد تھا کسی طرح سے بھی اور علیؑ جانتے تھے کہ بعد میں لوگ علیؑ سے پوچھ نہیں سکتے تھے۔ علیؑ کے دُنیا میں ہونے کے باوجود بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اُس کو گُم

کرنے والے تھے تو بہت سے لوگوں نے علی کو گُم کر دیا یعنی کہ اُن کا ہاتھ علیؑ کے دامن سے چھوٹ گیا، علیؑ کے ماننے سے انہوں نے انکار کیا اور اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ علیؑ دُنیا میں گُم ہو جانے والا تھا اور جو چیز کسی کے لئے، کسی کے نزدیک گُم ہو جاتی ہے تو وہ دُنیا سے غائب تو نہیں ہوتی ہے، وہ دُنیا میں موجود ہوتی ہے۔ لیکن جو شخص اُس کو گُم گشتہ خیال کرتا ہے اور جو شخص کہتا ہے کہ میری چیز گُم گئی ہے یا فلان شخص گُم گیا ہے تو یہ اُس کے نزدیک ہے، اُس کے تصوّر کے مطابق ہے، وہ چیز یا کہ وہ شخص دُنیا میں ہی موجود ہوتا ہے۔ تو اِس لئے علیؑ کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ بہت سے لوگ علیؑ کو چھوڑنے والے ہیں اور دُوسری بات اِس میں یہ ہے کہ علیؑ نے اِس انداز سے لوگوں کو جتلایا اور پیشگوئی کی کہ علیؑ کے مقدّس دامن سے، بہت سے لوگوں کا ہاتھ چھوٹ جانے والا تھا اور اِس میں ایک اور حکمت یہ ہے کہ پوچھنے کے لئے امامؑ ہی ہوتا ہے اور امامؑ کے سوا کوئی سوال کا جواب نہیں دے سکتا ہے اور علیؑ کے بغیر اگر کوئی شخص سوال کا جواب دینے والا ہوتا تو علیؑ اِس بات پر زور نہ دیتے اور نہ کہتے کہ جب تم مجھ کو گُم کر دو گے تو تمہارے لئے پوچھنے کا راستہ ہی نہیں رہے گا، اِس ارشاد کے اندر یہ فلسفہ موجود ہے۔ تو اِس کا مطلب ایک طرف سے یہ ہوا کہ امامؑ کے فرامین میں بہت سی حکمتیں ہوتی ہیں اور دُوسرا مطلب یہ ہے کہ علیؑ نے لوگوں کو بتلایا تھا کہ آگے چل کر بہت سے لوگ علیؑ سے الگ ہونے والے ہیں۔

اب ایک [اور] چیز یہ کہ امامؑ کے سوا کوئی نہیں ہے جو سوال کا جواب دے سکے لیکن امام کس طرح سوال کا جواب دیتا ہے۔ وہ دُنیا کے کسی ملّا مولوی کی طرح نہیں کہ سامنے بیٹھیں اور کتاب کھولیں اور درس کے طور پر کوئی چیز سکھائیں، یہ بات نہیں ہے وہ امامؑ ہے۔ امامؑ جس کسی کو کچھ دینا چاہتا ہے وہ لدنّی طریقے سے ہے اور رُوحانی سبیل سے ہے۔ ہمارے پیر بزرگ [نے] کچھ امامؑ کے سامنے بیٹھ کر درس نہیں لیا تھا بس ایک اِذن تھا، ایک اجازت تھی، ایک دُعا تھی اور ایک امر تھا، خدمت تھی جب امامؑ نے فرمایا کہ تم جاؤ فلان کام کرو اور اِسی کے ساتھ ساتھ اُن کو رُوحانی تائید ملنے لگی۔ جب وہ اپنے مشن پر چلے گئے تو امامؑ کے رُوحانی معجزات اُن کے سامنے تھے، جب وہ مشن کو انجام دے کر اپنے گھر آئے تو اُن معجزات میں سے بہت تھوڑے تھے یہی ہوا کرتا ہے۔ دُنیا کے اندر جو اسماعیلی امامؑ پر بھروسہ رکھتا ہے اور یقین کے ساتھ کسی بڑے سے بڑے کام کو سامنے رکھتا ہے اور کسی بڑے (Task) پر جاتا ہے تو امامؑ کی رُوحانی مدد اُس کو پہنچتی ہے خواہ وہ کتنا دُور کیوں نہ ہو اور وہ دشمن کے ملک میں کیوں نہ ہو امامؑ کی رُوحانی مدد اور اُس کی تائید و توفیق اُس بندۂ مومن کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

مطلب کی بات یہ ہے کہ امامؑ کے فرامین میں بہت سی حکمتیں ہیں اور میں نے اِس سلسلے کی بات اِس لئے ضروری سمجھی ہے کہ بہت سے لوگ فرامین سے کس طرح ہدایت حاصل کرنی چاہئے وہ نہیں سمجھتے ہیں اور بعض کمزور اسماعیلی فرامین میں تضاد خیال کرتے ہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ [اُن فرامین میں] مختلف درجات کی تعلیمات ہیں اور ویسے بھی ہر اُستاد کا یہ فرض ہوتا ہے جب وہ لوگوں کو بتاتا ہے، سمجھاتا ہے، لیکچر دیتا ہے، واعظ کرتا ہے تو جو بھی بات وہ کرنا چاہتا ہے اُس کے بارے میں بتلائے کہ یہ فلان (Category) کی بات ہے، بتائے کہ یہ ظاہر [کی] بات ہے، بتائے یہ باطن [کی] بات ہے، کہے کہ یہ صوفیوں کی بات ہے اور مَیں مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں، کہے کہ یہ شریعت کی بات ہے، کہے کہ یہ خاص معرفت کی بات ہے۔ وہ سمجھیں گے کہ اُستاد کے پاس ابھی اور باتیں ہیں وہ ایک (Level) کی بات کرتا ہے، اِس سے اُونچی (Level) کی

بات اور ہے وہ اِس طرح سے سمجھیں گے، اگر یہ نہ سمجھایا جائے تو وہ کہیں گے کہ یہی بات ہے اور (Definite) ہے اور اُسی سے چُپک جائیں گے اور اُسی کو لیں گے۔ مثلاً امامؑ کے نور کے بارے میں، امامؑ کے مرتبے کے بارے میں، امام کے نور کے سلسلے میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہر وقت اُس راز کو فاش کریں جو بہت بڑا راز ہے ہمیں چاہئے کہ اُن کو اشارہ کریں کہ دیکھیں ہم اِس طرح سے بات کرتے ہیں، مثلاً جماعتوں کو ایک دم سے یہ خواہش ہوتی ہے کہ امامؑ کے مرتبے کے بارے میں بتا دیا جائے کہ اُن کا کیا مرتبہ ہے اور سب سے اُونچا جو مرتبہ ہے وہ ہی بتا دیا جائے لیکن اِس کی کیا ضرورت ہے ہم اپنے موقع کو دیکھیں گے اور جیسے لوگ ہیں یا جیسا اجتماع ہے اُس کے مطابق بات کریں گے اور جیسا میدان ہے اُس کے مطابق بات کریں گے۔

تو لہٰذا ہمیں اُن کو اشارہ کرنا چاہئے اُن کو بتلانا چاہئے کہ یہ (Level) فلاں (Level) ہے، یہ شریعتی (Level) ہے، یہ طریقت کی بات ہے یہ حقیقت کی بات ہے اور اگر معرفت کی کوئی بات ہے تو بتا دی جائے کہ یہ معرفت کی بات ہے تا کہ وہ اِس کو سمجھیں گے۔ چونکہ اجتماع میں ایک قسم کے لوگ نہیں ہوتے ہیں کچھ کو تو اُونچی باتیں چاہئیں، کچھ کو تو بہت آسان اور معمولی باتیں چاہئیں، لہٰذا ایسا نہیں کہ کلاس کی طرح ہم اُن سے بات کریں کہ ایک کلاس میں تو تقریباً ایک (Level) کی بات ہوتی ہے اور جماعت میں [افراد] ایسے نہیں ہوتے۔ چھوٹے ہوتے ہیں، بڑے ہوتے ہیں، تجربہ کار ہوتے ہیں، علم والے ہوتے ہیں، کم علم والے ہوتے ہیں، مردوں میں سے عورتوں میں سے مختلف ذہنیتوں کے افراد ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم اُس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ باتیں تو جنرل ہوں لیکن عام فہم ہوں اور ہر (Level) کی باتیں ہوں، ایک (Level) کی بات نہیں، ایک (Level) کی بات کریں تو اُن کو مزا نہیں آئے گا، کچھ کو مزا آئے گا تو کچھ ایسے رہیں گے۔ اگر آپ بہت آسان اور سیدھی سادھی باتیں کرتے ہیں تو جو اعلیٰ تعلیم والے ہیں تو اُن کو کچھ بھی مزا نہیں آئے گا، اُن کو کوئی نئی چیز نہیں ملے گی، اُن کے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا آپ ایسی کوشش کریں کہ آپ کی باتوں میں آپ کے لیکچر میں، آپ کے واعظ میں، آپ کی تقریر میں بہت ساری چیزیں، بہت ساری معلومات ہوں اور اگر نچلی سطح کی باتیں ہیں تو بھی اچھی ہوں تازہ ہوں اُن باتوں میں علم ہو۔ اگر آپ اُن کی معلومات میں اضافہ نہیں کرتے ہیں تو آپ بات ہی نہ کریں، کیا فائدہ ہے کہ ایک چیز (Repeat) کی جاتی ہے، ایک چیز دُہرائی جاتی ہے اور جماعت کے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہے اُن کی کوئی ترقّی نہیں ہوتی ہے، تو یہی تو مشکل ہے، [اگر] کچھ حاصل ہو، کچھ ذخیرہ ہو، تو دیا جا سکتا ہے۔ جب خود کے پاس کچھ نہیں ہے تو دُوسروں کو کیا دیں۔

بہر حال ماشاء اللہ آج کل نوجوان اور بہت ہی علم والے پیدا ہوئے ہیں اُن کی آپ مدد کریں اور کتابوں سے علم کو حاصل کریں، کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ اُن کے پاس علم کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے۔ علم کا ذخیرہ کب ختم ہوتا ہے میں آپ کو بتاؤں! جب علم رُوحانی نہ ہو، جب علم تائیدی نہ ہو، ظاہری ہو اور کتابوں کی باتیں ہوں، حکایات، کہانیاں، قصّے اور ظاہری باتیں، خواہ وہ اسماعیلیت کی ہیں یا تصوّف کی ہیں، قرآن کی ہیں، کچھ بھی ہیں لیکن ظاہری قسم کی ہیں تو ظاہری قسم کی چیز ختم ہو جاتی ہیں۔ جب حکمت ہو، جب تاویل ہو، جب ہر بار آپ باطن میں جانے کے لئے کوشش کرتے ہیں تو اُسی بات سے ہر بار نئی نئی چیزیں ملیں گی۔ مثلاً ایک چیز ہے، آپ نے اُس کے بارے میں جماعتوں کو بتایا ہے لیکن آپ کے پاس رُوحانی علم ہے

یا رُوحانی علم میں جانے کا راستہ ہے، تو اُسی چیز سے ایک اور چیز پیدا ہو جائے گی، اُس کے باطن میں سے ایک اور باطن پیدا ہو جائے گا پھر کبھی اُس کا مزا ختم نہیں ہوگا۔ اِس لئے آپ یہ کوشش کریں [اِس] زمانے میں جو عروج و ترقّی کا زمانہ ہے، اِس میں چند حکایات اور چند قصّے یاد کر کے آگے بڑھنا یہ اسماعیلی مذہب کی شان نہیں ہے۔

اِس لئے آپ اپنے ذخیرے میں بہت اضافہ کریں، بہت معلومات حاصل کریں، بہت باتیں سنیں، بہت (Study) کریں، کتابوں کو بار بار پڑھیں، قرآن کی باتیں، اُصولات [کو] یاد کریں اور تعلیم اِس طرح سے لیں۔ آپ تعلیم نہ لیں [بلکہ] فارمولا یاد کریں، اُصولات کو سمجھیں، آپ تعلیم نہ لیں لیکن اِس چیز کی تعلیم لیں کہ رُوحانی تعلیم کس طرح ملتی ہے۔ آپ اگر ظاہری تعلیم لیتے ہیں تھوڑی بہت تو وہ مثال کے طور پر لیں، آپ خود کو رُوحانی علم کے لئے تیار کریں۔ آپ اگر علم کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو تاویل کو لیں، حکمت کو لیں، طریقے کو سمجھیں۔ آپ یہ کوشش کریں کہ اُونچی سے اونچی سطح کی باتیں سنیں، انہی کو یاد کریں اور جماعت کو بتلائیں کہ ہمارا جو مذہب ہے وہ علم کا مذہب ہے۔ چونکہ امامؑ ہمارے پاس ہے، جماعت کو بتلائیں کہ امام کس طرح کسی کو علم دیتا ہے، کسی پیر کی مثال دیں، کسی ماضی کے بزرگ کی مثال دیں۔ پیر صدرالدّینؒ کی مثال دیں، پیر حسن کبیر الدّینؒ کی مثال دیں، پیر ناصرِ خسروؒ کی مثال دیں کہ انہوں نے امامؑ کے ساتھ سامنے بیٹھ کر تعلیم تو نہیں لی تھی اُن کو رُوحانی علم ملا تھا۔ اب بتائیں کہ یہ جو عبادت و بندگی اور "بڑا کام" ہے کس لئے ہے اِس کا کوئی ایک مقصد نہیں ہے، اِس کا صرف یہی مقصد نہیں ہے کہ روشنی دیکھیں، روشنی کیا چیز ہوتی ہے؟ وہ رُوحانی علم حاصل کرنے کے لئے ہے اور (Direct) امامؑ سے علم لینے کے لئے ہے اور یہ دیکھنے کے لئے ہے کہ کس طرح امام دُوسروں کو علم دے دیا کرتا ہے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ امام نے بزرگوں کو کس طرح تعلیم دی تھی، یہ دیکھنے کے لئے ہے کہ امام اِس کائنات کے نظام کو کس طرح چلاتا ہے، یہ دیکھنے کے لئے ہے کہ پیغمبر پر کون کون سے معجزات کس طرح سے واقع ہوئے، چونکہ اِس کا نام معرفت ہے اور معرفت میں سب معرفتیں آجاتی ہیں، معرفت اگرچہ کہ ایک لفظ ہے، معرفت اگرچہ ایک نام ہے لیکن اُس میں سب کچھ ہے۔

جہاں پر خدا کی شناخت ہوتی ہے تو کیا اُس میں پیغمبر اور امام کی شناخت نہیں ہے؟ کیا عرش کی، کرسی کی، ازل کی، ابد کی، سماوات کی، ارض کی اور رُوحوں کی، معجزات کی، قرآن کی، نور کی، شناخت نہیں ہے؟ سب چیزوں کی شناخت ہے، کوئی شناخت، کوئی پہچان، کوئی معرفت اِس معرفت سے باہر نہیں ہے۔ تو پھر "بڑا کام" صرف بڑا نہیں ہے انتہائی عظیم ہے، بہت ہی بڑا ہے، اتنا بڑا ہے کہ پیغمبروں نے مشکل سے اُس کو سنبھالا، اتنا بڑا ہے کہ بس یہ امامؑ ہی کا کام ہے۔ امامؑ کی امامت کا معجزہ اِسی میں ہے، اِن معنوں میں بڑا کام ہے، آپ کسی وقت بڑے کام پر لیکچر دیں اور اِس کی اہمیت سمجھائیں، بڑے ہونے کا کچھ معیار ہونا چاہئے، کچھ تخمینہ، کچھ اندازہ بتائیں کہ کتنا بڑا ہے، یہ کائنات سے بھی بہت بڑا ہے، چونکہ اِس کے اندر خدا کا نور ہے، یہ عرش کے برابر ہے چونکہ اِس کے اندر عرش ہے، بہت بڑا ہے اور اِس لئے کہ اِس کے اندر سب کچھ ہے۔ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۳۶:۱۲) یہ تو سطحی طور پر ہر شخص جانتا ہے، ہر اسماعیلی اِس کو رٹتا ہے، کہتا ہے کہ امامؑ میں ہر چیز محدود ہے امامؑ کی ذات میں ہر چیز پائی جاتی ہے۔ امامؑ کی ذات میں [اگر] ہر چیز پائی جاتی ہے تو ہر چیز کو دیکھنے کے لئے کیا ہم یہاں سے چل کر امامؑ کے پاس جائیں؟ کس

طرح دیکھیں؟ کس طرح یقین حاصل کریں کہ امامؑ کے پاس ہر چیز ہے؟ یا امام کو ہماری ہستی میں آنا چاہئے، ہماری انا میں بسنا چاہئے، ہمارے قلب میں سمونا چاہئے یا ہمیں وہاں جانا چاہئے؟ ہم کیا [وہاں] جاسکتے ہیں [یا] اُسے آنا چاہئے اور وہ آتا ہے، جب وہ آتا ہے تو ہر چیز کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ چونکہ اِس آیت نے ہم کو بتلایا کہ ہر چیز امامؑ کی ذات میں ہے تو پھر عرش و فرش بھی ہر چیز میں سے ہے پیغمبر کا نور بھی سب انبیاء، ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر، فرشتے اور ازل و ابد، بہشت ہر چیز، ہر چیز دیکھنے میں آتی ہے، یہ "بڑا کام" ہے۔

تو بات فرامین کے سلسلے میں تھی، لیکن فرامین کے سلسلے میں صرف چند باتیں تھیں اور سارے وقت میں اُسی کو (Repeat) کرنا مقصود نہیں تھا، لہٰذا ہم نے جو بھی علم کی بات سامنے آوے اُس کو (Tape) کے حوالے کر دینا ہے تاکہ آپ کے (General Knowledge) میں اضافہ ہو جائے، اِس کی کوئی فکر نہیں ہے کہ یہ کوئی منظّم مضمون نہیں ہے۔ منظّم مضمون ہے، تو آپ یہ کوشش کریں کہ کیسٹوں کو سنیں، آپ یہ کوشش کریں کہ کتابوں کو اچھی طرح سے پڑھیں، آپ سوالات کریں اور بہت اچھا وقت ہے، کچھ وقت کے بعد پھر یہ موقع آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا، یہ نہیں معلوم کس بہانے سے نکل جائے گا میں نہیں جانتا ہوں۔ تو آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ صحبت جو ہے بہت دُور تک قائم رہے گی، یہ دُنیا ہے اور ہم آپ سب انسان ہیں، بشر ہیں اور یہ جسم ہے اِس پر کیا بھروسہ لہٰذا یہ وقت جو آپ کو میسر ہے، غنیمت سمجھ لینا جو ہو سکے تو آپ اپنے علم میں بہت زیادہ اضافہ کرنا اور سوچنا کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ علم کو حاصل کریں اور سوچنا کہ کس طرح جماعتوں کو کچھ فائدہ دیں، کیونکہ علم کا قحط پڑ رہا ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ اِس زمانے میں امتحان کے طور پر یا کسی طرح سے حقیقی علم کا قحط آچکا ہے، تو ایسے میں آپ اگر علمی طور پر خدمت کریں گے یا علمی خدمت کے سلسلے میں کوئی کام کریں گے تو آپ کا کام خواہ وہ معمولی کیوں نہ ہو وہ (Transfer) ہو جائے گا علم کی صورت میں اور اُسی میں سے علم کی خدمت بن جائے گی۔ تو لہٰذا ہر حالت میں آپ سے علمی خدمت اور علمی تعاون ہوگا تو اِس کے لئے آپ سوچیں اور ماشاء اللہ آپ اِس سلسلے میں خوب کام کرتے ہیں، خدمت کرتے ہیں اور (Direct) جماعتوں کو، افراد کو علم دیتے ہیں تو یہ عظیم ثواب ہے اِس میں بہت بڑا کام ہے۔ تو آپ اپنی عادت کچھ اِس طرح سے بنائیں کہ علم سے آپ کو دلچسپی ہو، ذوق ہو یہ عادت کی بات ہے، انسان ایسا نہیں ہے کہ ایک دم سے اچھی چیز کو لے اور بُری چیز کو ترک کرے وہ تو بعض دفعہ بُری چیز کو بھی لیتا ہے اور بعض دفعہ اچھی چیز کو چھوڑتا ہے یہ تو عادت اور کوشش کی بات ہے۔ لہٰذا دُنیا میں جو سگریٹ پیتے ہیں وہ کچھ میٹھی چیز [تو] نہیں ہے کہ اُس کو مٹھاس اور لذّت کی وجہ سے پیتے ہیں یہ عادت کی بات ہے اور جو عبادت و بندگی کو ترک کرتے ہیں تو اِس لئے نہیں ہے کہ وہ عبادت کڑوی ہے اُس میں کوئی لذّت نہیں ہے، لذّت ہے لیکن یہ عادت کی بات ہے۔ میرے اِس قول کا مقصد یہ ہے کہ آپ ایسی عادت بنائیں کہ اُس عادت کی بدولت آپ کو علم سے مزا آوے، عبادت سے مزا آوے یہ آپ پر دارومدار رکھتا ہے۔

آپ یہ نہ سوچیں کہ علم اتنی اچھی چیز ہے تو خود بخود اُس کے اندر کشش ہونی چاہئے وہ ہمارے دل کو کھینچے اور اپنی طرف متوجہ کرلے تو آپ یہ خیال نہ کریں۔ انسان کچھ اِس طرح سے پیدا نہیں کیا گیا ہے کہ وہ نیکی پر مائل ہو جائے، خیر کی طرف کھینچ جائے، انسان ایسی مخلوق ہے کہ وہ خیر اور شر دونوں کے درمیان مساوی ہے۔ وہ شر کی طرف بھی کھینچ سکتا ہے اور خیر کی طرف بھی کھینچ سکتا ہے، جیسا کہ میں نے بارہا ذکر کیا ہے کہ چونکہ ہمارے اندر دو چیزیں ہیں، ایک نفس ہے اور ایک عقل ہے، اِس لئے میں نے

کہا کہ یہ ہماری کوشش پر منحصر ہے کہ ہم اپنی عادت سے خود کو نیک چیزوں سے وابستہ کر سکتے ہیں یا نہیں ۔ یہ کسی کو گمان نہ ہو کہ علم اتنا اچھا ہے اور علم ایک نور ہے اور اِس میں اتنی لذّت ہے تو اِس سے آٹو میٹک ہماری وابستگی ہونی چاہئے، یہ تصوّر دُرست نہیں ہے ۔ دُرست نہیں ہے اِس کے لئے میں نے دلیل پیش کی کہ انسان دو جانب رکھتا ہے ۔ انسان کی دو طرفین ہیں، وہ طرفین میں سے کسی بھی طرف کو جھک سکتا ہے خواہ وہ نفس کی طرف جُھکتا ہے یا عقل کی طرف [یا] وہ شرّ کی طرف مائل ہو سکتا ہے اور خیر کی طرف بھی جُھک سکتا ہے ۔ تو دونوں چیزیں اُس کے لئے برابر برابر مزا دیتی ہیں، نفس کی وجہ سے شر میں مزا ہے اور عقل کی وجہ سے خیر میں لذّت ہے تو آپ کو یہ اُصول یاد رہنا چاہئے اور نتیجے کے طور پر آپ یہ کوشش کریں کہ خود کو نیکی پر اُبھاریں اور ہر وقت کوشش کریں اپنے اندر جو ''انا'' ہے اُس کو سمجھیں اور خود ہی ذمہ داری قبول کریں علم کو حاصل کرنے کے لئے، عبادت کرنے کے لئے، نیکی اور خدمت میں آگے ہونے کے لئے ۔ تو انسان کو عمر کی اِس حد تک بہت سے تجربے ہو چکے ہیں اور اُس نے بہت سی چیزیں دیکھی ہیں، اپنی اچھی عادتوں کا بھی اِس کو تجربہ ہے اور بُری عادتوں کا بھی اِس کو تجربہ ہے، نفس کو بھی وہ خوب جانتا ہے، عقل کو بھی وہ اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہے تو پھر انسان کی یہ زندگی بھی ایک بولتی کتاب ہے ۔ کسی بھی کتاب سے انسان کی زندگی اور اِس کا تجربہ کم نہیں ہے، لہٰذا اِس لئے کل کو حجّت ہمارے اُوپر رہے گی، خدا کے حضور میں ہماری کوئی حجّت نہیں چلے گی، ہماری کوئی دلیل نہیں چلے گی کہ ہم کو یہ نہیں تھا اور وہ نہیں ہوا وغیرہ، ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکیں گے، ہمارا منہ بند ہو جائے گا تو اِس لئے مومن کو چاہئے کہ بہت سی ذمہ داریاں قبول کرے، چونکہ وہ مومن ہے ۔

دُنیا کی مثال میں آپ دیکھتے ہیں کہ دُنیا ایسی جگہ ہے کہ اُس میں جو ترقّی کرتا ہے تو اُس کی ترقّی کے ساتھ ساتھ بہت سی ذمہ داریاں اُس پر عائد ہو جاتی ہیں کہ اگر کوئی صدر ہے یا (Minister) ہے یا بادشاہ کا بیٹا ہے تو عوام کی طرح (Free) نہیں ہے وہ اُس پر پابندی ہے، چونکہ کل کو اُس نے بہت ساری ذمہ داریاں حاصل کرنی ہیں ۔ ایک قصّہ درمیان میں، مَیں آپ کو بتاؤں گا زمانۂ قدیم میں ایک مکتب تھا اور مکتب کا ایک اُستاد تھا، مُلّا مولوی ٹائپ کا کوئی تھا مگر اچھا آدمی تھا، ہوشیار تھا، دانا تھا چند لڑکے، بچے اُس کے سامنے آتے تھے اور اُس سے درس و تدریس حاصل کرتے تھے، پڑھتے تھے تو وہ اُستاد ان کو پڑھایا کرتا تھا، بڑا ہوشیار تھا، ایماندار تھا ۔ اُن میں سے ایک شہزادہ تھا، تو شہزادے کے ساتھ جو اُستاد کا برتاؤ تھا وہ کچھ مشفقانہ نہیں تھا یعنی سختی کا سلوک اُس کے ساتھ برتتا تھا، کچھ وقت کے بعد شہزادے نے بادشاہ کے سامنے، اپنے باپ کے سامنے شکایت کی اُس اُستاد کے بارے میں کہا کہ رعیّت کے جتنے بچے ہیں اُن کے ساتھ تو مہربانی کا سلوک کیا جاتا ہے لیکن میرے ہاتھ مروڑے جاتے ہیں اور مجھ کو مارا جاتا ہے، بہت کچھ (Blame) سختی، سرزنش، ملامت اُٹھانی پڑتی ہے ۔ تو فوری طور پر بادشاہ کو بہت غصّہ بھی آیا اور ناراض بھی ہوا اور اُستاد کو طلب کیا تو اُستاد گیا اور سلام کر کے ادب سے بیٹھا تو بہت ہی ناراضگی سے بادشاہ پوچھتا ہے، کہتا ہے کہ اُستاد کیا وجہ ہے رعیت کے بچوں کے ساتھ اتنی مہربانی سے برتاؤ کرتے ہیں اور میرے بچے [سے] یہ کیا دشمنی ہے کہ ہر بار اُس کو مارا پیٹا بھی جاتا ہے اور اِس کو کبھی معاف نہیں کیا جاتا ہے، تو بہت سی باتیں کیں وہ خاموش رہا ۔ جب بولنے کے لئے موقع دیا گیا تو ادب سے کہا کہ بادشاہ سلامت رعیت کے بچے تو کل کو رعیت کے افراد ہوں گے، اُن کی کچھ ذمہ داریاں جو ہیں وہ بہت معمولی اور عام

ہیں لیکن کل کو آپ کا جو فرزند ہے وہ تخت کا مالک بن جائے گا تو اُس وقت اُس کو بہت کچھ کام کرنا پڑے گا اور اگر یہ عوام کے (Level) پر رہے اور اُن کی سطح پر رہے تو کل کو کچھ بھی کام نہیں کر سکے گا، لہٰذا میں اِس کو ایک بادشاہ کے بیٹے کی حیثیت سے اِس کو پڑھاتا ہوں، سمجھاتا ہوں اور اُن [بچوں] کو اُن کی سطح کے مطابق سمجھاتا ہوں وغیرہ، تو اُس نے اپنی دلیلیں پیش کیں۔ تو اتنے میں بادشاہ کا جو (Mood) تھا وہ (Change) ہو گیا اور پھر وہ اتنا خوش ہو گیا، اتنا خوش ہو گیا کہ اُس کو انعام واکرام [دے] کے واپس کیا گیا۔ تو اِسی طرح سے ہم کون ہیں؟ ہم اسماعیلی ہیں، کس کے رُوحانی فرزند ہیں؟ شاہنشاہِ دین کے، پھر ہماری یہ کتنی سُستی اور غفلت ہے کہ ہم عوام کی سطح پہ بیٹھ کر وہیں پر ٹھہر کے کام کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ ہماری عبادت اور ہمارا (Character)، ہمارے اخلاق خصوصی طور پر ہونے چاہئیں، ہمیں بہت کچھ کام کرنا چاہئے اور امامؑ بھی یہی توقع رکھتے ہیں اور اِس سلسلے میں امامؑ نے فرمان فرمایا ہے کہ: ''تم اِس طرح سے زندگی بسر کرو کہ دُوسرے لوگ تم کو دیکھیں اور کہیں کہ امام کے مُرید کتنے اچھے ہیں اور فرشتے جیسے ہیں، اگر تم لوگوں سے یہ کہلاؤ گے تو میں بہت خوش ہو جاؤں گا'' (زنجبار۔ ۵۔ ۹۔ ۱۹۰۵)۔

تو امامؑ کی اِس میں کتنی منّت سماجت جیسی بات ہے اور ہمارے ذریعے سے کتنا احسان اُٹھانا چاہتے ہیں کہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم ایسا کام کریں۔ لیکن ہم ہیں کہ بس غافل ہیں کہ اِس نعمت کی قدر نہیں کر سکتے ہیں، نہ شکر گزاری کر سکتے ہیں، نہ خصوصی کوئی عبادت ہے، پیغمبروں کی جو زندگی تھی وہ خصوصی تھی، بزرگوں کی جو زندگی تھی وہ خصوصی تھی۔ تو ہماری بھی کچھ سطح ہے، کچھ درجہ ہے لیکن ہم اپنے مرتبے کو نہیں سمجھتے ہیں اور خود کو حیوان کی طرح رکھنا چاہتے ہیں، بس کھایا پیا اور نفس کی خدمت کی گئی اور پھر آرام سے سو جاؤ اور جب بھی نیند پوری ہو جائے تب آرام سے اُٹھو عبادت بندگی ہوئی تو ٹھیک اور نہیں ہوئی تو کوئی بات نہیں۔ معاف کیا جائے گا کیونکہ ہمارا امام ہے، ہم تو بیکاری میں زندگی گزار کر سب چیز امامؑ پر ڈالنا چاہتے ہیں تو افسوس کی بات ہے کہ یہ ''پدرم سلطان بود'' والی بات ہے۔ دُنیا میں کتنی بُری بات ہے کہ ایک بادشاہ کا بیٹا شہزادہ کچھ بھی نہیں کرتا ہے اور صرف یہی احسان جتلاتا ہے کہ ''پدرم سلطان بود'' میرے باپ جو تھے وہ بادشاہ تھے۔ کتنی بُری لگے گی [یہ بات] اور خصوصاً اِس زمانے میں کہ کوئی شخص خود نالائق ہو اور کچھ بھی نہیں کر سکتا ہو اور کہتا ہو کہ ''پدرم سلطان بود'' لوگ اِس کو بہت بُرا مانیں گے اور اُس کو کہیں گے کہ اگر تیرا باپ اگر سلطان تھا، بادشاہ تھا، تو تم میں بھی کچھ ایک خاصیت تو ہونی چاہئے، ہم اُس وقت تمہاری عزت کریں گے اور اگر تم بادشاہ کے بیٹے ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں ہو تو کہیں گے کہ تم پر لعنت، ہم کو تم سے نفرت ہے نہ کہ دوستی، ہم ایسے شخص سے دوستی نہیں کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خود بادشاہ کے گھر میں پلا ہوا ہے اور اُس نے اپنے باپ کی خاصیتوں میں سے ایک بھی نہیں اپنائی ہے تو ہم ایسے شاہزادے کو نہیں چاہتے ہیں۔ ایسے شاہزادے سے گدھا اچھا ہے کہ وہ ہمارا بوجھ اُٹھائے گا اور ہمارے لئے کام کرے گا تو تم کسی کام کے نہیں ہو ہم تم کو شاہزادہ نہیں مانتے ہیں، تو لوگ اُس کو یہ منطق پیش کریں گے۔

ایک لحاظ سے دُوسری مثال یہ ہے کہ کسی بادشاہ کے دربار میں جو لوگ حاضر ہوا کرتے ہیں وہی معزز و محترم ہوا کرتے ہیں، بادشاہ کی خوشی کے مستحق سب سے پہلے وہی ہیں اور جب غصّہ آئے گا تو غصّے کو بھی برداشت کرنا پڑے گا، اب یہ تو رعیّت جو ہے، ملک کے عوام پبلک وہ تو بہت دُور ہیں، جس طرح وہ بادشاہ کی مہربانی کے حقدار ہیں اُسی طرح اُس کے قہر و غضب کے بھی

حقدار ہیں کہ جب بادشاہ غصہ کرے گا دربار میں تو وہی لوگ کانپیں گے، وہی ڈریں گے اور اُن ہی کو فکر ہوگی کہ بادشاہ ناراض ہوگیا ہے اور باقی جو دُور ہیں اُن کو کیا خبر کیونکہ انعام تو وہی لیتے ہیں اور بادشاہ کی خوشی میں اُنہی کی شرکت ہے، عزت کے مالک وہی ہیں پھر قہر وغضب کس پر؟ کیوں اُن لوگوں پر جو دُور ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ ایک فرمان کا اشارہ ہے کہ اگر اتنی نزدیکی کے باوجود ہم اِن نعمتوں کی قدردانی نہ کریں، شکرگزاری نہ کریں تو بہت بڑی ناشکری سے دوچار ہوجائیں گے اور اُس کی سزا بھی کتنی ہوگی۔

لہٰذا ڈرنا چاہئے اور کام کرنا چاہئے، عبادت کی عادت ہو تو وہ کوئی (Burden) نہیں ہے، اُس میں کوئی تلخی نہیں ہے، اُس میں بہت شیرینی ہے اور اِس سے سب کام آسان ہوجاتا ہے اگر ہم کو نیند کی فکر ہے تو یہ ہماری نادانی ہے۔ امام سلطان محمد شاہ نے فرمایا ہے کہ: نیند کوئی مسئلہ نہیں ہے، نیند مسئلہ نہیں ہے روح اتنی ترقّی کرتی ہے کہ بس مومن لیٹ گیا اور پانچ منٹ کے اندر اندر اُس کی تھکان اُتر گئی، ایسا بھی ہوتا ہے، دیکھا گیا ہے، یہ رُوح کا معجزہ ہے، پانچ چھ گھنٹے کی نیند سے جو کام بنتا ہے وہ ایک گھنٹے میں بھی بن سکتا ہے یہ امام کا ارشاد ہے۔ (میمائرس آف آغا خان، ص: ۱۵)، (وڈھواڑں کیمپ۔ ۱۸۔ ۱۰۔ ۱۹۰۳ء) تو مومن کو جو عبادت بتلائی جاتی ہے وہ ایک مجبوری کی چیز نہیں ہے، پیغمبر کی مثال لیں، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زندگی کیسی تھی؟ کتنے کام تھے؟ گھریلو کام کی مثال لیں، کتنی نمازیں اُس وقت پڑھتے تھے؟ کتنی عبادت کرتے تھے؟ کتنی نفلیں پڑھتے تھے؟ گھر کے مسائل آہ! ہر ایک کو خوش کرنا اور جماعتوں، اُمتوں کا کام، جنگیں لڑنا، یہاں تک کہ جوتوں کو بھی آنحضرتؐ خود دستِ مبارک سے مرمت کرتے تھے، بکریوں کو دُوہتے تھے، دودھ نکالتے تھے اور بہت سے گھریلو کام انجام دیتے تھے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ آنحضرتؐ کی سوانح حیات پڑھیں اُن واقعات کو سنیں جو رسول اللہؐ نے اپنے کام کو خود ہی انجام دیا۔ تو کیا اُن کا جسم نہیں تھا اور جب موقع ہوتا تھا وہ ہاتھ میں تلوار بھی لیتے تھے، اُن کے جسم میں طاقت نہیں تھی؟ وہ غذا نہیں کھاتے تھے؟ کھاتے تھے، چلتے تھے، کام بھی کرتے تھے، نیند بھی کرتے تھے تو وہ نمونہ تھے انسان کے درجۂ کمال کا، انسان ترقّی کرے تو بہت کچھ کام کرسکتا ہے اور اِس میں ممکن ہے کہ وہ انسانِ کامل سے قریب ہوجائے اور اُس کے کام انسانِ کامل کے کام کے قریب ہوجائیں، اِس لئے کسی بھی بات کی کوئی فکر نہیں ہے جبکہ مومن عزم سے، ہمّت سے کام کرے ترقّی کرے عبادت اور بندگی کے سلسلے میں، میں نے آخر میں عبادت کی طرف اور ذکر کی طرف اشارہ کیا اور یہ کہا کہ نیند کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں آپ کا کیسٹ پورا ہو چکا ہے تو اِس واسطے ابھی ہماری بیٹی شہناز کو بھی کچھ بولنا ہے تو میں اپنی گفتگو کو یہیں پر ختم کرتا ہوں، یا علی مدد۔

ٹرانسکرائب: فرحت جناح ٹائپنگ: اکبر شمس الدین پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: انفرادی قیامت کے معجزات وعجائبات

کیسٹ نمبر: ۲۰ تاریخ: ۱۹۷۸/۱۱/۳۰، کراچی

Click here for Audio

گریہ وزاری کے بعد ہونا یہ چاہیئے کہ ہم رُوحانیت کے عجائبات کا تذکرہ کریں، عجائبات کہیں یا کہ معجزات دونوں کا مطلب ایک ہی ہے اور بیشک جتنے بھی معجزات ہیں وہ سب رُوحانیت میں ہیں۔ یقیناً رُوحانیت معجزات کی ایک کائنات ہے، رُوحانیت میں بس معجزات ہی معجزات ہیں اور وہاں کی کوئی چیز معجزے کے بغیر نہیں ہے۔ جب سے ایک بندۂ مومن کے دل کی آنکھ کھلتی ہے تب سے وہ معجزات کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے اور وہ بس ہمیشہ معجزات ہی معجزات دیکھتا رہتا ہے۔ خواب میں معجزات، بیداری میں معجزات، خیالات میں معجزات، تصوّرات میں معجزات، تفکّرات میں معجزات اور زندگی کے ہر مقام پر معجزات ہی معجزات، ظاہر میں معجزات، باطن میں معجزات، آنکھ کے سامنے معجزات، کان میں معجزات۔ غرض یہ کہ حواسِ خمسۂ ظاہری اور حواسِ خمسۂ باطنی سب کے سب معجزات کے تحت آتے ہیں۔ چونکہ معجزات بڑے سے بڑے بھی ہیں اور چھوٹے سے چھوٹے بھی اور چونکہ معجزات تقسیم ہوتے ہیں حواس پر یعنی آنکھ کے معجزات، کان کے معجزات اور ناک کے معجزات یعنی سونگھنے سے متعلّق، بولنے سے متعلّق معجزات اور جسم کے ظاہر و باطن میں، رُوح میں، عقل میں اور انسان کی خودی وہستی کے ہر مقام پر معجزات ہی معجزات ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ دل کی آنکھ کھلنے سے بڑے پیمانے پر رُوحانی معجزات کا آغاز ہوجاتا ہے لیکن ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو دل کی آنکھ کھلنے سے پیشتر بھی معجزات آتے ہیں۔

معجزات کے کئی مراحل اِس سے پہلے بھی آتے ہیں، مثلاً دل کا نرم ہونا، آنسوؤں کا آنا، ذکر کے سلسلے کا جاری ہونا، عبادت سے لگاؤ ہونا یا کہ عبادت سے لذّت حاصل ہونا اور عبادت سے سکون حاصل ہونا اور وقت پر جاگنا اور ذکر میں [صحیح] (Speed) یعنی رفتار وغیرہ، ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو معجزات کی حیثیت سے ہیں۔ بہر حال وہ تو تقریباً نمایاں چیزیں ہیں اور اُن کا تجربہ ہر مومن کو ہوسکتا ہے۔ تو چلیئے! ابتدائی قسم کی روشنی سامنے آنے سے کچھ بات شروع کریں گے، چنانچہ مومن جب مسلسل کوشش کرتا ہے اور باقاعدگی سے اُٹھا کرتا ہے اور دُرست طریقے سے بیٹھتا ہے، صحیح بیٹھک میں بیٹھتا ہے اور کافی تیز رفتاری سے ذکر پر کنٹرول کرتا ہے تو ایک دن یکا یک اُس کے باطن میں روشنی نظر آتی ہے۔ پہلے پہل روشنی چھوٹے پیمانے پر نظر آتی ہے، جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام نے اِس ''بیت الخیال'' کی ابتدائی روشنی دیکھنے پر کہا

تھا جس کی مثال قرآن میں دی گئی ہے، اُس نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے ایک روشنی نظر آتی ہے شاید وہاں پر آگ ہے تو میں جا کر پتا کرتا ہوں (۲۷:۷)۔ تو [حضرت موسیٰ] وادیٔ ایمن میں گیا، ایمن برکت کو کہتے ہیں، تو وہ برکت والی وادی تھی، اُس میں جب موسیٰؑ آگے گئے تو یہ روشنی درخت پر سے نظر آئی اور جیسے ہی اُس روشنی کے قریب آئے تو ندا آئی کہ: یٰمُوْسٰٓی اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ (۲۸:۳۰) اے موسیٰ! عالمین کا پروردگار ہوں، اللہ ہوں اور دُوسرے مقام پر ہے کہ: فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی (۲۰:۱۲) آپ اپنے جوتوں کو نکالیں، کیونکہ آپ پاک وادی میں ہیں۔ تو یہ ایک دن کی بات نہیں ہے، یہ ایک کورس کا ذکر ہے کیونکہ قرآن کا یہ اُصول ہے کہ وہ اپنے تذکرے میں کئی کئی مدّتوں کے واقعات کو ملا کر اُس کی کڑی کو ملا دیتا ہے یعنی موسیٰؑ نے پہلی بار جو روشنی دیکھی وہ تو بہت پہلے والی بات ہے اور جب وہ درخت کے قریب آیا تو اُس کورس کے تقریباً آخری مرحلے کی بات ہے، یہ جاننے والے ہی جانتے ہیں اور عوام اُس کو یوں سمجھتے ہیں جیسا کہ اُسی ایک رات کی بات ہے، یہ بات ایسی نہیں ہے اور جوتوں کو نکالنے کے لئے کہنا جو ہے وہ تاویل سے متعلّق ہے، ورنہ ظاہر میں دیکھا جائے تو کفش کو نکالنے اور جوتوں کو دُور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، وہاں وہ اسم تبدیل ہونے کا اشارہ ہے۔

آپ تعجّب کریں گے کہ یہ تاویل کس طرح بن سکتی ہے جوتے نکالنا اور اسم کا تبدیل ہونا ہے، تعجّب کی کوئی بات نہیں ہے کہ اسم کو کبھی تو گھوڑا قرار دیا گیا ہے، کبھی کشتی کہا گیا ہے، اور کبھی اِس کو لاٹھی قرار دیا گیا ہے، کبھی اِس کو سلیمان کی انگوٹھی، کبھی اِس کو تلوار مانا گیا ہے۔ غرض یہ کہ قرآن کے اندر اسم کے (Symbols) بہت زیادہ ہیں، جتنے پیغمبروں کے تذکرے قرآن میں موجود ہیں اور اُن پیغمبروں کے جو نمایاں معجزات کا بیان آیا ہے وہ نمایاں معجزات اسمِ اعظم [کے] ہیں۔ مثلاً حضرتِ آدمؑ کی جنت اسم ہے، حضرت نوحؑ کی کشتی ایک ظاہری کشتی ہونے کے علاوہ اسم ہے، حضرت ابراہیمؑ کا گلشن اسم ہے، حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی اسم ہے، سلیمان پیغمبر کی انگوٹھی اسم ہے، صالح پیغمبر کی اونٹنی اسم ہے اور حضرت عیسیٰؑ کا وہ نمایاں معجزہ جو مُردوں کو جِلاتا تھا یہ سب اسم کے مرکز کی حیثیت سے ہیں اور آنحضرتؐ کی معراج اسم اور اسم کی رُوحانیت ہے۔ غرض یہ کہ کس معنی میں اسمِ اعظم گھوڑا ہے؟ اِس معنی میں کہ جس طرح ایک پیدل [چلنے والے] کے لئے آسانی اِس میں ہے کہ وہ گھوڑے پر چلے اور گھوڑا اُس کے لئے باعثِ راحت ہے اور گھوڑے کے وسیلے سے ایک منزل سے دُوسری منزل میں جایا جاتا ہے، اِس معنی میں اسمِ اعظم ہی ہے جو رُوحانیت کے مسافر کو با آسانی منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے، اِس معنی میں اسم کو گھوڑا کہا گیا ہے اور کشتی کی بھی یہی مثال ہے، سمندر میں کشتی کے بغیر جایا نہیں جاتا، ہلاکت ہوتی ہے، آدمی ڈوب جاتے ہیں اور لاٹھی کس معنی میں؟ اِس معنی میں کہ ایک بیمار آدمی، ایک کمزور آدمی، ایک بوڑھا آدمی لکڑی سے مدد لیتا ہے، ایک لنگڑا بھی لکڑی سے مدد لیتا ہے تو اسم کے بغیر، عبادت کے بغیر آدمی ایک طرح سے بوڑھا ہے، ایک طرح سے ضعیف ہے، ایک طرح سے بیمار ہے، ایک طرح سے لنگڑا ہے۔

اِس کے علاوہ تاریکی میں بھی لاٹھی مدد دیتی ہے، یہ اسمِ اعظم ہی ایسا ہے جو تاریکی میں مدد دیتا ہے اور کن معنوں میں اسمِ اعظم کو کفش جوتے قرار دیا گیا ہے، آپ شاید فوری طور پر اِس کو پسند نہیں کریں گے لیکن پسند کرنا ہوگا کیونکہ خدا نے اپنی حکمت سے انسان کے لئے پیدل چلنے کی نسبت بُوٹ پہن کے چلنا کتنا آرام دہ [بنایا] ہے اور پاؤں کی حفاظت کس طرح جوتوں سے ہوتی ہے۔ ایک مسافر کے لئے پاپوش یا شوز کہیں یا بُوٹ کہیں، کس قدر باعثِ رحمت ہیں اور کتنے ضروری ہیں۔ ہمارے پاؤں اگر جسم میں ضروری ہیں، چلنے کے لئے زیادہ ضروری ہیں اِسی طرح پاپوش بھی ضروری ہیں اِس اعتبار سے۔ تو اللہ ربّ العزت نے جو موسیٰؑ سے فرمایا کہ ابھی آپ وادیٔ مقدّس میں جوتوں کو اُتارو، مطلب یہ ہے کہ وہاں ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اُن کا سفر ختم ہو چکا تھا اور اسم آٹو میٹک ہوگیا تھا یعنی وہ زحمت سے اور سواری سے [یا] کسی طرح سے نہیں چلتے تھے بلکہ وہ منزلِ مقصود کو پہنچ گئے تھے اِس واسطے جوتوں کی ضرورت نہیں رہی تھی ایک لحاظ سے دیکھا جائے اور پھر دُوسرے لحاظ سے وہ منزل اِس قدر صاف نرم اور راحت بخش تھی کہ اُس میں پاؤں میں چبھنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی، وہ ایسی منزل تھی، لہٰذا وہاں جو بھی عبادت اُس سے متعلّق تھی وہ پیدل چلنے کی طرح آسان تھی۔ آدمی جب گھر پہنچتا ہے تو جوتوں کو اُتارتا ہے۔

تو بہرحال بات ذرا آگے بڑھی اور حالانکہ ابتدائی قسم کی روشنی سے متعلّق بات تھی، چلیں ٹھیک ہوا جو کچھ ہوا، تو ابتدائی قسم کی روشنی جو ہوتی ہے وہ بڑی مسرّت انگیز ہوتی ہے، ہے تو وہ ابتدائی قسم کی روشنی پر وہ بہت ہی عالیشان ہوتی ہے اور وہ روشنی طبعی یا جسمانی قسم کی روشنی جیسی ہوتی ہے تب اُس کی رنگینی، لطافت اور اُس کا جمالیاتی پہلو بہت ہی رنگین و حسین ہوتا ہے، دُنیا کی اِس روشنی سے ہزار گنا زیادہ اُس میں دلکشی ہوتی ہے تو شروع شروع میں ملنے والی تصوّیریں سامنے آتی ہیں اور کچھ آگے چلنے کے بعد روشنی کی لہریں آتی ہیں اور اُس کے سامنے بس نور ہی نور نظر آتا ہے، یہاں تک کہ اُس کے دل کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں یعنی دل کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، روشنی کا اتنا زور پڑتا ہے کہ وہ مسلسل دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا ہے، پر اُس میں یہ کشش ہے کہ دن کے وقت بھی وہ کسی گوشے میں، کونے میں جا کے تنہائی میں آنکھوں کو بند کر کے اُس چیز کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہے، اِس کی یہ تاثیر ہے۔ کچھ وقت تلک یہ روشنی زوروں پر ہوتی ہے، کچھ عرصے تک وہ اِس کا کورس کرتا رہتا ہے، اور اسی میں رہتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا یہ روشنی بہت کم اہمیت والی روشنی ہوتی ہے، وہ زمینِ رُوحانیت ہوتی ہے، وہ آسمانِ رُوحانیت نہیں ہوتا اور یہ وہ روشنی ہوتی ہے جس تک کہ بہت سے لوگ رسا ہو سکتے ہیں اور کچھ وقت کے بعد اُس روشنی میں سے ایک صاف ستھری دُنیا نظر آنے لگتی ہے۔ رُوحانیت کی زمین اُس میں سب چیزیں ہیں، ایک پُر رونق دُنیا سامنے آتی ہے، کبھی تو وہ دُنیا لوگوں کے بغیر نظر آتی ہے، کبھی وہ لوگوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے اور بعض دفعہ اُس دُنیا کی گلیاں اور کُوچے ایسے ہوتے ہیں کہ اُس میں موتی اور مونگے لگے ہوئے ہیں اور زربفت کے کپڑے بچھے ہوئے ہیں اور اگر اُس میں لوگ ہیں تو وہ بھی چمکتے دمکتے ہیں اُن کی شخصیت سے، اُن کے چہروں سے نوری کرنیں پھوٹتی ہیں۔

ایک ایسی حسین اور دلنشین دُنیا کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے لیکن میں آپ سے کہوں یہ چیزیں جادو جیسی ہیں اور اکثر لوگ اُسی میں مبتلا ہو کر آگے نہیں بڑھ سکتے اور ایک لحاظ سے کہا جائے کہ وہ دُنیا ہے۔ کیوں اور کس لئے دُنیا ہے؟ آپ تعجّب کریں گے کہ دُنیا کا ایک سِرا رُوحانیت کے اندر داخل اور شامل ہے، جب ہم آنکھیں [بند کر] لیتے ہیں تو اُس وقت دُنیا سے نجات نہیں پا سکتے ہیں یا یوں کہنا چاہئے کہ دُنیا ہمارا تعقب کرتی ہے ہمارا پیچھا کرتی ہے جب تک ہم رُوحانیت میں جاتے ہیں تو اُس وقت دُنیا اپنے آپ کو بہت کچھ سجا کے اور انتہائی درجہ میں خود کو سجا کے ہمارے سامنے آتی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ رُوحانیت ہے حالانکہ وہ دُنیا ہے۔ اگر اعلیٰ درجے کی رُوحانیت ہوتی تو اللہ پاک اُس کی مذمّت قرآن میں نہ کرتا، اگرچہ یہ ترقّی ہے ایک لحاظ سے لیکن دُوسرے لحاظ سے وہ ترقّی نہیں ہے، کیونکہ وہ رُوحانیت کی ابھی زمین ہے اور اُس کی مذمّت اِس معنی میں ہے کہ مومن آگے بڑھے اور وہ مذمّت اِس طرح سے ہے کہ خدا نے فرمایا ہے کہ: ''اُس نے رُوحانیت کے پہلے آسمان پر چراغ متعین کئے ہیں جو کہ شعلے برسا برسا کر شیاطین کو اُوپر جانے سے روکتے ہیں'' (۱۲:۴۱)۔ شیاطین سے مُراد وہ لوگ ہیں جو امامؑ کی شناخت نہیں رکھتے ہیں، جو رُوحانیت کی طرف آگے بڑھنے کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں [یہ] اُن کو کہا گیا ہے۔

بہرحال اُس مومن کے لئے جس کو آگے جانے کی امکانیت ہے اُن لوگوں کے لئے یہ تو رحمت ہے اور جو اِن چیزوں کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کے نور تک پہنچے ہوئے ہیں اور پھر گمراہ ہو جاتے ہیں تو اُن کے لئے یہ چیز باعثِ زحمت ہے اور کچھ وقت کے بعد اُس میں صفائی آتی ہے اور اُس میں باغ و گلشن نظر آتے ہیں اور اُس میں علم کے آثار اور اشارے ہوتے ہیں لیکن بہرحال پھر بھی وہ زمینِ رُوحانیت ہے۔ کچھ وقت کے بعد اُسی ''بیت الخیال'' کے عالم میں مومن کی قیامت برپا ہوتی ہے، اِس روشنی کے دیکھنے میں کوئی قیامت برپا نہیں ہوتی ہے قیامت آگے چل کر برپا ہوتی ہے۔ قیامت جب برپا ہوتی ہے تو کیا ہوتا ہے اس میں جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل یہ چار فرشتے قریب آتے ہیں اور وہ اِس طرح آتے ہیں کہ سب سے آگے آگے جبرائیل ہوتا ہے، اُس کے بعد میکائیل ہوتا ہے، اُس کے پیچھے اسرافیل ہوتا ہے، اُس کے پیچھے پیچھے عزرائیل ہوتا ہے تو وہ ایک ساتھ آتے ہیں لیکن اُن کا چھوٹا بھائی جو ہے جبرائیل ہے، اُس سے بڑا میکائیل ہے، اُس سے بڑا اسرافیل ہے، اس سے بڑا عزرائیل ہے، یہ چار فرشتے آتے ہیں اور ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔ لوگوں نے جیسے سمجھ رکھا ہے کہ صرف جبرائیل وحی لاتا ہے تو یہ حقیقت ادھوری ہے اور جنہوں نے کہا کہ میکائیل صرف تنہا رزق دیتا ہے یہ بھی [حقیقت] ادھوری ہے، جو کہتے ہیں کہ اسرافیل صور بجاتا ہے تو یہ بھی [حقیقت] ادھوری ہے، چونکہ وہ ساتھ مل کر کام کرتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ صرف عزرائیل جان لیتا ہے یہ بات بھی نامکمل ہے کیونکہ قرآن کے ایک مقام پر فرمایا گیا ہے کہ جان لینے کے فرشتے ہیں (۳۲:۱۶)۔ فرشتہ نہیں فرشتے ہیں لیکن پھر کن معنوں میں وحی کے لئے جبرائیل کو اور رزق تقسیم کرنے کے لئے میکائیل کو اور صور بجانے کے لئے اسرافیل کو اور جان لینے کے لئے عزرائیل کو الگ الگ لیا گیا

ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ بیشک یہ تو نمایان ہیں پر اِن کے ساتھ دُوسرے ساتھی بھی ہوتے ہیں۔ جس طرح دُنیا میں چار بھائی ہیں ہر ایک کے لئے الگ الگ کام مقرر ہے، پر یہ بھائی مل کر کام کرتے ہیں، جس کو جو کام دیا گیا ہے بیشک وہ اُس میں نمایان ہے اور آگے آگے ہے لیکن اِس کے پیچھے پیچھے اُس کے ساتھی اور بھائی ہیں یہ معاملہ کچھ اِس طرح سے ہے۔

اچھا تو سب سے پہلے جبرائیل آتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بہانہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دن کان بجتا ہے، عموماً کان کا بجنا آپ نے سنا ہے، اکثر عام حالت میں جو بایاں کان ہے وہ بجتا ہے اور خصوصی حالت میں دایاں کان بجتا ہے لیکن جب قیامت برپا ہوتی ہے تو یہ کان وقفے وقفے سے بجتے ہیں پھر اُس کے بعد اِن کا وقفہ ختم ہو کے یہ دونوں آپس میں مل کر (Continue) کرتے ہیں پھر (Continuously) لگاتار بجتے ہیں اور بجتے ہیں، بجتے رہتے ہیں پھر اُس بجنے کے ساتھ ساتھ بجنے کی جو آواز ہے وہ زوردار ہوتی چلی جاتی ہے اور پھر ساتھ ہی ساتھ کچھ کان میں نوری جانور آنے کا احساس ہوتا ہے، شروع میں پتا نہیں لگتا کہ یہ نوری جانور ہے کیا ہے، کچھ کانوں میں تھوڑا سا درد پیدا ہوتا ہے، تھوڑی سی کھجلی جیسی ہوتی ہے، وجہ اِس کی یہ ہے کہ اب نور کے جو ذرّات ہیں وہ داخل ہوتے ہیں یہ ایک لفظ ہے اور دُوسرے لفظ میں رُوحوں کا آنا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ اب صورِ اسرافیل وہیں سے بجنا شروع ہو جاتا ہے اور جہاں صورِ اسرافیل بجتا ہے تو رُوحیں اُس کی آواز کی طرف بھاگتی ہیں، جس طرح کہ سورۃ یاسین میں ہے کہ: وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ (۳۶:۵۱)۔ جب صور پھونکا جائے گا تو قبروں سے رُوحیں اُٹھ اُٹھ کر اپنے ربّ کی طرف بھاگنے لگیں گی۔ ربّ سے مُراد یہاں اسمِ اعظم ہے جس سے روحوں کو غذا ملتی ہے اور قیامت جہاں برپا ہوتی ہے، جس مومن میں برپا ہوتی ہے وہاں یہ رُوحیں بھاگتی ہیں۔ قبروں سے مُراد انسانوں کی شخصیتیں ہیں، دُنیا بھر کی شخصیتوں سے رُوحوں کا ایک ایک ذرّہ وہاں پر بھاگتا ہے اور نمائندگی کرتا ہے اور نمائندگی کی صورت میں قیامت واقع ہونے لگتی ہے اور پھر دُنیا بھر کے لوگوں کی رُوحیں وہاں جمع ہوتی ہیں، بغیر اِس کے کہ لوگوں کو پتا ہو، بغیر اِس کے کہ لوگوں کو خبر ہو، بغیر اِس کے کہ دُنیا والوں کو اِس کا علم ہو تو دُنیا بھر کے لوگوں کے اندر جو لاتعداد رُوحیں ہیں اُن میں سے ہر فردِ بشر سے ایک ذرّہ رُوح وہاں پر جاتا ہے جہاں پر کہ قیامت برپا ہو رہی ہے، پھر صورِ اسرافیل کا بجنا نمایاں ہو جاتا ہے اور یہ آواز اُونچی سے اُونچی ہو جاتی ہے، یہاں تک گمان ہوتا ہے کہ یہ جو آواز آ رہی ہے وہ ساتویں آسمان تک پہنچ گئی ہے اتنا اندازہ ہوتا ہے، ایسا (Guess) ہوتا ہے، پھر اُس میں سے گفتگو کا آغاز ہوتا ہے اور جبرائیل فرشتہ بات کرنے لگتا ہے اور وہ گفتگو ہر کسی کی اپنی مادری زبان میں ہوتی ہے، جس مومن کی جو مادری زبان ہو اُسی زبان میں قیامت برپا ہو جاتی ہے اور دُنیا بھر کے لوگوں کو بلایا جاتا ہے، ایک خصوصی نام سے پکارا جاتا ہے۔

ایک (Code) ہے قرآن میں اُسی سے لوگوں کو بلایا جاتا ہے، تو اِس میں ذرّات آتے ہیں تب تک مومن کی رُوحانی آنکھ اور جسمانی آنکھ کے درمیان جو پردہ ہے وہ اُٹھ جاتا ہے اور دونوں نگاہیں آپس میں مل جاتی ہیں، اُس کا

رُوحانی طور پر دیکھنا اور جسمانی طور پر دیکھنا ایک ہو جاتا ہے، لہٰذا وہ رُوح کے ذرّات کو اُڑتے ہوئے دیکھتا ہے، چمکیلے، سفید سفید ذرات، انتہائی چھوٹے ذرات اُڑتے ہوئے، بے ڈھنگے سے اُڑتے ہوئے آتے ہیں، کوئی خاص (Direction) سے نہیں بالکل اِس طرح بے ترتیبی سے اُڑتے ہوئے آتے ہیں اور اِس کے دائیں اور بائیں کان میں وہ ذرّات داخل ہو جاتے ہیں اور اُس کے نتھنوں سے بھی ذرّات داخل ہوتے ہیں پھر وہ رُوحوں کی بارش میں مستغرق ہو جاتا ہے، غرق ہو جاتا ہے اور پھر یکا یک اُس کے جسم میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور قرآن میں جو یاجوج و ماجوج کا قصّہ ہے وہ صادق آتا ہے۔ وہ ذرّات یاجوج اور ماجوج کے عنوان سے آدمی کے اندر جو ایک پردہ ہے معلوم نہیں وہ کونسا پردہ ہے اُس کو چاٹتے ہیں۔

بلکہ ذرّات کا ایک گروپ ایسا ہے کہ وہ انسان کے اِس پردے کو چاٹنے پر متعیّن ہے، اُس پردے کو قرآن کی زبان میں سدِّ سکندر کہا گیا ہے (۱۸:۹۴)۔ ایک ایسی مضبوط دیوار جو رُوحانیت اور جسمانیت کے درمیان کھڑی کر دی گئی ہے، اُس دیوار کو جو پورے جسم پر ایک خول کی طرح سے موجود ہے، اُس کو رُوحوں کا ایک گروپ جن کا نام یاجوج و ماجوج ہے اور ابھی میں اُس کو (Code Word) کہہ رہا تھا، اُسی (Code Word) سے یاجوج و ماجوج ہے، اِسی عنوان سے عزرائیل رُوحوں کو پکارتا ہے، تو وہ جو رُوحوں کا گروپ ہے، وہ مومن کو چاٹتے ہیں، جیسے ہی چاٹتے ہیں تو مومن کی رُوحانیت و جسمانیت ایک ہو جاتی ہے اور اُس کی آنکھوں کے سامنے جو رُوحانیت اور جسمانیت کا پردہ تھا وہ ہٹ جاتا ہے، جو دل میں دیکھتا ہے وہ ظاہر میں [بھی] دیکھتا ہے وہ آنکھوں کو کھول کر کمرے کے اندر یا جس مکان میں وہ رہتا ہے جہاں کہیں وہ رہتا ہے وہاں روشنی ہی روشنی دیکھتا ہے پہلے ایسا نہیں دیکھتا تھا، پہلے وہ اِس روشنی کو دیکھنے کے لئے آنکھیں بند کرتا تھا، اب وہ آنکھوں کو بند کئے بغیر اپنے تصوّرات و تخیلات کو دیواروں پر، اِس فضا میں، اِس کمرے کے اندر سب چیز دیکھتا ہے، آنکھوں کے سامنے روشنی ہی روشنی ہوتی ہے تو یہ اُس چیز کی بدولت ہوتی ہے کہ رُوحوں کا ایک گروپ اِس کو چاٹتا ہے، وہ تھوڑا تھوڑا سا قابلِ برداشت اور میٹھا سا درد محسوس کرتا ہے اِس چاٹنے کے ساتھ ساتھ اور پھر اِسی کے ساتھ ساتھ چاروں فرشتے جو ہیں وہ اپنا کام شروع کرتے ہیں، جبرائیل گفتگو کا آغاز کرتا ہے، اور میکائیل اُس سے (Discuss) کرتا ہے، اسرافیل صور بجاتا ہے اور عزرائیل جان کو کھینچتا ہے، یہ چاروں کام ایک ساتھ ہوتے ہیں، جبرائیل ہمارا (Favour) کرتا ہے، میکائیل (Against) میں جاتا ہے۔

دُنیا کے اندر جیسا کہ آپ نے سنا ہے کہ جو ہمارا وکیل ہے کسی کیس میں اور جو ہمارے مخالف کا وکیل ہے تو اُن کا آپس میں (Discussion) ہوتا ہے، دلائل ہوتے ہیں اِسی طرح جبرائیل ہمارا (Favour) کرتا ہے اور میکائیل اُس کے (Against) میں یعنی ہمارے (Against) میں بولتا ہے، بڑا تماشا سا ہوتا ہے، اِن کا دُوسرا (Code Word) نکیر اور مُنکر ہے اور یہی دونوں فرشتے مومن کی رُوحانیت میں، موجودگی میں سوال و جواب پوچھتے ہیں تو یہ دونوں آپس میں (Discussion) کرتے ہیں وہ (Discussion) کس بنیاد پر ہوتا ہے؟

اِس بنیاد پر ہوتا ہے کہ مومن کے دل کے اندر اگر کوئی خیال ہے، اگر کوئی وسوسہ نمایان ہوتا ہے تو میکائیل اسے ایک دم سے (Read) کرتا ہے، پڑھتا ہے اور اعتراض اُٹھاتا ہے کہ دیکھو اِس کے دل میں یہ چیز پیدا ہوگئی ہے اور جبرائیل اُس کی مدافعت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آخر بشر ہے آخر انسان ہے وہ عفو و بخشش کا رستہ اختیار کرتا ہے وہ [میکائیل] اعتراض کا رستہ اختیار کرتا ہے اور ہمیشہ اسی طرح سے یعنی چوبیس گھنٹے یہ گفتگو رہتی ہے اور اِس میں سے علم و حکمت کی باتیں بنتی ہیں، اِس تضاد سے اِس (Discussion) سے، اِس مذاکرے سے۔

تو یہ ہوگیا جبرائیل اور میکائیل کا کام اور درمیان درمیان میں جبرائیل بہت مہربانی کی باتیں کرتا ہے، بہت شفقت کی باتیں کرتا ہے، تمام (Guidance) اور تمام شفقت اور تمام مہر کا مظاہرہ وہی کرتا ہے اور اسرافیل صور بجاتا ہے، صور کے متعلّق لوگوں کا جو تأثر ہے وہ اچھا نہیں ہے، انہوں نے صورِ اسرافیل کی تشبیہہ ایک نرسنگھے سے یا بگل سے دی ہے اور بعض ملکوں میں ابھی تک بڑے بڑے جانوروں کے سینگ بجاتے ہیں اِس کو نرسنگھا کہتے ہیں یا کوئی ایسا شنکھ بجاتے ہیں اِس کو عربی میں ''بُوق'' کہتے ہیں اور بعض لوگ اِس کو بُرغو کہتے ہیں اور بعض لوگ اِس کو بگل کہتے ہیں تو لوگوں نے یعنی اسرافیل کے بجانے کی جو چیز ہے اِس کا تأثر کچھ اِس طرح سے لیا ہے لیکن دیکھنے والے ہی جانتے ہیں، جنہوں نے دیکھا ہے جنہوں نے سنا ہے وہ بانسری سے مشابہ ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ شہنائی سے مشابہ ہے، زیادہ سے زیادہ وہ بانسری سے مشابہ ہے اور وہ اِس قدر رسیلی ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دُنیا کے جتنے ساز ہیں اُن تمام کی (Spirit) اُس کے اندر موجود ہے، تمام بجانے کی چیزوں کا رَس اُس میں بھرا ہوا ہے، تو شروع شروع میں جب وہ بجتا ہے تو البتہ اُس میں حیرت ہوتی ہے، تعجّب ہوتا ہے اور کچھ آگے چلنے کے بعد اُس سے اتنا مزا آتا ہے کہ مومن کی آنکھوں سے آنسو آتے ہیں اور اُس آواز میں وہ فنا ہو جاتا ہے، مٹ جاتا ہے، یہ اسرافیل کا کام ہے لیکن وہ چوبیس گھنٹے بجاتا ہے اور مسلسل یعنی (Continuously) بجاتا ہے اُس میں ایک سیکنڈ کے لئے بھی وقفہ نہیں ہے، ہاں اگر اُس وقت مومن کو سونے کے لئے اجازت بھی نہیں ہے، اگر ہفتہ عشرہ کے بعد اُس کو تھوڑی سی نیند آگئی تو اُس وقت یہ تمام روحانیت (Stop) ہو جاتی ہے، رُک جاتی ہے، باقی یہ سب آوازیں اور یہ سب (Discussion) جاری رہتا ہے اور بانسری کی آواز جاری رہتی ہے۔

تو اب جبرائیل کی بات ہوئی، میکائیل کی تھوڑی سی بات ہوئی اور اسرافیل کی بھی بات ہوئی اب عزرائیل کی بات سنیے کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔ عزرائیل جو سب سے بڑا فرشتہ ہے وہ یہ کرتا ہے کہ بائیں جانب کان میں وہ تشریف رکھتا ہے اور پھر وہیں سے اسمِ اعظم کو پڑھتا ہے۔ ایک اسمِ اعظم کو پڑھتا ہے، جیسے ہی وہ اسمِ اعظم کو پڑھتا ہے تو اُس اسمِ اعظم کے پڑھنے سے جسم میں جتنی رُوحیں داخل ہوئی تھیں وہ بھی اور ہمارے (Cells) میں جتنی رُوحیں ہیں وہ بھی بیدار ہو جاتی ہیں۔ جس طرح قیامت کے متعلّق یہ کہا گیا ہے کہ جب قیامت ہوگی تو جو مرے ہوئے ہیں وہ بھی زندہ ہو جائیں گے اور جو

زندہ ہیں وہ بھی بیدار ہو جائیں گے، کہا جاتا ہے کہ پہلے جو مُردہ ہیں وہ تو مُردہ ہیں اور جو زندہ ہیں وہ بھی مر جائیں گے اور پھر جب دُوسری (Turn) میں صور بجائیں گے اُس وقت جو مُردے ہیں وہ بھی جاگیں گے اور جو زندہ ہیں وہ بھی تو زندہ ہی ہو جائیں گے۔ اِسی طرح کچھ وقت تلک یہ کیفیت رہتی ہے کہ اُس میں حیرت و تعجّب کی کیفیت رہتی ہے کچھ وقت کے بعد زندگی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، ایک نئی حیات اور ایک نئی بقا کا آغاز ہوتا ہے اُس اسرافیل کے صور کی تاثیر سے کہ آدمی کے بارے میں کیا کہیں، اگر ہم کہیں کہ انسان وجد میں آتا ہے تو یہ بہت معمولی بات ہے اور وہ تو فنا ہو جاتا ہے، وہ مٹ جاتا ہے، اُس کی کوئی ہستی نہیں رہتی ہے، بس آنسو بہتے رہتے ہیں اور اُس کو سنتا رہتا ہے، یہ عزرائیل کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔

تو اُس وقت عزرائیل کی آواز سے، اسمِ اعظم کی آواز سے پاؤں سے لے کر سر کی طرف رُوح اُٹھتی ہے اور رُوح کھینچ جاتی ہے۔ [اُن] تمام ذرّات کے ساتھ جو باہر سے داخل ہوئے تھے، تو پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور پھر رُوح آہستہ، آہستہ، آہستہ، آہستہ اُوپر کو آتی ہے، جب پھیپھڑوں سے رُوح اُوپر کو آتی ہے سانس ختم ہو جاتا ہے اور جب رُوح یہاں پر آتی ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں، گمان یہ ہوتا ہے کہ موت آ گئی ہے اور یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ قطعی قیامت ہے ساری دُنیا سب پر یہ کیفیت گزر رہی ہے اور پہلے ہم کو معلوم نہیں ہوتا ہے کہ یہ انفرادی قیامت ہے، گمان یہ ہوتا ہے کہ یہ کلی قیامت ہے حالانکہ وہ انفرادی قیامت ہوتی ہے ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو بہر حال رُوح اُوپر کو آتی ہے اور جب پیشانی میں رُوح مرکوز ہو جاتی ہے تو سارا جسم ٹھنڈا پڑ جاتا ہے پھر پاؤں کاٹیں یا ٹانگ میں (Operation) کریں تو پتا نہیں چلتا ہے۔ اگر سردی کا موسم ہے تو چونکہ حرارت اور گرمی اُس رُوحِ حیوانی میں ہوتی ہے لہٰذا جب رُوحِ حیوانی کچھ وقت کے لئے اُوپر کو (Close) ہوتی ہے تو تھوڑی بہت سردی سے تکلیف ہوتی ہے یا کہ زیادہ تکلیف ہو سکتی ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ رُوح سر میں اور کھوپڑی میں، پیشانی میں مرکوز ہوتی ہے اور ہم دل کی آنکھ سے دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک سفید بادل کی طرح، بادل کے ٹکڑوں کی طرح، بکھرے ہوئے بادلوں کی طرح، البتہ رُوحِ انسانی نظر آنے والی نہیں ہے ہم جس چیز کو دیکھتے ہیں وہ رُوحِ حیوانی ہے تو سفید سفید بادلوں کی طرح کوئی چیز اُڑتی ہے دیکھتے ہیں اور پھر یکا یک عزرائیل اُس کو چھوڑتا ہے تو آناً فاناً سارے جسم میں رُوح بھر جاتی ہے پھر اس کو (Close) کرتا ہے اور یہ سلسلہ کوئی ہفتہ دس دن تک جاری رہتا ہے۔

اِس میں ہم کو یوں بھی محسوس ہوتا ہے جیسا کہ ہم کو ایک سانچہ بنایا گیا ہے، سانچہ اینٹ بنانے یا کوئی اور چیز بنانے کے لئے سانچہ ہوتا ہے، جس میں کوئی مواد ڈالتے ہیں چیز بناتے ہیں، چیز کو الگ کرتے ہیں پھر مواد ڈالتے ہیں پھر سانچے کو خالی کرتے ہیں جس طرح اینٹ بنانے والے یا کوئی اور چیز بنانے والے، چیزوں کو یا دھات کو یا سیسہ کو پگھلا کر یا سونے کو پگھلا کر سانچے میں ڈالتے ہیں اُس کی ڈھلیاں بناتے ہیں یا اِس طرح سے تو ایک تصوّر ہوتا ہے کہ جو کائنات کے اندر رُوح ہے اُس میں سے لالا کر اُس سانچے کے اندر ڈالتے ہیں اور سیکنڈ سیکنڈ میں اسکو نکالتے ہیں، سیکنڈ سے کچھ زیادہ وقفہ لگتا

ہے،اور اِسی طرح ہفتے تک اور دس دن تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اُس درمیان میں نیند البتہ ختم ہوتی ہے اور اُس درمیان میں البتہ کھانے سے بھی بے نیازی ہوتی ہے، کسی نہ کسی طرح سے کھانے سے ہم کو روکتے ہیں، الفاظ میں نہیں تو اشاروں سے اور احوال سے کھانے پینے کی چیزوں سے روک لیا جاتا ہے اور یہی احوال رہتے ہیں، دن رات گزرتے رہتے ہیں۔ ہاں! بڑی دلچسپ بات ہے کہ [ہم] اُن رُوحوں کے ذرّات کے بارے میں جانیں کہ رُوحوں کے اندر کم سے کم تین قسمیں ہیں، کچھ رُوحیں بے زبان ہیں اُن کی کوئی بات چیت کا پتا نہیں چلتا ہے، کچھ رُوحیں بچوں کی طرح سیکھنے، بات چیت والی نظر آتی ہیں، کچھ رُوحیں اُوپر کی ہیں جو لگتا ہے فرشتوں کے درجے میں ہیں لیکن اِن سب کی ایک آواز ہوتی ہے ملی ہوئی ایک آواز ہوتی ہے، وہ آواز کس قسم کی ہوتی ہے فرض کریں ایک سونے کا پیالہ ہے یا اصلی چاندی کا کوئی برتن ہے اُس کو چینی کہتے ہیں اُس کو آپ ناخن سے جب بجاتے ہیں تو کتنی ایک لطیف آواز اُس میں سے پیدا ہوتی ہے اِس قسم کی آواز میں یہ سب رُوحیں تقدّس اور سبحانیّت کی ایک تسبیح پڑھتی ہیں۔ اِس کے بارے میں حضرت داؤدؑ کے عنوان میں کہا گیا ہے کہ داؤدؑ کے ساتھ پرندے بھی اور پہاڑ بھی ہم آہنگ ہو کر تسبیح پڑھتے تھے (۷۹:۲۱)۔ تو پہاڑ سے مُراد ہمارے اندر جو ہڈیاں ہے وہ ہیں اور پرندوں سے مُراد وہ رُوحیں ہیں کہ ہم جب اسمِ اعظم پڑھتے ہیں یا تسبیح پڑھتے تو اُس میں یہ آوازیں ہمارے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ اِن رُوحوں کی آوازیں تاویل میں اُن کو پرندہ کہا گیا ہے اور ہڈیوں کی آوازیں جو ہڈیوں سے اُس وقت گونج، ایک قسم کی گونج پیدا ہوتی ہے یا یہ کہ یہ گونج ہڈیوں کی نہیں ہے یہ رُوحوں کی آواز کی (Eco) ہے کہ جب رُوحیں مل کر تسبیح پڑھتی ہیں تو اُس میں سے ایک گونج اُٹھتی ہے، جس طرح آپ شاید کسی پہاڑی علاقے میں نہیں گئے ہیں لیکن ایسے گنبد کو دیکھا ہوگا جہاں کہ ہم آواز نکالتے ہیں تو ہماری آواز اُس گنبد سے لوٹ کر آتی ہے اس کو انگریزی میں معلوم نہیں (Eco) کہتے ہیں اور اردو میں اُس کو گونج کہتے ہیں۔ اسی طرح اِس گونج کو قرآن میں کہا ہے کہ یہ پہاڑوں کی تسبیح ہے (۷۹:۲۱)۔ کہا گیا کہ جب داؤدؑ خدا کی حمد و ثناء کا ترانہ گاتے تھے تو اُس وقت اُس کے ساتھ پرندے بھی ہمنوا ہوتے تھے اور پہاڑ بھی۔ تو ہم نے رُوحانیت میں داؤدؑ کو دیکھا وہ مومن کی رُوحانی آواز تھی، مومن کی رُوح کی آواز تھی، اُس میں سبحان اللہ! کتنا رس بھرا ہے اور کس شان سے رُوح کی آواز نکلتی ہے اِس تسبیح میں جو پڑھی جاتی ہیں جس کے ساتھ وہ سب رُوحیں جو باہر سے آئیں تھیں وہ ہمنوا ہو جاتی ہیں اور ہڈیوں سے اُس کی گونج ہوتی ہے اور کھوپڑی کی ہڈیوں کو پہاڑ قرار دیا گیا ہے اِس کو کوہِ طور بھی کہا گیا ہے، [یہ] معراج کا مقام ہے۔

تو عزرائیل جب رُوح کو کھینچتا ہے اور پیشانی میں مرکوز کرتا ہے تو کتنا مہربان ہے اِس لئے ہم نے کہا کہ عزرائیل کا معجزہ (Powerful) ہے اور (Highest) ہے اور اسرافیل (Next) ہے اور میکائیل اُس سے نیچے ہے اور جبرائیل چھوٹا بھائی ہے اور چھوٹے بھائی کو سب سے آگے آگے دھکیل کر اُس کو آگے بھیجتے ہیں، اُس کا کام ہے مہربان ہونا

اور عزرائیل وہ (Negatively) بڑا معجزہ کرتا ہے، ہزاروں کوششوں کے باوجود جب ذکر میں ہم مرکوز نہیں ہو سکتے ہیں، کاش! اُس وقت عزرائیل آتا اور عزرائیل سے ہماری دوستی ہوتی تو وہ آناً فاناً ہماری رُوح کو پیشانی میں مرکوز کرتا، پھر ہم ساری محنت سے چھٹکارا پاتے یا (Next) اُس کے دُوسرے بھائی اسرافیل آتے اور ذرا بانسری بجاتے تو ہم بلا مشقت اپنی عبادت کو، اپنے ذکر کو پیشانی میں مرکوز رکھتے، کاش! ہماری دوستی اسرافیل سے ہوتی، کاش! کاش! ہماری دوستی عزرائیل سے ہوتی، کاش! یہ دوستی دائمی ہوتی، ایک دفعہ وہ اسمِ اعظم پڑھتا اور ہماری توجہ کو سر سے اُوپر کے مقام پر مرکوز کر دیتا لیکن یہ معجزہ ایک بار ہوتا ہے اور رُوحانیت کے مراحل سے گزرنے کے بعد جو پچھلے مراحل ہیں وہ دوبارہ نہیں آتے ہیں۔

ہر کوئی اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے، نوجوانی کو یاد کرتا ہے، اِس طرح رُوحانیت میں بھی نوجوانی میں اور رُوحانیت میں بھی بچپنا ہے لیکن وہ لوٹ کر نہیں آتا ہے یہ معجزہ ایسا ہے، گو کہ مومن آگے سے آگے زیادہ ترقّی میں ہوتا ہے، علمی طور پر اور تجرباتی طور پر زیادہ عزت میں ہوتا ہے، زیادہ قربت میں ہو سکتا ہے اور زیادہ مرتبے میں ہو سکتا ہے اور زیادہ علم رکھتا ہے اُس وقت وہ تاویلات کو نہیں جانتا ہے، جبکہ وہ اُن معجزات سے گزرتا ہے تاویلات کا اُس کو تجربہ نہیں ہوتا اور وہ تاویل ہی نہیں کر سکتا ہے کیونکہ وہ تنزیل کے مقام پر ہوتا ہے، لیکن آگے چل کر، آگے چل کر زندگی کو صَرف کرنے کے بعد وہ سب کچھ جانتا ہے، لہٰذا اُس گزشتہ زندگی سے مومن کی موجودہ زندگی اچھی ہوتی ہے لیکن وہ نوجوانی بھی کیا دلکش تھی کہ وہ بار بار یاد آتی ہے اگرچہ ایک نوجوان کچھ بھی نہیں جانتا ہے لیکن اُس کو یاد کرتا ہے اِس طرح جو گزشتہ رُوحانیت ہوتی وہ بار بار یاد آتی ہے، بہر حال بعد میں جو معجزات ہوتے ہیں وہ سنجیدہ ہوتے ہیں۔ بارش جب برستی ہے تو طوفان اُٹھتا ہے اور بارش جب تھم جاتی ہے تو باغ میں ہریاول پیدا ہوتی ہے، درختوں میں پھل لگتے ہیں اور دُنیا، صحرا گُل وگلزار بن جاتا ہے۔ اِسی طرح مومن کو کوئی مایوسی نہیں ہوتی ہے، وہ درختوں سے، پھلوں سے، دولتوں سے مالا مال ہو جاتا ہے پر اُس [وقت] کو بھی بہت یاد کرتا ہے۔ بہر حال یہ قیامت برپا ہونے کا ذکر ہے اِس سے آگے بہت کچھ ہے، اِس سے آگے بہت کچھ ہے، بہت کچھ ہے، بہت عجائبات ہیں لیکن میں نے جو یہ قصّہ بیان کیا یہ "بیت الخیال" سے آگے بڑھ کر رُوحانیت کی اعلیٰ ترقّی کی طرف قدم بڑھانے کا مرحلہ ہے، جس میں کہ بس رُوحانیت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور صحیح روحانیت اُسی سے شروع ہو جاتی ہے اور گفتگو، علم کے دروازے، معرفت کے باغ اُس وقت کھلتے ہیں، گفتگو کے بغیر رُوحانیت مکمل نہیں ہوتی ہے، گفتگو ہی میں علم ہے اور حکمت ہے اور امامؑ کی شناخت ہے، پھر وہ خوفناک روشنی جو ہوتی ہے وہ کم ہو جاتی ہے اور پھر ایک صاف وشفاف دُنیا سامنے آتی ہے۔

چونکہ نور تین قسم کا ہے طبعی روشنی، رُوحانی روشنی اور عقلی روشنی۔ جو [روشنی] شروع میں نظر آتی ہے اُس کو طبعی روشنی کہنا چاہئے اور بعد میں جو عبادت و بندگی اور اِن تسبیحات سے جو دل کو سکون ملتا ہے یہ رُوحانی روشنی ہے اور جہاں پر علم کا مرحلہ آتا ہے وہ علمی اور عقلی روشنی ہے جو سب سے اعلیٰ ہے، جب ہم کو بتانے والے بتاتے ہیں نور، تو اُس وقت ہماری نظر سب سے

پہلے مادّی روشنی کی طرف بھاگتی ہے، یہ ہماری کتنی کمزوری ہے کہ ہم نور کی تعریف [کو] نہیں سمجھتے ہیں، جب کہا جاتا ہے نور تو اُس وقت ہمارا تصوّر سورج کی طرف جاتا ہے، چاند کی طرف جاتا ہے، تاروں کی طرف جاتا ہے، بجلی کی طرف جاتا ہے اور مادّی قسم کی روشنی کی طرف ہماری نگاہ جاتی ہے [یہ] قطعی غلط تو نہیں ہے لیکن اِس میں کمزوری ہے، نور کی تعریف اِس طرح سے نہیں ہے، یہ مکمل تعریف نہیں ہے یہ تعریف کی ابتدا ہے جب تک کہ ہم عقلی اور علمی کیفیت میں نور کو نہیں سمجھیں [گے]، جب تک کہ ہم رُوحانی طور پر نور کو نہیں سمجھیں [گے] تو پھر ہم نور کے سمجھنے میں ادھورے ہیں۔

بہر حال رُوحانیت کے عجائبات بہت ہیں، اِس سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ اسماعیلی مذہب کی رُوحانیت کس قدر معجزات سے بھرپور ہے، کتنے عجائبات ہیں مگر بیان کریں تو اُس میں کئی راتیں نہیں بلکہ کئی ہفتے اور پھر کئی مہینے بلکہ کہنا چاہئے کہ کئی سال لگ جائیں گے۔ آپ کو تعجّب ہوگا جو میں نے کہا کہ اُس کے بیان کرنے میں اور وضاحت کرنے میں کئی سال لگ جائیں گے، اور واقعتہً کئی سال لگ جائیں گے، چونکہ وہ چیز (Single) نہیں ہوتی ہے مثلاً ایک کان سے ہم ایک آواز کو نہیں سنتے ہیں، لاکھوں، کروڑوں رُوحیں آتی ہیں، ہمارے جسم کا ذرّہ ذرّہ اُس میں مصروف ہوتا ہے، اُس پر ایک کیفیت گزرتی ہے اور سر سے لے کر پاؤں تک ہم زبان، آنکھ، کان اور (Sense) بن جاتے ہیں۔ عام حالت میں ہمارے حواس ہی کام کرتے ہیں لیکن خصوصی حالت میں ہمارا سارا جسم حواس کا کام دیتا ہے۔ چونکہ آپ (Scientifically) جانتے ہیں کہ ہمارے جسم کے اندر کھربوں کے حساب سے رُوحیں ہیں، پہلے تو آپ خلیّات کو مانیں، جن کو (Cells) کہا جاتا ہے، (Cell) آپ کے علم کے مطابق ایک چھوٹے سے کمرے کا نام ہے لیکن یہاں اصطلاح جو ہے [وہ] ایک ذرّہ بھر جگہ کو کہتے ہیں جہاں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں سوئی ہوئی رُوحیں ہیں ہر (Cell) کے اندر، سائنس نے ثابت کیا ہے کہ ہمارے اندر سوئی ہوئی رُوحیں ہیں، جب ہم مانیں کہ ہمارے اندر سوئی ہوئی رُوحیں ہیں تو اِن کے جاگنے کا بھی کوئی وقت ہے، عام حالت میں بھی اِن رُوحوں کے ذرا ذرا جاگنے کی مثالیں ملتی ہیں، جب کسی پر خوف کی کیفیت گزرتی ہے تو اُس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، رونگٹے کھڑے ہو جانا یہ ایک لفظ ہے، آپ تحلیل کریں کہ رونگٹے کھڑے ہو جانے کی کیفیت کیا ہے، وہ کیفیت یہ ہے کہ ہمارے اندر جو رُوحیں سوئی ہوئی تھیں وہ بیدار ہو جاتی ہیں کسی بھی خوف کی اطلاع سے، کہ وہ خوف کی اطلاع سب سے پہلے دل کے مرکز کو جاتی ہے اور دل کے مرکز کے ساتھ اِن تمام رُوحوں کا رابطہ ہے، جس طرح ٹیلیفون کا ٹیلیفون کے ساتھ رابطہ ہے۔

تو خوف کی لہر دل کے مرکز سے جب دوڑتی ہے تو یکا یک جسم کے اندر جو سوئی ہوئی رُوحیں ہیں وہ جاگتی ہیں ایک طرح سے تو اِس جاگنے کے ساتھ ساتھ ہمارے جسم کے اندر ایک سنسناہٹ جیسی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو کہتے ہیں رونگٹے کھڑے ہو جانا۔ یہ اکثر کسی غلط خوف سے بھی ہو سکتا ہے اور صحیح خوف سے بھی ہو سکتا ہے اور عبادت سے بھی ہوتا ہے اور

جوعبادت سے یہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اِس کا ذکر قرآن میں بار بار ہے لیکن اُس میں تو بہت مزا آتا ہے اور ایک مومن جو بڑے کام میں ہو یا معجزانہ طور پر اُس کو بڑا کام دیا جارہا ہو تو اُس کے رونگٹے جب کھڑے ہو جاتے ہیں تو اُس میں ایک معجزہ ہوتا ہے، اُس میں وہ سر سے لے کر پاؤں تک خود کو لذّتوں کا سرچشمہ پاتا ہے، ایک عزت، ایک مسرّت و شادمانی، رگ سے لے کر ہڈی تک اور گوشت، خون، پوست تک وہ ایک قسم کی لذّت و راحت محسوس کرتا ہے، یہ اسمِ اعظم کے زور سے کچھ لمحات کے لئے اِن رُوحوں کا جاگنا ہے، اِن پر روشنی پڑتی ہے رُوح القدّس کی، تو یہ کیفیت صبح اسمِ اعظم کے ذکر کے بعد ذرا جماعت خانے میں بیٹھنے سے یا گھر میں آ کر لیٹنے سے یا بعض دفعہ شام کے وقت بھی یہ محسوس ہوتی ہے، یہ رُوحانی معجزات میں سے ہے اور کبھی کبھار کسی بہانے سے رات کے درمیان بھی یہ کیفیت گزر سکتی ہے لیکن کامیاب مومنین پر۔

بہر حال کتنا اِس کا تذکرہ کریں اور کیا بیان کریں رُوحانیت کے عجائبات کا، ویسے تو میری جگہ پر آپ کو خوف محسوس ہوتا ہو گا کہ میں اِس طرح سے بے دھڑک رُوحانی باتوں کا ذکر کرتا ہوں آپ کو ڈر لگتا ہو گا کیونکہ یہ بہت خوفناک باتیں ہیں لیکن کیا کریں ہم کو ایسا بنایا گیا ہے کہ بس بولتے ہیں اور لاتعداد معجزات ہیں، بے شمار عجائبات ہیں رُوحانیت کے لیکن میں یہاں رُکوں گا اور اِس لئے کہ کافی باتیں ہوئیں، گو کہ میں نے چاہا تھا کہ رُوحانیت کے عجائبات کو بیان کروں، لیکن یہ بیان کب انجام کو پہنچ سکتا ہے اور ختم نہیں ہو سکتا ہے اِس لئے میں یہاں رکوں، اِس کو آپ ایک مثال سمجھیں، ایک نمونہ سمجھیں جو تقریباً ابتدا سے میں نے بیان کیا اور اِس کے آگے جو بڑے معجزات ہوتے ہیں اِس کا بیان نہیں کیا اور میں صرف دروازے سے داخل ہوتے ہوئے کیا ہوتا ہے اُس کا ذکر کر کیا آپ کو اندازہ ہو گا اِس کے اندر تاویل ہے، آپ کو اندازہ ہو گا کہ قرآن میں اِسی روحانیت کا ذکر ہے، آپ کو یقین ہو گا کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ مومنِ درویش کی رُوحانیت کا قصّہ ہے، جس راستے پر حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم چلے تھے اُسی راستے پر، اُن ہی کے نقشِ قدم پر، اور اپنے پیروں اور اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر جب مومن کو چلنا ہے تو وہی واقعات ہیں جو کہ رُوحانیت میں سامنے آتے ہیں کچھ دوسرے واقعات نہیں ہیں بس وہی واقعات ہیں، ایک ہی راستہ ہے اور وہ معجزات یکسان ہیں، ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ پیغمبر پیغمبر ہے، ولی ولی ہے، پیر پیر ہے مومن ہونے کے بعد، پر راستہ وہی ہے اِسی راستے کی رہنمائی وہ کرتے ہیں اور جس چیز کو معرفت کہتے ہیں جو خدا اور رسولؐ کی امامؑ کی معرفت ہے اُسی معرفت کے حصول کے سلسلے میں تمام معجزات کو دیکھنا پڑتا ہے۔

ٹائپنگ: اکبر شمس الدین پروف: نسرین اکبر